جملہ حقوق محفوظ ہیں
رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

جلد ۵۸	جنوری سنہ ۱۹۳۲ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

تصاویر: پیام محبت (رنگین) — مہاراجہ پرتھی راج چوہان ہند بادشاہ دہلی
رائے بہادر بابو انند سروپ مرحوم

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا
قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۔ ششماہی ، ہندوستان سے ششماہی تین روپیہ
قیمت فی پرچہ
قیمت سالانہ

زمانہ بک ایجنسی کی دلچسپ و قابل دید کتابیں

نصائح چانکیہ

یعنی نامور ہند چانکیہ کے مشہور و معروف دمینتی کا ترجمہ از جناب پنڈت ہمنت راؤ صاحب مددگار خزانہ سرکار عامرہ گورنمنٹ نظام دام اقبالہٗ قیمت ۶

گلکدہ

لسان الملک حضرت عزیز لکھنوی کا مجموعہ کلام جس کا ہر صفحہ ایک چمن زار اور ہر شعر ایک خوش رنگ پھول ہے قیمت عہ

لسان الغیب

شرح دیوان حافظ مع مفصل سوانح عمری ملک کے مشہور اہل قلم حضرات کی رائے ہے کہ یہ شرح یکتائی کے درجہ تک پہونچ گئی ہے قیمت جلد اول ع

کاس الکرام

شرح رباعیات عمر خیام مع مفصل سوانح عمری تمام ارباب سخن کا اس پر اتفاق ہے کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ مکمل اور مبسوط کتاب آجتک شائع نہیں ہوئی۔ قیمت تین روپیہ ے

قومی نمبر رسالہ زمانہ

جس میں ۲۷ قابل دید مضامین نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر اور مہاتما گاندھی، لالہ لاجپت رائے۔ ڈاکٹر سپرو، مسز نائیڈو، ڈاکٹر اقبال کے خاص پیغامات اور بہت سے قابل دید مضامین نظم و نثر شائع ہوئے ہیں۔ قیمت عہ

اثرستان

ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ پر تاثیر اور ہر شعر تیر و نشتر ہے قیمت عہ

مکمل عورت

دو لڑکیوں کی تعلیمی و سوشیل حالات کا مقابلہ۔ ایک کو یوروپین اسکول اور دوسری کو کنیا ودیالیہ میں داخل کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کنیا ودیالہ کی لڑکی تعلیمی و سوشیل حالت میں بہتر ہے قیمت ۸

روٹھی رانی

جسمیں حسن و عشق کی سچی داستان راز و نیاز کا دلچسپ معرکہ اور تیر نا مینا کی دلکش مثال موجود ہے ۶

پریم بتیسی

یعنی اردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند بی۔ اے کے بہترین قصوں کا مجموعہ۔ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابل دید ہے

حصہ اول ۱۲ آر دوم ۱۲ آر

دنیائے راز

از ابو الفاضل راز چاندپوری قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہے، ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف قیمت صرف ایک روپیہ

یادگار قومی

جس میں ملک کے مشہور ترین انشاپردازوں کے ۱۵ مضامین اور چار عکسی تصویریں ہیں کاغذ لکھائی چھپائی صاف ہے قیمت عہ

ترجمہ رامائن منظوم

بال کانڈ کا اصلی حصہ ہے دوہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اردو اشعار میں مترجمہ سورج پرشاد تصور قیمت ۱۲ آر

بزم احباب

اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ ۸

سیر المصنفین

اردو انشاپردازی کی مکمل تاریخ از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب بی۔ اے۔ شعرا کی طرح نثر کا جامع تذکرہ قیمت ع

طرق دولتمندی

یہ کتاب ہر شخص کے قابل خرید ہے دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے کم لوگ واقف ہیں اس کتاب میں دولت حاصل کرنے کے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں قیمت آٹھ آنہ

اردو مضمون نویسی

مضمون لکھنے کے متعلق ... پرشاد بی۔ اے پروفیسر کی عمدہ کتاب ہے اس سے اردو لکھنے کی مہارت پیدا ہوتی ہے۔ قیمت ۸

حیات بیوہ

جس میں مصنف نے بیوگان کی حالت زار کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور انکی جانکاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا ہے قیمت ۵

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمایئے
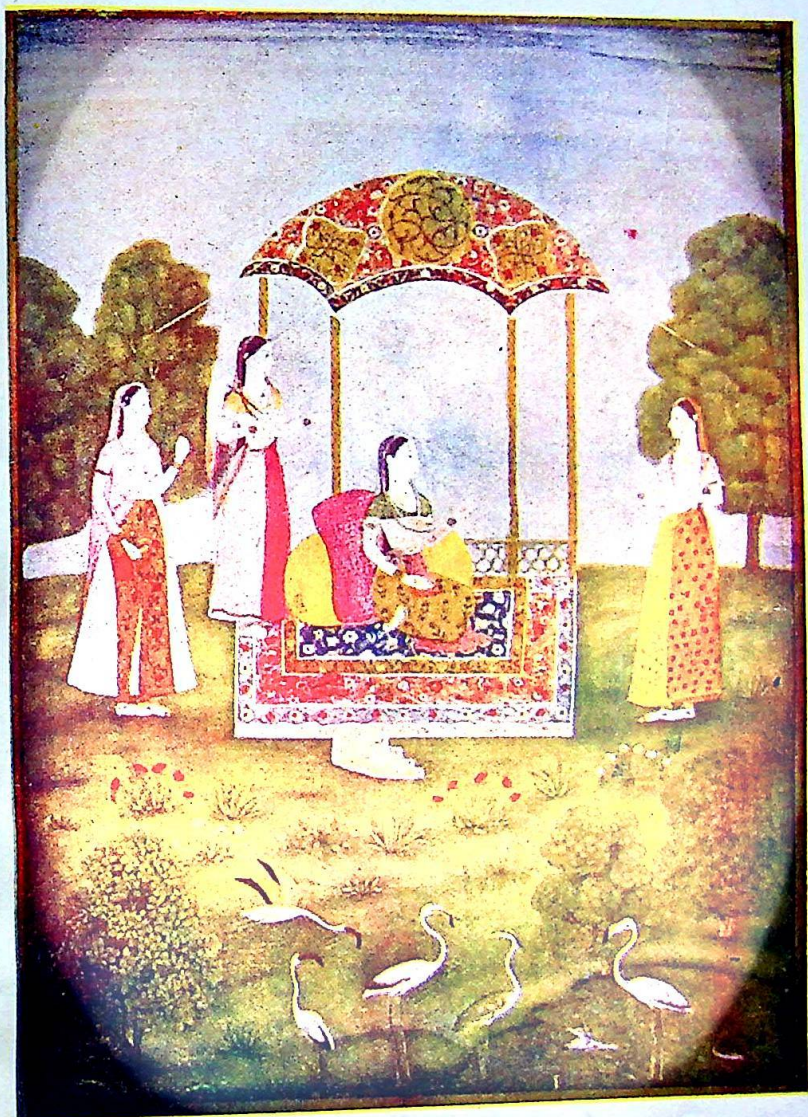
پیام محبت

عہد مغلیہ آخر اٹھارھواں صدی کے مصوری کا نمونہ

مرقع دربار مہاراجہ پرتھوی راج چوہان ہندو بادشاہ دہلی

زمانہ

جلد ۵۸ جنوری ۱۹۳۲ء نمبر ۱

انگریزی ادبیات اور ہندوستان

(از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی)

ممالک مشرقیہ میں قدامت کے لحاظ سے ملک ہندوستان کو جو عظمت اور فضیلت حاصل ہے وہ اس کے مذاہب، سلطنتوں، تہذیب و تمدن، اور آثار قدیمہ سے صاف ظاہر ہے۔ قدیم الایام میں دنیا کی مختلف اقوام کا تعلق ہند اور اہل ہند سے رہ چکا ہے، جس کے آثار اُن قوموں کی تواریخ اور ادبیات میں موجود ہیں۔ چنانچہ قرونِ وسطیٰ میں انگلستان کا جو تعلق ہندوستان کے ساتھ رہا ہے اُسکی نسبت کئی جزئی اور تفصیلی اشارات انگریزی ادبیات میں پائے جاتے ہیں۔ قاعدہ کی بات ہے کہ دنیا کے اہم واقعات کا اثر معاصر اہل قلم پر زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزی ادب میں ہندوستان کا اثر بہت قلیل مقدار میں پایا جاتا ہے۔

متعدد انشاپردازوں اور شاعروں نے ہندوستان کے سحر اور شعبدہ بازی کی نسبت کچھ حالات لکھے ہیں، اور ہندوستانی زندگی کے مختلف مناظر پیش کئے ہیں۔ مثلاً عورتوں کا رنگین اور زریں ملبوسات میں ندی کے کنارے پانی بھرنا، سفید پوش مقتدایانِ مذہب کا کسی مذہبی جلوس کے سامنے پنکھے ہلانا۔ زربفت کی جھولوں سے لدے ہوئے ہاتھیوں اور ہودہ والے اونٹوں کا بازار سے گزرنا، بازار کا شور و شغب، صحرا کی خاموشی اور سکوت، یہ اور اس طرح کی کئی باتوں کا نقشہ انھوں نے اپنی تحریروں میں کھینچا ہے۔ ان مصنفین میں زیادہ تر مورخین اور محققین ہیں، اور اگر ان کو علحدہ کر دیا جائے تو صرف

چند ایسے مصنف نکلیں گے جنھوں نے ہندوستان کا موضوع خاص طور پر اپنے لئے پسند کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ولایت سے آنے والے سیاحوں کا مقصد ہندوستان آنے سے محض سیر عجائبات اور تفریح طبع تھا، یا تحصیلِ مال و زر، سیاحوں کا کام ادھر ادھر چکر لگانا یا روپیہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ تخیل سے کام لینے اور شاعری سے بہرہ ور ہونے کی نعمت بہت کم لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا تو ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے انگریزی ادیبوں کی صف اول میں جگہ دی جا سکے، اور بالفرض ان میں سے کوئی بالکل ہندوستانی طرز پر ہندوستان کی نسبت کچھ لکھتا بھی تو انگریزی داں طبقہ اس سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ہندوستان ممالک مغرب سے ایک دور ترین ملک ہے اس لئے اِس ملک کے اندرونی حالات، مذاہب، عوائد و رسوم اور طرز معاشرت سے اُن لوگوں کو برائے نام بھی آگاہی نہیں ہو سکتی تھی۔

ادب قدیم انگریزی ادب کا دار و مدار تمامتر رومی (لاطینی) اور یونانی ادبیات پر ہے، اس لحاظ سے وہ قدیم رومی اور یونانی روایات کا حامل ہے۔ لہذا ہندوستان کے متعلق ابتدائی معلومات کا سرچشمہ تمامتر یونانی اور رومی مصنفین کے وہ بیانات ہیں جو ہندوستان کی فتوحات اسکندری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بنا پر بعض معلومات یونانی اور رومی ذرائع سے انگریزی ادب میں داخل ہو گئیں۔ قدیم شعرا میں چاسر نے (جو انگریزی شاعری کا باوا آدم ہے) اپنے بعض منظوم قصوں[1] میں ہندوستان کے متعلق بعض امور کا ذکر کیا ہے، چنانچہ Knights' Tale (قصۂ رئیس) میں اس نے امیر توس اعظم بادشاہ ہندوستان کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح Pardoners' Tale (قصۂ خطا بخش) میں بیدپا برہمن کی کلیلہ و دمنہ سے ایک حکایت نقل کی ہے، جو ابن المقفع کے عربی ترجمہ کے ذریعہ یورپ میں پہونچی تھی[2]۔ اس سے زیادہ چاسر کے کلام میں ہندوستان کے متعلق کچھ نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح پندرھویں صدی کے ایک اور فسانۂ منظوم میں جس کا نام Geste of Alekander (کارنامۂ سکندر) ہے، ہندوستان کی نسبت ایک اور اشارہ پایا جاتا ہے، اس کا مصنف غالباً انگلستان کے جنوب مشرق کا باشندہ تھا جو ۱۴۳۰ء میں گزرا ہے۔ وہ ہندوستانی فوج کے ہاتھیوں اور دیگر عظیم الجثہ حیوانات کے خیال سے بہت دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ نیز اُن جواہرات کے نام بھی اس نے گنوائے ہیں جو اسکندر کو ہندوستان سے ہاتھ لگے تھے۔ سونے کے منقش ستون جن میں جواہرات، مروارید، زمرد اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ ہاتھی دانت کی تراشی ہوئی ہندو دیوتاؤں کی مورتیں، جا بجا سے بلوریں، صدف کے پھول اور پرندے۔ اس طرح اُن تمام

---

[1] قصص کینٹربری Canterbury Tales

[2] ابن المقفع کے عربی ترجمہ کا عبرانی میں ترجمہ ہوا تھا، اسی کا لاطینی ترجمہ جان آف کپوآ نے ۱۲۷۰ء میں کیا (ادبیات ایران جلد ۲ ص ۳۵۰) اسی لاطینی ترجمہ کی بدولت کلیلہ و دمنہ کی حکایات یورپ میں پہونچیں۔

بیش بہا خزانوں کا اس نے ذکر کیا ہے جو اسکندر اعظم کو ہندوستان سے ہاتھ لگے تھے۔

اس کے سو سال کے بعد ایک اور نظم لکھی گئی جس کا نام King Alysaunder (اسکندر بادشاہ) ہے۔ اس میں ہندوستان کو ایک متمول اور کثیر آبادی والا ملک بتایا گیا ہے، جس میں کئی شہر اور قلعے ہیں۔ دریائے گنگ کے ذکر میں تین سو فٹ کی مچھلی کا اس میں ہونا بتایا گیا ہے۔ بہرحال سولھویں صدی کے آغاز تک ہندوستان کے متعلق انگریزی ادب کے دامن میں ان چند خزف پاروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

تعلقات کی ابتدا انگلستان کا تعلق ہندوستان سے جب کبھی قائم ہوا ہو، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ چودھویں صدی میں انگریزوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو گئی تھی، پھر بھی صحیح طور پر یہ تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے جب سولھویں صدی میں انگریزوں کے دلوں میں ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرنے کی تحریک پیدا ہوئی، چنانچہ اسی دھن میں انھوں نے بحری سفر کی تیاریاں کیں، اور کولمبس اور واسکوڈی گاما جیسے اولوالعزم سیاحوں نے ہندوستان کے جزائر کا رخ کیا۔ اول الذکر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دراصل وہ جزائر ہند کی تلاش کو نکلا تھا، مگر غلطی سے امریکہ پہونچ گیا۔ اور اسی وجہ سے وہاں کے "سرخ رو وحشیوں" کو اس نے "ریڈ انڈین" کا لقب دیدیا[1]۔ بہرحال اور مہتم بالشان تحریکات کی طرح ہندوستان پر قبضہ کرنے کی یہ تحریک خاص طور پر قابل لحاظ ہی جس کا اثر انگریزی ادبیات پر پڑنا لازمی تھا۔ جب ڈگاما نے نہر سویز میں داخل ہو کر ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کر لیا تو اہل انگلستان کو ہندوستان کی نسبت مزید معلومات حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد انگریز سیاح یکے بعد دیگرے ہندوستان آنے لگے۔

عہدِ الزابیتھ انگلستان کے حکمرانوں میں الزابیتھ ایک نامور اور شان و شوکت والی ملکہ گزری ہے، جس کا عہد ادب کے لئے عہدِ زریں سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہدِ حکومت میں پانچ سیاح اسٹیونس، نیوبری، لیڈز اسٹوری اور فِچ ہندوستان کے جواہرات خریدنے اور یہاں کے عجائبات دیکھنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ ہندوستان میں اس وقت عہدِ اکبری کا دور دورہ تھا۔ ملکۂ انگلستان نے اپنے معاصر بادشاہ کے نام رقعہ لکھکر نیوبری کے حوالہ کیا جس کا مضمون یہ تھا[2]۔

"چونکہ ہماری رعایا کو دنیا کے دور دراز ممالک کی سیر و سیاحت کا بیحد شوق ہے جس سے ان کا مقصد حتی الامکان تمام اقوام عالم کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرنا ہے تاکہ اس ذریعہ سے باہمی دوستانہ

---

[1] تاریخ امریکہ ص ۱۔ از مولوی محمد یحییٰ تنہا، مطبوعہ الناظر پریس۔

[2] مسٹر ونسنٹ اسمتھ اپنی محققانہ تاریخ "اکبر" میں (ص ۲۲۹) لکھتے ہیں کہ ملکہ کا اصلی خط بعینہٖ محفوظ نہیں ہے، صرف اس کے بعض فقرے ملتے ہیں۔ مندرجہ بالا خط کے الفاظ جو اصل تحریر کا مفہوم ادا کرتے ہیں، سیاحوں کے بیانات سے لئے گئے ہیں۔

روابط قائم کئے جاسکیں۔ اسی لئے حامل رقعۂ ہذا جان نیوبری مع اپنے رفقا کے نہایت ادب اور دیانت داری کے ساتھ آپ کی حدود مملکت میں داخل ہونے کی جرأت کر رہا ہے۔"

انہی سیاحتوں کا یہ نتیجہ تھا جس کا اثر انگلستان کے شعرا اور مصنفین کے تخیل پر پڑا۔ اس عہد کے ابتدائی شعرا میں اسپنسر (Spencer - سنہ ۱۵۹۹ء) .... نے اپنی مشہور نظم Faerie Queene (پری جمال ملکہ) میں تقریباً سات جگہ ہندوستان اور اس کے دریاؤں گنگا اور سندھ کا ذکر کیا ہے۔ اور گو اس فسانۂ منظوم میں مشرقی تخیل کا اثر بہت بڑی حد تک پایا جاتا ہے، تاہم ہندوستان کے متعلق اس میں مزید حالات نہیں ملتے۔ اسی طرح اس عہد کے نامور شاعر اور ڈراما نویس ولیم شکسپیر نے ہندوستان کی نسبت بعض اشارات اپنے ڈراموں میں کئے ہیں، مثلاً:۔

"بوقت تبسم اس کے چہرے پر کئی لکیریں نمودار ہو جاتی ہیں جتنی کہ جدید نقشہ میں باضافۂ ہندوستان موجود ہیں[51]"۔

"وہ جس کے ہاتھ نے ایک بدتر ہندوستانی کی طرح ایک موتی کو پھینک دیا[52]"۔

سترھویں صدی کا نامور ادیب اور شاعر جان ملٹن جو بقول ڈرائیڈن اپنی بلند خیالی اور بلند نظری کے لحاظ سے انگریزی کے تمام قدیم و جدید شعرا اور انشا پردازوں پر فوقیت رکھتا ہے، اس کے کلام میں ہندوستان کے متعلق بعض حوالے ملتے ہیں، مگر اس کی معلومات کا تمام تر سرمایہ اُن سیاحوں کے بیانات ہیں جو عہد الزابیتھ میں ہندوستان آئے تھے۔ چنانچہ اپنے شاہکار "Paradise Lost" (فردوس گم شدہ) میں لکھتا ہے:۔

"کسی دور ترین سمندر میں ایک جہاز جو خاموش پڑا ہوا، معتدل ہواؤں کی وجہ سے بادلوں میں لٹک رہا ہے، بنگالہ سے چلتا ہوا، یا جزائر ٹرینیٹ اور ٹائیڈور سے، جہاں سے تاجر مسالہ دار ادویہ لاتے ہیں[53]"۔

ہندوستان کے شہروں میں آگرہ اور لاہور کا ذکر سلاطین مغلیہ کے پایۂ تخت کے طور پر کیا گیا ہے[54]۔ ملیبار اور دکن کا نام بھی لیا گیا ہے[55]۔ دریائے گنگا اور سندھ کے نام بھی بعض اشعار میں ملتے ہیں[56]۔

---

[51] ہنری ہفتم ایکٹ ۵ - ۳
[52] آتھیلو ایکٹ ۵ - ۲
[53] پیراڈائز لاسٹ، باب ۲ (کلیات ملٹن صہ ۱۱۶ چندوس کلاسکس)
[54] ایضاً باب ۱۱ (کلیات صہ ۳۳۲
[55] ایضاً باب ۹ (کلیات صہ ۲۹۰)
[56] ایضاً باب ۹ (صہ ۲۶۴)

عہد الزابیتھ کے مشاہیر شعرا میں سے کسی نے ہندوستانی موضوع پر کوئی مستقل چیز نہیں لکھی البتہ مارلو (Marlow) نے اپنے ایک ڈرامے کے لئے فاتح اعظم امیر تیمور کو پسند کیا اور اُسکا نام بھی Tambur Laeine (تیمور لنگ) رکھا، گو ہندوستان سے اس کو کوئی خاص تعلق نہیں ہے، تاہم اس میں تیمور کی زبانی ایسٹ انڈیا اور بعد کے انکشاف شدہ جزائر کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورت میں انگریزوں کا کارخانہ قائم کرنے کا خیال مارلو کے دل میں بھی موجود تھا۔

سترھویں صدی کے آخر میں انگلستان کے ملک الشعرا ڈرائیڈن Dryden (۱۶۳۱ء۔۱۷۰۰ء) نے "اورنگ زیب" کے نام سے ایک ڈراما لکھا، یہ پہلا ادیب ہے جس نے اپنے ڈرامے کے لئے خالص ہندوستانی پلاٹ پسند کیا۔ لیکن اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی ہندوستان کی نسبت انگریزوں کی معلومات بہت محدود تھیں۔ بعض باتیں تو اس میں اس قدر غلط اور مضحکہ انگیز لکھی گئی ہیں کہ اگر خود اورنگزیب یہ ڈراما دیکھتا تو وہ اپنے تئیں بھی مشکل سے پہچان سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈرائیڈن نے مغلیہ سلطنت کی نسبت چند باتیں سنی ہونگی۔ انھیں کی بنیاد پر اس کے تخیل نے ایک مشرقی تاجدار کی نسبت ایک من گھڑت پلاٹ تیار کر کے رکھدیا۔ اس کی معلومات کی غلطیوں کا اندازہ صرف اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ وہ ہندو مذہب کو اسلام کے ساتھ گڈمڈ کردیتا ہے۔ چنانچہ اس نے مراد کی چتا پر اس کی بیگم ملیسندا کا (یہ نام بجائے ہندوستانی کے یونانی معلوم ہوتا ہے) ستی ہونے کے لئے جانا بیان کیا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مردہ جلانے اور بیوہ عورت کے ستی ہونے کی رسم خاص ہندوؤں کی ہے اور مسلمانوں کو اس سے قطعاً کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے اورنگ زیب جیسے پکے مسلمان بادشاہ کے منہ سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں جن سے اس کا مسئلہ تناسخ کا قائل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

"تناسخ ہو اگر آیندہ روح غیر فانی کا بنے تو ریچھ یا شیر اپنی پچھلی زندگانی کا[۵۱]"

ایسی اہم غلطیوں کے بعد اگر اس ڈرامے میں عالمگیر اور شاہجہاں یونانیوں کے علم الاساطیر کا ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیں تو کیا تعجب کیا جاسکتا ہے۔

ملکہ این کا عہد اس عہد میں انگریزی ادب نے نیا چولا بدلا، اگرچہ اس وقت تک سفرناموں اور روزناچوں میں ہندوستان کے متعلق کافی مواد مہیا ہوچکا تھا تاہم پوپ اڈیسن جیسے مشرقی تخیل کے ادیب کے ہاں بھی چند معمولی باتوں کے سوائے اور کچھ نہیں پایا جاتا۔ طامسن (Thomson) شاعر نے اپنی نظم (Seasons) "سال کے موسم" میں دو ایک جگہ ہندوستان کا ذکر کیا ہے[۵۲]۔ اسیطرح Issac Watts

---

[۵۱] کلیات ڈرائیڈن (ڈراما اورنگ زیب)۔ [۵۲] موسم بہار اور موسم گرما میں ہندوستان کے غروب ہونیوالے سورج اور ہندوستانی انجیر کا ذکر ہے۔

آئزک واٹس (۱۷۴۸ء) نے ہندوستانی فلسفی (Indian Philosphher) کے نام سے ایک نظم لکھی ہے، انگریزی میں یہ پہلی نظم ہے جس میں ہندوستان کا مذہبی اثر پایا جاتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کی نسبت اس سے زیادہ انگریزی ادبیات میں کچھ نہیں پایا جاتا کہ وہ ایک گرم ملک ہے جہاں ہاتھی، چیتے اور کیلے کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں، نیز یہ کہ یہاں کے بادشاہوں کے درباروں میں ہر وقت موتی، زمرد اور سونا ہی چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ انگریزی کا مشہور ادیب Johnson (جانسن) تو ہندوستانیوں کو "وحشی" کا لقب عطا کرتا ہے جو بجائے ان کے افریقہ کے غلاموں کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے، لیکن انگلستان سے آنے والے سیاحوں میں بعض ایسے علما اور مورخ بھی تھے جن کے سفرناموں اور روزنامچوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان جواہرات اور درندوں سے بھرا ہوا ایک گرم ملک ہی نہیں ہے بلکہ اس میں "عقل و مذہب اور بلند تخیل رکھنے والے انسان بھی بستے ہیں"۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اٹھارھویں صدی کے وسط تک انگلستان کی نمائندگی کرنے والی ایک تجارتی کمپنی کے ذریعہ ہندوستان کے حالات انگریزوں کو معلوم ہوتے رہے۔ مگر جب لارڈ کلائو بہت بڑی دولت لیکر وطن پہونچا اور اس کے بعد اور لوگ بھی ہندوستان سے مالا مال ہوکر جانے لگے تو لوگوں کی نگاہیں عام طور پر ہندوستان کی طرف اُٹھنے لگیں، باوجود اس کے اس زمانہ میں ہندوستان کے ساتھ انگلستان والوں کے رسل و رسائل اور تجارت کی بدولت مستحکم روابط قائم ہو گئے تھے، تاہم ہندوستان کی اندرونی زندگی کی نسبت اہل انگلستان کو کچھ معلوم نہ ہوا اور وہاں کے امرایان کے دولتمند انگریزوں کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ عام اہل انگلستان بھی رشک کی وجہ سے اُن کو بُرا بھلا ہی کہتے رہے، اس لئے کہ اُنھوں نے ہندوستان میں رہکر "تباہ شدہ صوبجات" اور متعدد مقتولین سے اپنی ناجائز دولت حاصل کی تھی اور "ہزاروں کے کھنڈروں" پر اپنی عمارتیں تعمیر کی تھیں[۵۱]۔

آخر کار مظلوم ہندوستان کے ساتھ ہمدردی کا زمانہ آیا۔ اور Burke (برک) جیسے آتش بیان مقرر اور مقنن نے دار العوام میں وارن ہیسٹنگز پر طرح طرح کے سنگین الزامات قائم کرتے ہوئے ایک جذبات انگیز تقریر کی، اور اُن تمام مظالم کی تشریح کی جو ہیسٹنگز اور اس کے ساتھیوں نے ہندوستانیوں پر کئے تھے۔ "برک کی تقریر وارن ہیسٹنگز کے الزام پر" انگریزی ادبیات کا ایک شہپارہ ہے، اور اگرچہ یہ تقریر محض وقتی دلچسپی کی چیز تھی

---

۵۱ یہ وہ فقرے ہیں جو دراصل برک کے ہیں جو اس نے اپنی تقریر میں استعمال کئے ہیں۔

۵۲ دیکھو تصانیف برک (Burke's Works) جلد چہارم و پنجم ص ۲۲۰ تا ص ۵۳۳۔ اور ص ۹۶ (طبع جارج بیل ۱۹۱۰ء) برک نے اپنی رپورٹ ۱۴ اپریل ۱۷۸۶ء کو دار العوام میں پیش کی تھی۔

ہندوستان میں بودھ مذہب کا مستقبل

(از بابو گنگا چرن لال صاحب بی اے)

کچھ عرصہ سے برما اور سیلون کے بودھ بھکشوؤں کا دھیان ہندوستان کی طرف لگا ہوا ہے، بھگوان بدھ کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی، یہیں اُنھوں نے چھ برس سخت ریاضت کی اور روشنضمیری حاصل کرکے اپنے عالمگیر مذہب کی تلقین شروع کی، دنیا بھر کے بودھ عقیدتمند اس ملک کے لئے وہی عظمت رکھتے ہیں جو اہل اسلام مکہ و مدینہ اور مسیحی و یہودی بیت المقدس کے لئے رکھتے ہیں۔ یہ ملک اُن کی روحانی امیدوں کے ساتھ وابستہ ہے اور اُن کی دلی خواہش ہے کہ ایک بار پھر اس ملک میں بودھ مذہب پھیل جائے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ کس حد تک یہ اُمیدیں بر آئیں گی، ابھی تک ہندوستانیوں کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا مگر چند سال کے عرصہ میں اور بے سروسامانی کی حالت میں غیر ملک کے فقرا جو کچھ بھی کام کر پائے ہیں اس سے یہ امید ضرور ہوتی ہے کہ ان کی کوششیں بیکار نہ جائیں گی۔ اس میدان میں موجودہ زمانہ میں جو لوگ کام کر رہے ہیں وہ قابل ذکر ہیں کیونکہ کچھ عرصہ کے بعد وہ لوگ بھی جو ان کی پے درپے کوششوں سے مستفیض ہونگے اُن کو بھول جائیں گے۔ ہر ایک پہلے کام کرنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے

ان کارکنوں میں سیلون کے زندہ جاوید بودھ بھکشو دیومتر دھرمپال ہو انگاریکا دھرمپال کے نام سے سارے عالم میں مشہور ہیں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اشوک اور کنشک کے بعد شاید ہی کسی بودھ نے ہندوستان میں بودھ دھرم پھیلانے کی اتنی کوشش کی ہوگی جتنی دھرمپال کر رہے ہیں۔ آپ سیلون کے ایک مشہور متموّل خاندان سے ہیں جنھوں نے دنیا کے عیش و آرام کو چھوڑ کر فقیری جامہ زیب تن کیا اور تھوڑی سی عمر ہی میں کرنل آلکاٹ کے ساتھ ہو لئے جو ایک عقیدتمند بودھ اور تھیاسوفیکل سوسائٹی کے بانی مبانی تھے۔ آپ چالیس برس سے اس میدان میں کام کر رہے ہیں اور آپ کی زندگی کا کوئی دن اس کوشش سے خالی نہیں رہا۔ آپ نے مہابودھی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کی شاخیں سیلون۔ برما۔ ہندوستان۔ انگلستان اور امریکہ کے دور دراز ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ نے کئی بار ان دور دراز ٹھنڈے ملکوں کا سفر کیا جو آپ کی صحت کے لئے نہایت مضر ثابت ہوا۔ اور وہاں کے باشندگان کا دھیان بھگوان بدھ کی بے نظیر

زندگی اور بدھ مذہب کے اعلیٰ اصولوں کی طرف رجوع کیا۔ ہندوستان میں آپ نے پے در پے کوششیں اس امر کی کیں کہ گیا کا بودھ مندر پھر بودھ لوگوں کے ہاتھ میں آجائے۔ مگر اہل ہنود کی ضد کی وجہ سے اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ تاہم آپ نے کئی ہزار کے صرف سے گیا میں ایک دھرم شالہ تعمیر کرا دیا ہے جس کی وجہ سے دور و دراز کے بودھ یاتریوں کو بڑی سہولیت ہوتی ہے اور ایک آرام گاہ گیا اسٹیشن کے پاس بنوائی ہے۔ ان کے علاوہ کلکتہ میں ایک لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ایک عالی شان دھار (بودھ مندر) بنوایا اور اس میں بھگوان بدھ کے پاکیزہ جسم کی ہڈیاں رکھیں۔ کلکتہ سے آپ کی سرپرستی میں ایک انگریزی رسالہ "مہا بودھی" کے نام سے شائع ہوتا ہے جو بودھ مذہب کے رسالوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے ہفتہ وار بودھ دھرم اور بھگوان بدھ کی سیرت پر لیکچر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے ہندوستانی بودھ دھرم سے خاص دلچسپی رکھنے لگے ہیں۔ آجکل دھرمپال جی سارناتھ میں مقیم ہیں جہاں آپ نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے خرچ سے ایک نہایت خوبصورت اور عالیشان دھار تعمیر کرایا ہے جس میں بھگوان بدھ کے پاکیزہ جسم کی ہڈیاں مدفون کی ہیں۔ آپ اپنی زندگی کا بقیہ حصہ اسی جگہ گزارنا چاہتے ہیں جہاں بھگوان نے اپنا پہلا وعظ دیا تھا اور جہاں آپ ایک بودھ درس گاہ کے قائم کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

بلرامپور سے سات میل کے فاصلہ پر اودھ کی راجدھانی سروستی کے کھنڈرات ہیں۔ اس مقام پر ایک ہندوستانی تاجر اناتھ پنڈک نے بھگوان بودھ کے واسطے نہایت عالی شان دھار بنوایا تھا جس میں بھگوان ۲۵ پچیس برس تک مقیم رہے۔ اس جگہ ایک برمی بھکشو نے جن کا نام مہندر بابا ہے دو دھرم شالے بنوائے ہیں جس کی وجہ سے بودھ یاتریوں کو بڑا آرام ملتا ہے، آس پاس کے دیہاتوں میں اس فقیر کی بڑی عزت ہے اور وہ اپنی پاکیزہ زندگی سے بھگوان بودھ اور اُن کی تعلیم کی عزت بڑھا رہا ہے۔

خاص بلرامپور میں ایک برمی بھکشو اسیا ایک اعلیٰ پیمانہ پر عمارت بنانے کا کام کر رہا ہے اور اگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگیا تو بلرامپور میں ایک بودھ درسگاہ قائم ہو جائیگی۔

راجگرہ وہ مقام ہے جہاں پہلی بودھ کونسل منعقد ہوئی تھی، بھگوان بدھ کے زمانہ میں یہ مگدھ کا دارالخلافہ تھا اور بھگوان کے معتقد مہاراجہ بمب سار یہاں حکومت کرتے تھے۔ یہاں گرم پانی کے کئی چشمے موجود ہیں اور پانچ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جن پر جینی اور اہل ہنود کے مندر بنے ہوئے ہیں۔ اس میں سے ایک پہاڑی پر جس کو گدر کوٹ کے نام سے پالی کتابوں میں یاد کیا گیا ہے بھگوان بدھ اکثر آکر قیام کرتے تھے۔ اس مقام پر غیر ملکوں سے سینکڑوں بودھ یاتری آتے ہیں اور ایک نیک برمی بھکشو نے نہایت خوبصورت چھوٹا سا دھرم شالہ بنا کر سکونت اختیار کرلی ہے۔ اس کی زندگی گزشتہ بودھ زمانہ کی یاد دلاتی ہے جس کو یاد کرکے عقیدتمند بودھ آبدیدہ ہو جاتے ہیں

اس مقام سے چند میل کے فاصلہ پر نالندہ یونیورسٹی کے کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں جو گزشتہ عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔

کسی نگر ضلع گورکھپور میں تحصیل کسیا سے چند میل کے فاصلہ پر وہ مقام ہے جہاں بھگوان بدھ نے رحلت فرمائی تھی۔ اس مقام پر پرانے زمانہ کے کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں اور ایک نہایت لمبا چوڑا لیٹا ہوا بت بھگوان بدھ کا دستیاب ہوا ہے جو اس بات کا شاہد ہے کہ اسی جگہ بھگوان بدھ نے سال کے دو درختوں کے بیچ میں لیٹے ہوئے اس دار فانی سے کوچ فرمایا تھا۔ ایک عرصہ ہوا کہ صوبہ بہار کے ایک معزز راجپوت گھرانے کا ایک لڑکا غدر کی بربادی کے بعد سیلون چلا گیا اور وہاں کی خانقاہوں میں تعلیم پانے کے بعد بدھ مذہب میں داخل ہو گیا اور بھکشو بن گیا۔ اپنے وطن میں واپس آنے کے بعد اس فقیر نے کسی نگر میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں ایک دھرم شالہ بنوایا۔ اس ہندوستانی بھکشو کی آس پاس کے دیہاتوں اور غیر ممالک کے یاتریوں میں بڑی عزت تھی اور برما و سیلون میں مہابیر بھکشو کا نام کافی طور سے مشہور تھا۔ اب اُن کی جگہ چندرمنی بھکشو کام کر رہے ہیں۔ جتنے برمی بھکشو ہندوستان میں موجود ہیں وہ آپ کو اپنا گرو مانتے ہیں اور برما کے یاتری لوگ بھی خاص طور سے آپ کی عزت کرتے ہیں۔ قرب و جوار کے دیہاتوں میں آپ کی بہت عزت ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ بیساکھ پورنما کے دن سات روز متواتر بھگوان بدھ کی یادگار میں یہاں ایک میلہ کیا جاتا ہے جس میں ہزارہا آدمی حصہ لیتے ہیں۔ آپ ہندو مذہب اور سنسکرت کے بھی ماہر ہیں

دھرمپال جی کے ساتھ جو دو اور ہستیاں کام کر رہی ہیں اور جن سے آئندہ کی بہت کچھ اُمیدیں وابستہ ہیں اُن میں سے ایک سری دیو پریہ وال سنہا ہیں، آپ بھی سیلون کے باشندے ہیں اور اوائل عمر ہی سے دھرمپال جی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ایک سال کا عرصہ ہوا کہ آپ ولایت سے واپس آئے ہیں، وہاں آپ مہابودھی سوسائٹی کے منیجر تھے اور جب سے واپس آئے ہیں نہایت ہمت اور جانفشانی سے دھرمپال جی کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ آپ کی ذہانت، محنت اور جانفشانی اس بات کی شاہد ہے کہ آپ آئندہ بہت کام کرینگے

دوسرے صاحب ایک گجراتی ہیں آپ کا بودھ نام سوگتا کانتی ہے، ابھی آپ نوعمر ہی ہیں مگر آپ نے پالی اور انگریزی زبان میں کافی مہارت حاصل کر لی ہے۔ آجکل آپ لندن میں بودھ مذہب کی اشاعت کا کام کر رہے ہیں مگر عنقریب ہندوستان میں واپس آکر یہاں کام کریں گے۔

ان لوگوں کے کام میں کچھ ہندوستانیوں نے بھی ہاتھ بٹایا ہے۔ مہابیر سوامی اور سوگتا کانتی جی کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ مراد آباد کے ایک فقیر بابا دیبی صاحب بھی قابل ذکر ہیں۔ آپ کا تعلق رائے بہادر بابو سالگرام جی صاحب رادھا سوامی مت کے دوسرے گرو سے تھا مگر تھوڑے ہی دنوں کے ست سنگ کے بعد آپ نے ایک علیحدہ ست سنگ "سنت مت" کے نام سے قائم کیا۔ آپ بودھ بھگوان کے بڑے عقیدتمند تھے اور اُن کو ہندوستان

کا سب سے بڑا سنت مانتے تھے۔ آپ نے کوشش کر کے مشہور بودھ کتاب "دھمپد" کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کرایا اور مفت تقسیم کیا۔ آپ کے ست سنگ کے آدمیوں میں جن کی تعداد صوبہ بہار کے ضلع پورنیا اور اُس کے آس پاس تقریباً پانچ ہزار اور مراد آباد کے نواح میں تقریباً ایک ہزار ہے پنچ شیل یعنی بودھ مذہب کی پانچ ممانعتوں کی پابندی لازمی ہے اور دھمپد کی بڑی عظمت ہے۔

ان کے علاوہ لاہور کے مشہور ایڈووکیٹ اور کشمیری پنڈتوں کے رکن رائے بہادر پنڈت شیونراین صاحب شمیم بھی بڑے عقیدتمند بودھ ہیں۔ بودھ دھرم کے متعلق آپ نے کئی رسالے لکھکر مفت تقسیم کئے ہیں اور گزشتہ زمانہ میں کوئی بودھ تحریک ایسی نہیں ہوئی جس میں آپ نے دل کھول کر مدد نہ دی ہو۔ آپ نے اپنی کوٹھی کا نام بھی "کپل وستو" رکھا ہے اور اس میں کئی پورانی بودھ مورتیاں اور کتابیں اکٹھا کی تھیں جو اب سارناتھ دھار کو نذر کر دی ہیں۔ بودھ برادران کی خاطر و مدارات آپ بڑی فراخ دلی سے کرتے ہیں جس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو ڈلہوزی یا لاہور میں آپ کا مہمان رہا ہو۔ وہ پندرہ دن جو میں نے آپ کے پاس ڈلہوزی میں گزارے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

بمبئی کے ڈاکٹر نائر جنھوں نے اپنے خرچ سے ایک میڈیکل اسکول، خیراتی اسپتال اور بودھ دھار قائم کیا ہے، بھگوان بدھ کے بڑے عقیدتمند ہیں اور وہاں کی بودھ سوسائٹی کے روح رواں ہیں، آپ بڑے شوق سے بھگوان کی پیدایش کا دن مناتے ہیں۔ جس میں ہندوستان کے مشہور لیڈر شرکت فرماتے اور جلسہ کی صدارت کرتے ہیں

مدراس میں پروفیسر لکھشمی نراسو بودھ دھرم کے بڑے محقق اور سرگرم کارکن ہیں۔ آپ کی کتابیں مستند سمجھی جاتی ہیں اور جس طرح آپ کی کوششیں بارآور ہوئی ہیں اگر ہر ایک کی کوششیں اتنی ہی کامیاب ہوں تو بودھ مذہب کا مستقبل امید افزا نظر آتا ہے۔

صوبہ جات متحدہ میں بابو شیوچرن لال بی۔اے ایل ایل۔بی لکھنوی بودھ دھرم کے روح رواں تھے آپ نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں بھگوان بدھ کی ایک سوانح عمری انگریزی زبان میں لکھی تھی اور بدھ دھرم کے متعلق سینکڑوں مضامین لیڈر اور دیگر اخبارات میں شائع کرائے تھے۔ افسوس کہ آپ کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی اور اس وقت کہ وہ عنقریب سارناتھ جاکر زندگی کا بقیہ حصہ بدھ مذہب کی خدمت میں گزارنے کا ارادہ کر رہے تھے ۶۔ جون سنہ ۱۹۳۱ع کو پچاس سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ لکھنؤ میں دو بودھ مندر ہیں جن میں سے ایک میں ایک ہندوستانی بھکشو سوامی بودھا نند اچھوت ذاتوں میں کام کر رہے ہیں۔

کلکتہ اور دارجلنگ میں بہاڑی بودھوں کے درمیان شری دھرماچاریہ نہایت جانفشانی سے کام کررہے ہیں، اور بروا لوگوں کے بھکشو بھی بودھ مذہب کے موجودہ پیروؤں میں جوش کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ اعلیٰ قوموں اور اچھے گھرانوں کے بعض نوجوان بھی بودھ بھکشو ہوگئے ہیں اور ان کی ذات سے ہندوستانی بودھوں کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ بھکشو آنند، ماہل اور سنکیرتن کا نام شاید آئندہ کے بودھ عقیدتمند عظمت کے ساتھ لیا کریں گے۔ کیونکہ یہ لوگ بڑی محنت اور جوش سے کام کررہے ہیں۔

محبّت

محبت مثل ایک ریگستانی پھول کے ہے۔

یہ عرب کے "عود" کی طرح ہے جو صرف ایک مرتبہ پھولتا ہے اور مرجھا جاتا ہے، یہ پھول زندگی کے ریگستانی ویرانے میں کھلتا ہے، اور اس کے حسن کی طلعت اس ریگستان میں ایسی معلوم ہوتی ہے جیساکہ گردآلود آسمان میں ستارہ اس کے اوپر روحانیت کا سورج ہے اور اس کے گرد اس کے تقدس کی ہوا چلتی ہے۔

ایک قدم کی گونج سے محبت کا پھول کھل جاتا ہے اور اپنے حسن کی رعنائیوں کے ساتھ اپنا رُخ قریب سے گزرنے والے کی طرف کردیتا ہے۔

وہ اسے توڑ لیتا ہے اور اپنے ساتھ بہت دُور لیجاتا ہے اتنی دور کہ پھول مرجھا جاتا ہے

زندگی کے ویرانے میں صرف ایک مکمل پھول ہے اور وہ محبت ہے۔

ہماری دشت نوردی کے دھندلکے میں صرف ایک مستحکم روشنی ہے اور وہ محبّت ہے۔

ہماری مایوسی کی تاریکی میں صرف ایک امید ہے اور وہ محبت ہے۔

محبت کے علاوہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب باطل و فانی ہے۔

کون بتا سکتا ہے کہ محبت کا وزن اور پیمانہ کیا ہے!

یہ گوشت سے پیدا ہوتی ہے، روح میں رہتی ہے اور دونوں سے اپنے لئے آسایش مہیا کرتی ہے۔

حُسن کے لئے یہ ایک ستارہ ہے۔

اس کی شکلیں بہت ہیں اور سب حسین ہیں مگر کوئی اس جگہ کو نہیں جانتا، جہاں سے یہ ستارہ طلوع ہوا، اور نہ اس افق کو جہاں یہ غروب ہوگا۔

(ترجمہ از انگریزی) (خلش صدیقی)

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

(از بابو انت پرشاد نگم بی۔اے۔ ایل ایل بی۔ ایڈوکیٹ چیف کورٹ اودھ)

ہندوستان کی سیاسی زندگی میں گزشتہ چند ماہ کا زمانہ مقابلۃً خاموشی کا زمانہ تھا۔ مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون کا سمجھوتہ نان کوآپریشن کی جنگ کے لئے ایک عارضی التوا سمجھا جانے لگا تھا۔ عزیزانِ وطن یہ طے کر چکے تھے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے آنیوالے اجلاس میں مہاتما گاندھی کی شرکت ہندوستان اور انگلستان کی دائمی مفاہمت اور امن کا سامان فراہم کردیگی۔ مہاتماجی کے عزم سفر کے پہلے بھی کئی مرتبہ فضا بگڑی۔ ان کے راستے میں روڑے اٹکے ایسے واقعات پیدا ہوئے جن کی وجہ سے کانگریس کے نمایندگان کی شرکت امر محال ہونے لگی۔ لیکن رفتہ رفتہ سب رکاوٹیں دور ہوتی گئیں، مہاتما گاندھی اور دیگر اصحابِ قوم لنڈن پہونچے اور ہمارے ملک کی آئندہ قسمت کے متعلق گفت وشنید ہوئی، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ نشستند وگفتند وبرخاستند۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم نے کانفرنس کا اجلاس برخاست کرتے ہوئے فرمایا کہ موجودہ گورنمنٹ برطانیہ نے پورے طور سے یہ منظور کر لیا ہے کہ ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کا اعلان اس کی پالیسی کے عین مطابق ہے۔ کانفرنس کے کام کی تکمیل کے لئے چند کمیٹیاں قائم کی جائیں گی جو آیندہ سال (۱۹۳۲ء) کے شروع میں ہندوستان میں کام کریں گی، اور تمام اسکیم پر آخری تبصرہ کرنے کے لئے ہمیں ایک بار پھر اکٹھا ہونا پڑیگا۔ غرض کانفرنس کی نشست کا یہ نتیجہ نکلا کہ کانفرنس آئندہ کے لئے ملتوی ہوگئی۔

گول میز کانفرنس کی کامیابی میں شکوک کے بادل شروع ہی سے چھائے ہوئے تھے ہندوستان کی آزادی کا اہم سوال پیچھے پڑ گیا۔ اقلیتوں کا مسئلہ دیگر کارروائی کے راستہ میں حائل ہوگیا۔ اکثر اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقلیتیں کانفرنس کا تختہ ہی اُلٹ دینگی۔ برطانوی مدبران نے اسی کو ہندوستان کا کمزور ترین پہلو سمجھ رکھا ہے، انھوں نے پہلے اسی کی آڑلی، عزیزان وطن نے ذرا قدم آگے بڑھایا بس اقلیتوں کو شہ دیگئی۔ اس مرتبہ اچھوتوں نے مسلمانوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کی، مخالفین کی تائید نے سمندِ شوق پر ایک اور تازیانے کا کام کیا۔ مسلم جماعت اس بات پر قائم ہوگئی کہ اگر ان کے مطالبات منظور نہ کر لئے جائیں گے تو وہ دوسرے نازک اور اہم مسائل پر بحث ہی نہ ہونے دینگے۔ محبانِ وطن نے گتھیوں کو سلجھانے کی کوششیں

کیں، مختلف حل تجویز کئے لیکن جداگانہ نیابت کے حامی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر ہمارے پرانے رفیق مسٹر ریمزے میکڈانلڈ اس غریب قوم پر شفقت اور عنایت کا دم بھرتے ہوئے اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے پر آمادہ ہوگئے لیکن اس شرط سے کہ جملہ شرکایانِ کانفرنس اس امر پر اپنے دستخط ثبت کردیں کہ جو فیصلہ آنجناب کردینگے اس کو سب لوگ بلا چون وچرا منظور کرلیں گے۔ اس میں بھی ناکامیابی ہوئی تو حکومت کی جانب سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اچھا ہم ایک موقعہ باہمی صلح کا اور دیتے ہیں ورنہ گورنمنٹ اس معاملہ میں بھی اپنا فرض منصبی ادا کرے گی اور عارضی طور پر اس مسئلہ کو حل کردیگی۔ وزیر اعظم نے یقین دلایا کہ گورنمنٹ کا منشاء یہ نہیں ہے کہ مسئلہ اقلیت کی دقت کو ہندوستان کی سیاسی ترقی کے راستہ میں سدراہ ہونے دے، مگر جداگانہ نیابت کے نتائج اس حد تک خوفناک ثابت ہوچکے ہیں کہ اہل وطن وزیر اعظم کے اس بیان کو بالکل خاموشی کے ساتھ ماننے میں ذرا تامل کریں گے۔ آخر ہماری سیاسی فضا میں فرقہ وارانہ اختلافات کی وبا پھیلانے کا ذمہ دار کون ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر کرٹس کے مندرجہ ذیل الفاظ خالی از دلچسپی نہ ہونگے:۔

"ہندوستان کے جمہوری طرز حکومت میں چند سال ہوئے جداگانہ انتخاب کے اصول کو جگہ دے کر برٹش گورنمنٹ نے اہم ترین غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ اصول قائم رہا تو ہندوستان میں فرقہ بندی کا ایک انوکھا سسٹم قائم ہوجائیگا جو ہمیشہ اس کی زندگی کی بیخکنی کرتا رہے گا۔ جب تک یہ سسٹم قائم ہے ہندوستان کبھی قومیت کی معراج تک نہیں پہونچ سکتا، اور جتنا ہی زیادہ عرصہ تک یہ رہیگا اتنی ہی زیادہ دقت اس کے دُور کرنے میں ہوگی، حتی کہ بالآخر اس کا خاتمہ محض خانہ جنگی کے ہاتھوں ہی سے ہوسکے گا۔ ہمارے اوپر ہندوستان کو ایک قوم بنانے کی ذمہ داری ہے۔ جداگانہ نیابت کے اصول کو مان کر ہم اپنے اس فرض منصبی میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس سسٹم نے اب بھی قومی زندگی کو اس قدر بیخکنی کرلی ہے کہ اس کا خاتمہ ایکدم ناممکن ہوگیا ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس شکنجہ کو جس سے ہم نے ہندوستان کو جکڑ رکھا ہے ڈھیلا نہ کیا گیا تو ہم ایسے جرم کے مرتکب ہونگے جو ناقابل معافی ہے۔"

حکمران قوم کے ایک فاضل اور صاحب اقتدار اہل سیاست کا یہ اقبال جرم ان مدبران برطانیہ کے لئے سبق آموز ہونا چاہیئے جو آئے دن ہندوستان کی آزادی کی قابلیت کے مقابلہ میں فرقہ وارانہ اختلافات کی دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ فرقہ وارانہ ذہنیت کے بانی ہوتے ہوئے اس وعظ پر کہ ایمانداری سے کام لو، واقعات کا مقابلہ کرو اور تفرقات کو مٹا دو، بے اختیار شاعر کا مصرعہ زبان سے نکلتا ہے کہ "ہر عیب کہ سلطاں بہ پسند د ہنر است" پہلے طرز حکومت میں جداگانہ نیابت کا اصول داخل کیا جس نے فرقہ وارانہ مخالفت کی آگ مشتعل کی۔ اب ہم سے

توقع کی جاتی ہے کہ اگر ہم واقعی ترقی کے خواہاں اور جویاں ہیں تو پہلے اس آگ کو بجھا کر دکھائیں۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردئی   باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

مگر باوجود اس کے کہ یہ آگ غیر نے لگائی ہم کو اپنا گھر بچانے کی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ اہل وطن اگر وسیع النظری سے کام لیں اور یہ سمجھ لیں کہ باہمی تفرقہ ہر فریق کے لئے نقصان دہ ہوگا تو یہ مشکل فوراً حل ہو سکتی ہے۔ حقیقتاً اسی وقت ہم مکمل سوراج کے اہل ہونگے جب باہمی نفاق کو مٹا کر اہل حکومت کے دلوں پر یہ اثر قائم کر دیں گے کہ ہم واقعی طور پر طیار ہیں۔

اقلیتوں کا مسئلہ ہماری کامیابی کے راستہ میں حائل ضرور تھا، مگر یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگر یہ دقت نہ ہوتی تو ہمارے مطالبات پورے ہو جاتے۔ مطالبات سے اس جگہ پر مراد ان حقوق سے ہے جن کو مجموعی طور سے ہم "ڈومینین اسٹیٹس" (Dominion Status) یا درجۂ نوآبادیات کہتے ہیں، عام طور پر ہندوستان میں درجۂ نوآبادیات سے وہ سیاسی حیثیت سمجھی جاتی ہے جو کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ وغیرہ کی ہے۔ یعنی صرف اندرونی نظام حکومت نہیں بلکہ حفظ مملکت اور افواج پر پورا اختیار ہونا اور خارجی امور میں پورا دخل۔ اس کے بارے میں وزیر اعظم نے یکم دسمبر سنہ ۳۱ء کو اپنے اعلان میں کیا کہا، صرف اس قدر کہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کا اعلان اب بھی قائم ہے، ہاں اتنا اور ہے کہ اس اعلان میں جو پالیسی واضح کی گئی ہے اس کو موجودہ گورنمنٹ نے جو تمام برطانوی پولیٹیکل پارٹیوں کی متحدہ گورنمنٹ ہے منظور کر لیا ہے۔

اس آخری امر سے اس حلقہ میں ضرور خوشی منائی جائیگی جس کو جنوری کے اعلان کی تکمیل میں شبہ تھا کہا جاتا ہے کہ جس وقت وزیر اعظم نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ موجودہ گورنمنٹ نے انھیں اختیار دیا ہے کہ وہ اس بات کو واضح کر دیں کہ ۱۹ جنوری کے اعلان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، اُس وقت حاضرین نے خوشی کی تالیاں بجائیں۔ ہم لوگ اس قدر ضعیف الاعتقاد ہو گئے ہیں کہ کانفرنس میں کچھ کھو نہ بیٹھنے کی خوشی مناتے ہیں۔ کثیر تعداد اُن حضرات کی ہے جو اس اعلان سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ صرف چند ہی لوگ ایسے ہونگے جن کی امیدوں پر پانی پڑ گیا۔ ان کا خیال ہے کہ کانفرنس نے اگر ۱۹ جنوری کے اعلان میں اضافہ نہ کیا تو کانفرنس بیکار رہوئی، کیونکہ ۱۹ جنوری کے اعلان میں ہندوستان کی توقعات کے پورا کرنے کا سامان نہیں ہے، اس اعلان میں جو حکومت کی پالیسی شامل ہے اس کی بنا پر درجہ نوآبادیات کا دعویٰ کس طور سے کیا جا سکتا ہے، ذرا اس کے الفاظ پر غور کیجئے۔

"حکومت ہند کی ذمہ داری مرکزی اور صوبجاتی قانونی کونسلوں پر رہیگی، مگر ان شرائط کے ساتھ جو تبدیلی کے زمانہ میں ضروری ہونگی تبدیلی کے زمانے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جو شرائط عاید

کی جائیں گی ان کے لئے محفوظ اختیارات کی ترتیب اس طور پر دی جائیگی کہ وہ ہندوستان کو ذمہ دار حکومت کی آخری منزل تک پہونچنے میں سد راہ نہ ہوں۔ موجودہ حالات میں حفظ مملکت او امورات خارجیہ کے صیغہ جات گورنر جنرل کے ہاتھ میں رہیں گے۔"

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ حفظ مملکت اور امورات خارجیہ کے صیغہ جات محض تبدیلی کے زمانہ تک گورنر جنرل کے سپرد نہ ہونگے بلکہ صورت حال ہی یعنی اس اعلان کے حدود کے اندر۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گورنمنٹ کی آئندہ پالیسی یہ ہوگی کہ اندرونی نظام مملکت میں اہل ہند کو بتدریج ترقی کے ساتھ ذمہ داری دی جائیگی لیکن تحفظ ملک اور امورات خارجیہ میں ذمہ دار حکومت کو کوئی دخل نہ ہوگا۔ درحقیقت یہ اعلان کوئی نیا اعلان نہ تھا۔ اس کے پہلے لارڈ ارون سابق وائسرائے ہند نے بھی آخر اکتوبر ۲۹ءء میں گورنمنٹ کی پالیسی کو واضح کیا تھا۔ وائسرائے کے الفاظ حسب ذیل تھے:۔

"ملک معظم کی گورنمنٹ کی رائے میں ۱۹۱۷ء کے اعلان میں یہ منشا شامل ہے کہ ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ ڈومینین اسٹیٹس ہوگا۔"

ان الفاظ کے بعد کوئی شبہ اس امر میں نہیں ہو سکتا کہ پھر گورنمنٹ نے کوئی جدید پالیسی اختیار نہیں کی بلکہ ۱۹۱۷ء کی پالیسی کو دوسرے الفاظ کا دلفریب جامہ پہنا کر اہل ہند کو گرویدہ کر لیا۔ عزیزان وطن عرصہ سے ڈومینین اسٹیٹس کی چیخ و پکار مچائے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ نے اس طوفان عظیم کو فرو کرنے کے واسطے لفظ "ڈومینین" کا حلقۂ معنی زیادہ وسیع کر دیا اور اس میں ایسا طرز حکومت بھی شامل کر دیا جس میں محض اندرونی نظام ملکی کا اختیار دیا گیا ہو۔ انگریزی زبان کے الفاظ کے صحیح معنی اور مطلب لگانے کا پورا اختیار انگریزوں کو ہے جو اس کے اہل زبان ہیں۔ اس معاملہ میں اہل ہند کی دخل اندازی محض ان کا تکبر اور گھمنڈ ظاہر کرتا ہے۔ جس پر توجہ دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ۱۹۱۷ء کے اعلان کے متعلق اگر کسی کو شک ہو تو اس کے بارے میں صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ اس میں برٹش انڈیا میں ذمہ دار حکومت کی بتدریج ترقی کا اعلان کیا گیا تھا۔ ذمہ دار حکومت کی وسعت کا پورا اندازہ اس شاہی فرمان سے ہوتا ہے جو اس اعلان کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو نافذ کرتے وقت جاری کیا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ہم نے ہندوستان کو ان تمام بخششوں سے جو قدرت نے ہم کو عطا فرمائی ہیں مستفید کرانے کی کوشش کی ہے لیکن ایک تحفہ ہنوز باقی ہے جس کے بغیر کسی ملک کی ترقی پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتی۔ یعنی اہل ملک کا اپنے ملکی معاملات کے انتظام کرنے کا حق۔ بیرونی حملہ جات سے ہندوستان

کا تحفظ شاہی افتخار اور فرائض کے متعلق ہے۔ اس کے اندرونی معاملات کے نظام کا بار البتہ اہلِ ہند بجا طور پر اپنے اوپر لے سکتے ہیں۔ یہ بار اس قدر گراں ہے کہ جب تک وقت اور تجربہ پوری قوت پیدا نہ کر لے ایکدم اُٹھ نہیں سکتا۔ لیکن اب موقعہ دیا جائیگا کہ تجربہ میں اضافہ ہو اور جوں جوں قوت پیدا ہوتی جائے ذمہ داری بڑھ سکے"۔

غرضکہ ۱۹۱۷ء سے اب تک گورنمنٹ کی پالیسی یہ رہی ہے کہ اندرونی نظام ملکی میں ذمہ دار حکومت قائم کی جائیگی، لیکن یہ سفر منزلیں لیتے ہوئے طے کیا جائیگا، یہاں تک کہ خارجی امور اور حفظ مملکت کا تعلق ہے اس فرض سے برٹش گورنمنٹ نے ہنوز سبکدوشی حاصل نہیں کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے البتہ آپ کو اختیار ہے کہ اس کو محدود قسم کی ذمہ دار حکومت کہیئے یا کامل حکومت خود اختیاری، مکمل آزادی کہیئے یا ڈومینین اسٹیٹس۔

آپ کہیں گے کہ اگر یہی بات تھی تو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی کیا ضرورت تھی۔ کانگریس کی جد وجہد سے کیا نتیجہ نکلا۔ لبرل لیڈروں کی چیخ وپکار ہی بیکار ہوگئی۔ یہ سب کچھ سہی مگر اہل انگلینڈ میں اگر ہندوستانیوں کی تسخیر قلوب کی قابلیت نہ ہوتی تو سمندر پار سے حکومت کرنا اور باوجود عالمگیر مخالفت، ناراضگی اور بےچینی کے دابِ حکومت قائم رکھنا کیا کوئی مذاق تھا۔ وزیر اعظم نے کمیٹیاں قائم کرکے طوالت دینے کا طریقہ ضرور اختیار کیا مگر اس بات کا اطمینان ہمارے دلوں سے جانے نہ دیا کہ گفت وشنید کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے، اور اہل حکومت ایک نہ ایک دن ہماری حالتِ زار پر ضرور ترس کھائیں گے۔ مہاتما گاندھی کا روتیہ اب کیا ہوگا، اس میں شک نہیں کہ ان پر برطانوی تدبّر کا جادو نہیں چل سکا۔ ان کے قلب کی موجودہ حالت کا نقشہ شاعر کے الفاظ میں یوں ادا ہو سکتا ہے۔

نشہ میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ

وہ اپنا وعظ کہے جائے ہوشیار ہوں میں

منشی سوہن لال حقیر

(از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی، بی۔اے)

دنیا کی رونق و عظمت جو کچھ بھی ہے، اربابِ کمال کی بدولت ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اربابِ کمال ہی کی طرف دنیا کو کم توجہ ہوتی ہے دوسرے ملکوں میں یہ بات ہو یا نہ ہو مگر ہمارے ملک میں اہلِ علم و ادب جس کس مپرسی اور عدم التفاتی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ نہ صرف قابلِ افسوس بلکہ علم وکمال کے فنا کر دینے کی ایک زبردست وجہ ہے۔ بیشمار اربابِ فضل ایسے گزرے ہیں جن کی ساری عمر تحریر و تصنیف میں بسر ہوئی لیکن آج اُن کا نام تک کسی کو یاد نہیں۔ کیا وہ دن کبھی آئیگا جب یہ داغ قوم کے دامنِ تہذیب سے دُور ہوگا۔ اور ہم اپنے اربابِ ہنر کی قدر شناسی سیکھیں گے اور اُن کے جواہرات کی حفاظت ایک قومی فرض سمجھیں گے۔

منشی سوہن لال حقیر بھی ایسے ہی باکمال بزرگوں میں تھے جن پر ایک مہذب قوم کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ اور جن کے دم سے فارسی مذاق کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی قائم تھی۔ آپ کا کچھ کلام دیوانِ حقیر کے نام سے کنور کاشی کرشن نراین رئیس لکھنؤ کی حوصلہ مندی سے آپ کی حیات ہی میں طبع ہو گیا تھا لیکن اس کی طباعت و کتابت جس طریق پر ہوئی اُس سے تصنیف کا مقصد اولین یعنی یہ کہ مطالعہ خوشگوار ہو فوت ہو جاتا ہے۔ خیر یہی غنیمت ہے کہ ایک صاحبِ کرم نے ایک اہلِ کمال کی یادگار باقی رکھنے کی ہمت کی۔

حقیر مرحوم کے ذاتی حالات صرف اس قدر دریافت ہو سکے ہیں کہ آپ سکسینہ کایستھ تھے ستمبر ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے اور مارچ ۱۹۱۶ء میں وفات پائی۔ شاہجہانپور مسکن تھا اور غالباً وطن بھی۔ محافظ دفتر کلکٹری کے عہدے پر ممتاز تھے۔ آپ کے والد منشی ہزاری لال وکالت کرتے تھے۔ آپ کا خاندان علم و فضل، عرفان و فقر کا مخزن تھا آپ بھی سنسکرت اور فارسی کے عالم متبحر تھے۔ عربی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، دولتِ فقر میراث میں پائی تھی۔ چنانچہ اپنے ایک بزرگ خاندان کے متعلق دیوان حقیر میں تحریر فرماتے ہیں:-

"جد امجد فقیر حقیر مسمّی دولہہ رائے عرف امرداس کہ در معقول و منقول عالم متبحر بود از عنفوان شباب

ترک تاہل نمودہ در تلاش علم الٰہی و مرشد کامل بریاضت شاقہ دوراز عزلت بویرانہ ہا و صحرا گزرانید

آخر کار بمقام بسیاری صوبہ اودھ بہ بزرگوارے کہ آفتاب سپہر عرفاں بود دوچار شد ....

آخر بر شاخ لاہوت آشیانہ گزید۔ ہنوز مدفن لعینی جائے سمادھی آں برگزیدہ مقام موضع گود ہالی کہ از لکھنؤ

بہ فاصلہ ہفت کروہ است مع خانقاہ موجود است .... پدر بزرگوارم منشی ہزاری لال

صاحب کہ بعہدہ وکالت عدالت دیوانی ممتاز بود حسب ہدایت بہ مراقبہ و مکاشفہ تا حیات با اہل عیال

گزرانید فقیر حقیر بر جادۂ بزرگاں پا در طریقت میدارد۔"

اسی طرح ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

دستگیرم مرشد و پیرم جد ما بودہ است — فقر میراث است در دست من از آبائے من

مالک خم بود از خمخانہ شیخ کبیر — جرعۂ بر خاندانم ریخت و بر لبہائے من

بادۂ لاہوت اندر جام ناسوتی مراست — آسماں رقصد ز بوئے پنبۂ مینائے من

سترہ اٹھارہ سال ہوئے کہ راقم حروف کو اپنے والد مرحوم و مغفور کے ہمراہ حقیر مرحوم کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ میانہ اندام بزرگ تھے، پیرانہ سالی سے جسم ضعیف پر پوست و استخوان ہی باقی رہ گئے تھے۔ کشادہ لوح پیشانی ریاضت و معرفت کے اثر سے منور تھی عجب ذوق کے ساتھ اپنے اشعار سناتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کسی حدیث، قرآن کی آیت یا سنسکرت کے اشلوک بھی پڑھ دیتے تھے۔ دیوان حقیر میں اکثر ان کے حوالے ملتے ہیں۔ راقم حروف کے ایک قومی مسدس پر آپ نے اصلاح بھی فرمائی تھی۔ آپ کا سرمایۂ راحت زیست ایک ہی فرزند تھا جو ذہانت و ذکاوت میں اپنے پدر عالی مقام کے قدم بقدم تھا اور ایم۔ اے کی سند حاصل کرنے کے بعد منصفی کے عہدے پر فائز ہوا تھا مگر عین عالم شباب میں پیر و ضعیف باپ کو داغ مفارقت دے گیا۔ سچ ہے ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست — کس را مجال نیست بہ چون و چرائے ما

دیوان حقیر کی ابتدا چند چھوٹی چھوٹی مثنویوں سے ہوتی ہے، اس کے بعد غزلیات ہیں اور آخر میں چند رباعیاں اور قصائد ہیں۔ تمام کلام رموز حقائق و عرفان سے مملو ہے۔ طلب صادق و افکار صالح و اشغال صوفیہ کا آئینہ ہے۔ رنگ کلام قدیم فارسی گویان ہند کا سا ہے۔ بہ اعتبار کیفیت تمام وہ خوبیاں کلام میں موجود ہیں جو اعلیٰ پایہ شعرا کا امتیاز ہے۔ ہر صنف کا کچھ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

مثنوی

الٰہی پردۂ اسرار بردار — شکستہ تا کے مشتاق و بیدار

چہ پاسے ماچہ دست و دستگاہے — اگر لطفت نباشد خضر راہے

اگر نئے را نباشد یارِ دمساز — نخیزد از لب نے گاہ آواز

نہ مطرب گر زند مضراب بہ تار — نہ سازد سازِ خود اظہار اسرار

اگرچہ تیر را پرہست و سوفار — کند پرواز از دستِ کماندار

تو ہرجائی و از چشم نہانی — زمن ارنی و از تو لن ترانی

بدہ چشمے کہ نورِ جلوہ بیند — زہجران و غمش یکسو نشیند

بدہ عشقے کہ آتش بر فروزد — متاعِ ماسوا را پاک سوزد

ضمیرم را بدہ پروازِ لاہوت — زبان دپر بریزم گردِ ناسوت

ز نورِ احدیت پُر کن چراغم — مےِ توحید ریز اندر ایاغم

رحیقے مشکبوئے کاں ظہور است — ہمہ سرمایۂ سور و سرور است

لبالب ساغرم کن تا خطِ جور — کہ آسایم زجور و فتنۂ دور

زبانم را ز حرفِ بد نگہ دار — لبم را جوششِ استغفار بسیار

رہا از بندِ فکرِ آن و ایں کن — بروں از دل خیالِ کفر و دیں کن

مثنویات کے آخر میں ایک قصیدہ ہے، طول و طویل، نہایت شاندار، در پُر مغز ؎

احدیت آمد بذوقِ عشق پدیدار شد — بحر در آمد بجوشش موج نمودار شد

نیست بجز ذاتِ آب در کف و موج و حباب — نام چو شد فرد فرد وہم زاغیار شد

ظلمتِ کثرت زدل نور و ضیا در ربود — آنکہ رسن بودہ است صورتِ او مار شد

کثرتِ ظرفِ پرآب شمس نماید ہزار — آنکہ سوے قرصِ خور دید خبردار شد

قدرتش افسوں بخواند گشت حصارِ طلسم — کرسی و عرشِ بریں ثابت و سیار شد

فکر بہ قدرت نمود حیرتِ دل بر فزود — ہر کہ بقا در رسید از ہمہ بیزار شد

... ... — ... ...

دیدن او ممکن است کو بود از خویش غیر — دیدن چشمے ز چشم مشکل و دشوار شد

ہرچہ تصور کند ذہنِ بما ہستیش — پے بحقیقت نہ بُرد لبستۂ پندار شد

اسم ندارد خبر فعل نہ سازد اثر — ربط کند حرف اگر مہمل و بیکار شد

تا نشود سلب جس صورتِ ایجاب نیست — بحث بہ معقول و نقل منتج آزار شد

ہست ز منطق بری علمِ الٰہی حقیر
حجت و اثبات و نفی جملہ در و خوار شد

جزو چو گم شد بہ کل صورتِ کلی گرفت
قطرہ چو در بحر رفت قلزمِ زخار شد

جز تو ترا یار نیست مونس و غمخوار نیست
حاجتِ اظہار نیست وہم ز پندار شد

گرچہ نہان ست ذات جلوہ کند در صفات
تخم نہاں شد بہ نخل نخل پدیدار شد

غزلیات

ہست سرور ابد بادۂ عرفانِ ما
چرخ زند خم بخویش از مےِ جوشانِ ما

ہمچو نجوم سپہر پیش رخ آفتاب
نیست کند ہستیم جلوۂ جانانِ ما

گہ چو جدا می نہم پیرہنِ تن ز خویش
جلوہ کند در دلم شاہدِ عریانِ ما

... ...

نالہ مرغ چمن می برد از من مرا
خندۂ گل می درد جیب و گریبان ما

چاکِ گریبان ما خندۂ صبحِ طرب
عرصۂ عرشِ بریں گوشۂ دامان ما

آبِ سرشکم بچشم ساغرِ صہبائے عیش
سوز و گداز دلم شمع شبستانِ ما

از خمیر سنگ بنود شیشۂ صہبائے ما
آں قدر بالید انگورم کہ شد مینائے ما

دام گستردی بہ پستی دانہ افگندی بخاک
قلۂ قاف است جائے مسکنِ عنقائے ما

منہ دمے ز کیفِ خویش ساغرِ مے را
غنیمتے شمر ایامِ بہمن و دے را

گماں مبر کہ دو انگشتِ چوب نغمہ زند
نوازشِ لبِ دیگر بود لبِ نے را

بسوئے شہرِ خموشاں بیا بعبرت بیں
عروجِ تختِ سلیمان و حشمتِ کے را

ز رنگِ مختلف آراست چہرۂ ہر گل
ز برگ و بار نگر صنعتِ چمن پیرا

ز مور تا بہ سلیمان ز پشہ تا نمرود
ببیں بہ صورت و بنگر درونِ ہر شے را

حقیر نکتہ بگویم اگر ز دل شنوی
ہمیں بس است کہ بسپار خویشتن وے را

از دلِ دریا حباب سر بکشید و برفت
بر سرِ شاخِ چمن غنچہ دمید و برفت

کافر و دیندار را ختم نشد قیل و قال
پیک اجل در رسید آہ کشید و برفت

بیخ یکے نخل را آب دہد باغباں | از سر نخلِ دگر شاخ برُید و برفت
صورتِ لیلےٰ ندید عشق بر محمل گزید | انچہ بود دیدنی ہیچ ندید و برفت
نقدِ دل و جاں بداد سود و زیاں را ندید | بر سر بازار غم جنس خرید و برفت

آہ دمے خندہ کرد گل بگلستاں حقیر
بادِ خزاں در رسید جامہ درید و برفت

بہ دلق و صوف مقلد ز اہلِ عرفاں نیست | خروس تاج چو بر سر نہد سلیماں نیست
فروغِ کرمک شب تاب تا دمے ماند | کہ بر فرازِ فلک آفتاب تاباں نیست

حقیر مذہب و ملت ز اختلافِ دل است
کسے کہ محو غمش نیست اہلِ ایماں نیست

اے جز تو در رہِ تو کسے سنگِ راہ نیست | گر کفر و دیں نماندِ دگر جز آلہ نیست
ایمان و کفر و شرک و دوئی عشوۂ دلست | گر دل نماند ہیچ سپید و سیاہ نیست

تا کے حقیر در رہ چون و چرا روی
در خویشتن بیا کہ جز ایں شاہراہ نیست

کیف از بادۂ گلرنگ ہماں بردارد | کہ بکف جام و در آغوش گل اندامے ہست
نور از نور درون ست نہ از رنگِ بروں | مردمک را بنگر گرچہ سیہ فامے ہست

گردشِ چرخ بیک رنگ نماندست حقیر
گاہ روزست گہے صبح گہے شامے ہست

خیر و شر اندر جہاں ز اقرار و انکارِ دلست | اے خوشا کانرا نظر بر طرز و رفتارِ دلست

نشہ از صہبا و بو از مشک چیدن مشکل است | جاں ز عشقم عشق از جانم کشیدن مشکل است
در ہوا ساکن نباشد شعلۂ شمع و چراغ | نفس تا پرواز دارد آرمیدن مشکل است
گرد خود چوں شعلۂ جوالہ گردان سہل شد | چوں شرر از سنگ خود بیروں جہیدن مشکل است

بحر باز بخیر موج اندر محیط آمد حقیر
در تعلق ماندن و از خود رمیدن مشکل است

سحر چو نالۂ مرغِ چمن بگوشش آمد | دگر دلم بہ ہوائے تو در خروشش آمد

چو گل بہ ضبطِ فغاں کوش بلبلِ نالاں | ہزار زخم جگر دارد و خموش آمد
بیا بنوش مئے لالہ گوں بہ صحنِ چمن | کہ ہر گل از مئے رنگیں سبو بدوش آمد
زخم نمود و بیفزود اضطرابِ دلم | محیطِ از مہِ کامل دگر بجوش آمد
نشاں دہد ز رخ آفتاب ہر ذرہ | کہ در مجاز مئے معنوی بجوش آمد
بیا بحسنِ عمل کوش و عذرِ طاعت کن | اگرچہ خواجہ خطا بخش و جرم پوش آمد

ز عقل و وسوسۂ او حقیر شد بیزار
ز مدرسہ بہ درِ پیرِ مے فروش آمد

دلِ آسودہ ندارد خبر دلِ شدگاں | دردِ فرہاد کجا در دلِ خسرو گیرد

بہارِ سبزۂ نو گرچہ بر عذار آمد | ولے بہار بدوشِ خزاں سوار آمد

ز دل بیدار شو تا لعبتانِ غیب را بینی | بہ بیداری چو می بینی ہمہ خوابِ گراں باشد

کفرست شکایت جفائش | شد ملتِ عاشقاں رضائش
پروانہ بسوخت و شمع بگداخت | لے والے ز عشق و ماجرائش
فریاد و خروشِ بلبل از چیست | گل گوش شدہ است بر نوائش
دل را سر شکوۂ عدو نیست | شد دشمنِ جاں خود آشنائش
صبر و خرد و قرار دل سوخت | فریاد ز شعلۂ حنائش

یک گوشۂ دل صدف فکرِ باطل | محمل گراں شد دور ست منزل
انہار کوثر حوران و غلماں | بگذار بہر پیرانِ جاہل
صوفی ز صورت معنی تواں یافت | گنجے ست مخفی مدفونہ در گل
ناموسِ تقوی برباد دادن | بیعت بدست پیرانِ جاہل
از عقل بگذر در عشق رو کن | تا پاک گردی از فکرِ باطل
بر نقشِ صورت مجنوں چہ باشی | لیلے است مستور پنہاں بہ محمل

خاک شو اے جز وِ خاک آتش سوزاں مشو | سر بہ زمیں نہ چو آب بادِ پریشاں مشو
حشمتِ دنیا مخواہ سرکشی از سر بنہ | سبزۂ پامال باش سروِ گلستاں مشو
صامت و ناطق زمال گر نبود ملکِ تو | صبر و قناعت گزیں شاکیِ دوراں مشو
از ہمہ بیزار شو و از ہمہ تنہا نشیں | جملہ بحق وا گزار طالبِ ساماں مشو

آنچہ بجوئی بہ دلِ خویش جو | اے دل تو جوئے ز دریائے ہو
آہوئے دیوانہ بہ بومست شد | وحشتِ دل میکشدش چارسو
چوں بخود آید زرہِ راستی | نافۂ مشکست بہ پہلوے او
جان و دلم مسکنِ محبوبِ ما | وائے ز آوارگیٔ کو بہ کو
رخ بنما عشوہ مکن از حقیر | نیست تمنا نہ دگر آرزو

اندر کجاست آنچہ تو دیدی در آئینہ | تہمت زعکسِ خویش نہادی بر آئینہ
پاک ست ذات بحت ز صوری و معنوی | گر صورتے بود بنماید ہر آئینہ
لے آب آئینہ ہمہ آب رواں شود | از عشوہ گر نظر فگند اندر آئینہ
ننمود نقش غیر بجز نقشِ خویشتن | ہر چند غور کردم و دیدم در آئینہ
ہرگز نمیرد آنکہ نشانے نکو گزاشت | یاد آورد ہنوز ز اسکندر آئینہ

زجہل بست نظر گر بہ بیش و کم داری | بحکم آنکہ چو داری خدا چہ غم داری
عروس و بانوے سلطان باش و رنہ چہ شد | کنیز وار اگر دخل در حرم داری
فقیر و شاہ برابر بود بکنج لحد | چہ فخر و ناز بگنجینہ و حشم داری

قصیدہ

تابِ حسنت از نقاب آتش بجاں انداختہ | صبر را در زینہار والاماں انداختہ
عالمے بنہفتۂ در ما و طینے لبس فراخ | لامکانے راز حکمت در مکاں انداختہ
تا چہ بے پایاں بود بحرِ کمالِ شانِ تو | قطرۂ زاں بحر در کون و مکاں انداختہ
کس ز سباحی نہ بیند روئے ساحل ہیچگاہ | او محیط از دست موجش بر کراں انداختہ

مرحبا کلکِ مصور کو ز رنگِ یک صدف
طرحِ رنگِ مختلف در بوستاں انداختہ

یاسمین و یاسمن را چادرِ سادہ سپید
معجرِ رنگیں بدوشِ ارغواں انداختہ

بر سرے سودائے دیگر ہر لبے شورِ دگر
در دلِ ہر ذرہ اسرارِ نہاں انداختہ

خوشا دلیکہ بود محو در تصورِ یار
خبر ز خویش ندارد نہ یاد از اغیار

ز مہر و کینہ و از خیر و شر برآساید
نہ با کسے بہ مدارا نہ با کسے پیکار

ز نورِ دل چو قمر گردِ خویش ہالہ کشید
نشستہ بے حرکت ہمچو نقطۂ پرکار

ز چار و پنج حسن و طبع یافت آزادی
ز باد و نفس نہ جنبد چو دامنِ کہسار

ز نیک و بد ز سیاہ و سپید بے خبر است
نہ نورِ روز شناسد نہ ظلمتِ شبِ تار

ز حرف و صوت برون نغمۂ برانگیزد
چہ نغمۂ کہ بوجد آورد در و دیوار

نہد کلاہ ز غفلت بفرقِ ہشیاری
بروے خلق بخواب و بحق دلش بیدار

ز تحت و فوق و نشیب و فراز مستغنی
ز راس و چپ نہ شناسد نہ از یمین و یسار

ز صلحِ کل برہِ کفر و دیں زند گامے
دو منزل است ز دیر و حرم درِ دلدار

مطلع ثانی

صبا رساند بگوشِ دلم نوید بہار
کشاد مرغِ گلستاں بہ تہنیت منقار

خوش است سبزۂ بستاں ز قطرۂ شبنم
چو سبزہ زارِ فلک از ثوابت و سیار

نسیم مروحہ جنباں صبا عبیر افشاں
فضائے عرصۂ گیتی چو تختۂ گلزار

ز بسکہ سبزۂ بستاں طراوت انگیز است
ز نورِ چشم شفا یافت نرگسِ بیمار

فلک ز پیرہنِ نیلگوں خجل می شد
شفق بدوشِ وے افگند چادرِ گلنار

ز شبنم از پئے تزئینِ عروسِ گلشن را
رساند نامیہ صد دانۂ درِ شہوار

زریکہ نامیہ در جیبِ دامنِ گل ریخت
گل از وفورِ طرب کرد بر بہار نثار

....

رائے بہادر بابو انند سروپ صاحب مرحوم

(از منشی جوالا پرشاد صاحب بی۔اے، ایل ایل بی۔ کانپور)

رائے بہادر بابو انند سروپ کی وفات سے جو ۱۸۔ نومبر ۳۱ء کو واقع ہوئی نہ صرف کانپور بلکہ ہمارے صوبہ متحدہ کی پبلک لائف کو بڑا نقصان پہونچا ہے۔ افسوس جو جگہ اُن کے انتقال پُر ملال سے خالی ہو گئی ہے اُس کا پُر ہونا دشوار ہی نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی محنت، قابلیت اور خداداد ذہانت کی بدولت نہ صرف پیشہ وکالت میں نمایاں شہرت حاصل کی بلکہ رفاہ عام کے مختلف شعبوں میں اس قدر سرگرمی اور دلچسپی کا اظہار کیا جس سے صوبہ متحدہ میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔

بابو انند سروپ صاحب علیگڈھ میں ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے تھے، لیکن بچپن ہی میں وہ مع اپنے والد منشی ہنومان پرشاد صاحب اپنے ماموں منشی شیام لال صاحب وکیل کانپور کے یہاں چلے آئے۔ اور کانپور ہی میں اُنھوں نے تربیت اور تعلیم پائی۔ فارسی کی تعلیم اُنھوں نے اپنے والد سے حاصل کی جو اس زبان کے اچھے عالم تھے۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ کانپور گورنمنٹ اسکول میں داخل ہو گئے جہاں اُنھوں نے دوسری زبان کی حیثیت سے سنسکرت بھی پڑھی۔ ابتدا ہی سے وہ اس قدر ذکی اور جفاکش واقع ہوئے تھے کہ درجہ بھر میں ہمیشہ اول رہتے تھے۔ سنسکرت کے امتحان میں بھی اپنے تمام ہم جماعتوں میں سے زیادہ نمبر حاصل کرتے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں اُنھوں نے انٹرینس کا امتحان کلکتہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔ یونیورسٹی کے تمام کامیاب طلبا میں اُن کا نمبر تیسرا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الہ آباد یونیورسٹی قائم بھی نہیں ہوئی تھی اور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے طلبا کو بھی کلکتہ یونیورسٹی کا امتحان دینا پڑتا تھا۔ اس کے دوسرے ہی سال اُنھوں نے ججی کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور تمام کامیاب طلبا میں اُن کا نمبر اول رہا۔

وکالت | بابو انند سروپ نے ۱۸۸۶ء سے وکالت شروع کی، اُس وقت کانپور بار میں بڑے بڑے قابل وکلاء موجود تھے جن میں سے منشی شیام لال، پنڈت پرتھی ناتھ، منشی گور سہائے، بابو نیل مادھب، لالہ درگاہی لال، مولوی عبد الجلیل، مسٹر گرینوے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وکالت شروع کرنے کے بعد بھی آپ نے اپنی سخت محنت جاری رکھی اور قانونی نظائر پڑھنے میں اپنے وقت کا بڑا حصہ صرف کرنے لگے اور اپنی خداداد

ذہانت کی بدولت اصول قانون و نظائر پر آپ کو بہت جلد وہ عبور حاصل ہوگیا جس کو دیکھ کر لوگ عش عش کرتے تھے۔ ۱۸۹۳ء میں بابو ہر نام سنگھ اڈیٹر کانپور گزٹ پر ایک سب انسپکٹر پولیس نے فوجداری مقدمہ چلایا تھا اُس میں آپ نے صفائی کی طرف سے بلا کسی فیس کے اس قابلیت سے پیروی کی کہ جس سے آپ کی بہت شہرت ہوگئی۔ اِسی دوران میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے عوام میں بھی آپ کی قانونی قابلیت کا اعتراف ہونے لگا۔ پنڈت پرتھی ناتھ صاحب وکیل سے اور سید اکبر حسین صاحب (مشہور شاعر اکبر) سب جج سے مسماۃ نولا کنور کے مقدمہ کے دوران میں کچھ تیز اتیزی سے گفتگو ہوگئی اور سب جج موصوف نے پنڈت صاحب کے خلاف اپنی تجویز میں کچھ ریمارک لکھ دیے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ پنڈت صاحب نے مقدمہ مذکور کے سلسلہ میں کچھ بدعنوانیاں کی ہیں۔ اِس مقدمہ میں بابو انند سروپ نے پنڈت پرتھی ناتھ کو بڑی قیمتی امداد دی۔ اور بالآخر مسٹر میکلین ڈسٹرکٹ جج کانپور کی عدالت میں اس کا اپیل ہوا جس میں پنڈت پرتھی ناتھ صاحب کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ مسٹر میکلین نے نہ صرف سید اکبر حسین کے فیصلہ ہی کو منسوخ کر دیا بلکہ اُن تمام الزامات کو بیجا قرار دیا جو سب جج موصوف نے پنڈت پرتھی ناتھ کی وکالت کے سلسلے میں اُن پر کئے تھے۔ اس فیصلہ کے بعد ہی پنڈت پرتھی ناتھ اکثر دیوانی کے پیچیدہ مقدمات میں بابو انند سروپ کو شریک کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ　　بابو انند سروپ صاحب دیوانی کے سب سے مشہور وکیل متصور ہونے لگے۔ آپ کو قدرت کی طرف سے ذہن رسا کے علاوہ حیرت انگیز حافظہ بھی عطا ہوا تھا جس کی بدولت آپ کو پیشۂ وکالت میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ منشی شیام لال آپ کے ماموں کی ذہانت کا یہ حال تھا کہ باوجود اس کے کہ وہ انگریزی داں نہ تھے لیکن ہائی کورٹ کے جملہ نظائر اُن کے نوک زبان رہتے تھے۔ اور جب کسی عزیز یا دوست کو کسی نظیر کے دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ فوراً فریقین کا نام اور کتاب کا حوالہ بقید صفحہ زبانی بتلا دیا کرتے تھے، خواہ وہ اُس وقت کسی دوسرے کام میں بہت زیادہ مصروف بھی کیوں نہ ہوں۔ بابو انند سروپ بھی بلا کے ذہین تھے اور پنڈت پرتھی ناتھ صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ منشی شیام لال کی ساری ذہانت بابو انند سروپ نے لے لی ہے۔ بابو انند سروپ کو بھی سارے نظائر ازبر تھے اور جب کبھی کسی وکیل کو کسی نظیر کے دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی تو بابو انند سروپ صاحب نہایت خوشی سے نہ صرف نظیر ہی مع حوالہ بتلا دیتے تھے بلکہ یہ بھی بتا دیتے تھے کہ اس کے خلاف کون کون سی نظیریں ہیں اور صحیح رائے اس مسئلہ کے متعلق کیا ہے۔ اُن کا دماغ ایسا سلجھا ہوا واقع ہوا تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مقدمات کو وہ بہت جلد سمجھ لیتے تھے۔ اُن کا دستور تھا کہ کسی مقدمہ کے کرنے سے پیشتر وہ اس کے متعلق سارا قانون و نظائر دیکھ لیتے تھے اور جو اعتراضات فریق ثانی کی طرف سے ہو سکتے ہیں اُن

سب کا جواب تیار کر لیتے تھے۔ اس میں اُن کو بہت محنت کرنا پڑتی تھی لیکن محنت سے وہ کبھی نہیں گھبرائے
روزانہ بارہ بجے رات تک کام کرنا اُن کا معمولی مشغلہ ہو گیا تھا۔ ذہانت کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت میں
جدت طرازی کا مادّہ بھی تھا، یعنی قانون و نظائر کی تعبیر کرنے میں وہ غیر معمولی ذکاوت دکھاتے تھے اور ایسی
ایسی باریکیاں نکالتے تھے جو اور لوگوں کے ذہن میں مشکل سے آ سکتی تھیں۔ غور و فکر اور جدت طرازی کی
قوت منشی گور سہائے اور منشی شیام لال میں بھی زیادہ تھی۔ کانپور کے ایک مشہور قانون داں بنگالی سب جج
مسٹر بپن بہاری مکرجی اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر منشی شیام[1] لال و لالہ گور سہائے انگریزی داں ہوتے تو ہائی کورٹ
میں بھی ان کا جواب نہ ہوتا۔ آجکل کے وکلا میں جدت کی صفت بہت کم پائی جاتی ہے، اور ان کا زیادہ تر
دار و مدار کتابوں اور قانون کی شرح ہی پر رہتا ہے۔ بابو انند سروپ میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود تھا، انھیں
ہمشکل نظائر کے نازک فرق نکالنے میں بڑا ملکہ تھا۔ اپنے پیشہ میں وہ ہمیشہ دیانت کا اعلیٰ ترین معیار اپنے پیش نظر
رکھتے تھے۔ چنانچہ قابلیت اور ذہانت کے علاوہ ایمانداری، متانت اور سنجیدگی کے لحاظ سے بھی اُن کا درجہ
بڑا اونچا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی جونیر وکیل کے مقابلہ میں بھی کوئی بیجا فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی اور
نہ وہ فریق ثانی کی بحث یا شہادت کے دوران میں خواہ مخواہ دخل دینے یا ٹوکنے کے عادی تھے۔ وہ طبعاً کم سخن
واقع ہوئے تھے۔ شاید یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ وہ فضول گو نہ تھے۔ اُن کی تقریریں ہمیشہ مختصر مگر جامع اور
قانون و واقعات سے پُر ہوا کرتی تھیں جس کی وجہ سے حکام اُن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کی بحث بڑی
وقعت کی نگاہ سے سُنا کرتے تھے۔ جونیر وکلا کو امداد و اعانت کے لئے وہ ہر وقت مستعد رہتے تھے بلکہ اکثر
خلاف عادت اپنے معمولی کاموں کو بھی چھوڑ کر وہ ان کی طرف رجوع ہو جاتے تھے۔

تقریر کے علاوہ بابو انند سروپ صاحب تحریر کے بھی بڑے دھنی تھے بلکہ اس پہلو میں شاید تمام صوبۂ
متحدہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ عرضی دعویٰ جواب دعویٰ دستاویزوں کے مسودے وہ ایسی قابلیت
سے لکھتے تھے کہ پنڈت سندر لال و پنڈت موتی لال جیسے وکلا بھی ان کی تحریروں میں ایک شوشے کے ردّ
و بدل کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ انھیں باتوں سے اُن کو اپنے پیشہ میں بہت فروغ حاصل ہوا
چنانچہ عرصہ تک وہ کانپور بار ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ رہے اور جب اُنھوں نے اس پیشہ کو خیرباد کہا
تب بھی وہ اس معزز عہدہ پر سرفراز تھے۔

چیرمین امپروومنٹ ٹرسٹ تیس برس سے کچھ زائد عرصہ تک وکالت کرنے کے بعد بابو انند سروپ نے امپروومنٹ
ٹرسٹ کانپور کی چیرمینی کا عہدہ قبول کر لیا۔ اس سے پہلے اس عہدہ پر سابق کلکٹر کانپور مسٹر اسٹالف آئی سی ایس

[1] منشی شیام لال صاحب راقم مضمون کے والد ماجد اور منشی گور سہائے صاحب ایڈیٹر زمانہ کے جدِ بزرگوار تھے۔ (ا۔ ز)

فایز تھے اور اُن کے وقت میں ٹرسٹ کے کاموں پر بہت زیادہ روپیہ صرف ہو چکا تھا اس کے معمولی مصارف بھی بہت بڑھے ہوئے تھے۔ یہ کام بابو صاحب کے لئے بالکل نیا تھا لیکن بابو صاحب نے اس کام کو بھی بڑی محنت سے انجام دیا، انھوں نے کوشش بلیغ سے اس کے روزمرہ مصارف کم کئے اور ٹرسٹ کے کام کو عمدگی سے چلایا۔ مگر اس سلسلے میں جو دماغی محنت کرنا پڑی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی صحت خراب ہو گئی اور (High Blood Pressure) کا مرض لاحق ہو گیا جس کے باعث آپ کو بالآخر ۱۹۲۶ء میں اس عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا۔

آریہ سماج آریہ سماج کی تحریک سے آپ کو اوایل عمر ہی سے دلچسپی تھی۔ ان کے ماموں منشی شیام لال نے سوامی دیانند کا وہ مشہور مباحثہ دیکھا تھا جو سوامی جی موصوف اور پنڈت ہلدر اوجھا کے درمیان ۱۸۶۹ء میں منشی درگاہی لال صاحب وکیل کے تعمیر کردہ بھیروں گھاٹ میں ہوا تھا، چنانچہ وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی سوامی جی کے اوصاف بھی بیان کیا کرتے تھے۔ بابو آنند سروپ کو شروع ہی سے مذہبی واقفیت کا شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے بچپن ہی میں سوامی دیانند کی مشہور تصنیف ستیارتھ پرکاش پڑھی تھی اور ۱۸۸۳ء میں وہ کرنل آسکٹ بانی تھیاسوفیکل سوسائٹی کے اُس لیکچر کو بھی سننے گئے تھے جس میں کرنل صاحب نے سوامی دیانند کی وفات کی خبر اہل کانپور کو سُنائی تھی اور یہ کہا تھا کہ سوامی جی کی وفات سے ہندوستان میں سنسکرت کی وِدّیا کا آفتاب غروب ہو گیا۔ راقم کو اپنے بچپن کی باتوں میں سے ابتک یہ بات یاد ہے کہ بابو آنند سروپ نے اُس لیکچر سے لوٹ کر سوامی جی کی وفات کا ذکر ہم لوگوں سے کیا تھا، بابو صاحب ہر روز شام کو ستیارتھ پرکاش یا پنڈت لیکھرام کی کتابیں گھر کے عزیزوں اور دوستوں کو سنایا کرتے تھے، اس طرح اُن کی ذات سے اکثر مذہبی مضامین کا چرچا رہتا تھا۔ اس وقت کانپور میں آریہ سماج قائم ہو چکا تھا، چنانچہ سماج کے اکثر اصحاب بابو آنند سروپ سے صلاح و مشورہ لینے آیا کرتے تھے۔ راقم کے بڑے بھائی منشی دیبی پرشاد مرحوم کو بھی آریہ سماج کی تحریک سے بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اُن کی اور بابو آنند سروپ کی تحریک سے ۱۸۹۰ء میں فخر قوم لالہ لاجپت رائے صاحب کانپور تشریف لائے اور اُنھوں نے شیخ ولایت علی کی کوٹھی میں پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب ٹھلل ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول کانپور کی صدارت میں آریہ سماج کے متعلق ایک زبردست تقریر کی۔ اُسی موقع پر بابو آنند سروپ صاحب نے بھی ایک موثر لیکچر دیا تھا اور اپنی ایک نظم نالۂ دل بھی سنائی تھی جس کا سامعین پر بہت اثر ہوا تھا۔ اسی موقع پر منشی دیبی پرشاد صاحب وکیل اور ان کے خاندان کے چند دیگر اصحاب نے آریہ سماج کی ممبری کا فارم بھرا تھا۔ منشی دیبی پرشاد بعد کو کئی برس تک آریہ سماج کانپور کے پریذیڈنٹ بھی رہے۔ بابو آنند سروپ صاحب اگرچہ اُس وقت تک

سماج کے باقاعدہ ممبر نہیں بنے تھے لیکن سماج کے متعلق ہر کام میں وہ شریک رہتے تھے اور جب کبھی کسی بحث مباحثہ یا جوابی تحریر و تقریر کی ضرورت ہوتی تھی تو ممبران سماج کی نگاہ انھیں پر پڑتی تھی۔ اُن کی سنسکرت کی لیاقت اور مذہبی واقفیت سے سماج کو بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ بعض مذہبی مباحث پر اُنھوں نے متعدد ٹریکٹ لکھکر آریہ سماجک سدھانتوں کے پرچار میں بڑی امداد دی۔ سناتن دھرم مہامنڈل کے مشہور اُپدیشک پنڈت گوری شنکر اور پنڈت دین دیال شرما کے لیکچروں کے جواب میں اُن کی کتب "سرمۂ چشم" "دیدۂ بصیرت" "دائرۂ حقیقت" اور "کرشن لیلا" بہت مقبول ہوئیں۔ اس باب میں ان کی سرگرمی کا یہ حال تھا کہ شام کو پنڈت دین دیال وغیرہ سناتن دھرمی پنڈتوں کے لیکچر ہوتے تھے اور دوسرے دن صبح تک آریہ سماج کی طرف سے اُن کی تردید بابو آنند سروپ کی لکھی ہوئی شائع ہو جاتی تھی ایک قابل مقرر کی حیثیت سے بھی اُن کا درجہ بڑا اونچا تھا۔ انگریزی، سنسکرت، فارسی اور اردو میں اُن کو پوری دستگاہ حاصل تھی، اُنھیں کے اثر سے پنڈت پرتھی ناتھ صاحب وکیل اور شہر کے اکثر معززین آریہ سماج کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ کانپور کے عظیم الشان آریہ سماج مندر کی تعمیر میں بھی بابو انند سروپ صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس مندر پر ایک لاکھ روپیہ سے زائد صرف ہو چکا ہے اور نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ سارے ہندوستان میں کوئی دوسرا سماج مندر مشکل ہی سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اس کے متعلق کچھ دوکانات اور مکانات بھی ہیں جن سے سماج کو دوسو روپیہ ماہوار سے زائد مستقل آمدنی کی سبیل ہو گئی ہے۔ غرض تقریباً چونتیس برس تک متواتر بابو انند سروپ نے آریہ سماج کی قابل قدر خدمات انجام دیں ۱۹۰۳ء سے نومبر ۱۹۳۱ء یعنی اپنی وفات کی تاریخ تک وہ اس کے پریسیڈنٹ رہے اور اُن کی رہنمائی میں آریہ سماج کانپور نے ایک نمایاں درجہ حاصل کیا۔ نہ صرف ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہوا، نہ صرف سماج کا عالی شان مندر بنکر تیار ہو گیا اور ایک خیراتی اسپتال اور ریڈنگ روم قائم کیا گیا، نہ صرف انفلوئنزا اور سیلاب وغیرہ مصیبت کے موقعوں پر سماج کے ممبروں نے اصحاب شہر کو امداد پہونچائی بلکہ بابو انند سروپ نے آریہ سماج کے کام کو اس طریق پر انجام دیا کہ جس سے سناتن دھرم مہامنڈل، عیسائی و مسلمان اصحاب کو بھی کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ سماج کے سالانہ جلسوں کے موقع پر جو مذہبی کانفرنس منعقد ہوتی تھی اُس میں ان جماعتوں کے نمایندے بخوشی شریک ہوتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی جب اصول کا سوال آیا یا جوابی تقریر اور بحث و مباحثہ کی ضرورت پڑی تو بابو انند سروپ نے کبھی راضی نامہ نہیں کیا۔

سوامی دیانند کی وفات ۱۸۸۳ء میں ہوئی جس کے بعد پنجاب کی طرح اس صوبہ میں بھی ان کی یادگار قائم کرنے کی تحریک شروع ہوئی چنانچہ ۱۸۸۳ء میں ڈی۔ اے۔ وی کالج سوسائٹی کی رجسٹری کرائی گئی

اور اسی سلسلہ میں میرٹھ میں ایک مڈل اسکول بھی قائم ہوا، لیکن اس تحریک کو اُس وقت تک کوئی قابل قدر درجہ حاصل نہیں ہوا جب تک کہ بابو آنند سروپ اُس کے سکریٹری منتخب نہیں ہوئے۔ ڈی اے۔ وی۔ ہائی اسکول کانپور، ڈی۔ اے۔ وی انٹرمیڈیٹ کالج دہرہ دون اور ڈی۔ اے وی کالج کانپور کے قائم کرنے اور ترقی دینے میں بابو آنند سروپ کا سب سے بڑا حصہ ہے اور جب تک یہ انسٹی ٹیوشن قائم ہیں اُن کا نام امر رہیگا۔ بحیثیت سکریٹری و پریسیڈنٹ ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج سوسائٹی بابو آنند سروپ نے جو نمایاں خدمات انجام دیں اس کے لئے تمام صوبہ اُن کا زیر بار احسان ہے۔ ڈی۔ اے وی۔ ہائی اسکول کانپور آج کانپور کا بہترین اسکول سمجھا جاتا ہے جس میں چھ سو سے زائد طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ ڈی۔ اے۔ وی انٹرمیڈیٹ کالج دہرہ دون نے بھی بہت اچھی ترقی کی ہے اور وہ اس وقت آٹھ سو سے زائد طلبا کو تعلیم دے رہا ہے۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج کانپور کو قائم ہوئے اگرچہ صرف گیارہ بارہ سال ہی ہوئے ہیں لیکن اس قلیل عرصہ میں بھی اس کا شمار صوبہ کے ممتاز کالجوں میں کیا جاتا ہے اور اس میں طلبا چھ سو سے زائد طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ کالج اور بورڈنگ ہوس کی عالی شان عمارتوں اور امتحانات میں کالج کے عمدہ نتیجوں نے اُسے بہت مشہور کر دیا ہے۔ ابھی حال ہی میں کالج کے قابل پرنسپل لالہ دیوان چند صاحب آگرہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے ہیں بہرحال اس کالج کی روز افزوں ترقی بھی سب سے زیادہ رائے بہادر بابو آنند سروپ ہی کی کوشش اور محنت کا ثمرہ ہے۔

پنجاب کی طرح اس صوبہ میں بھی یہ خوف تھا کہ کہیں کالج پارٹی اور گروکل پارٹی میں خانہ جنگی نہ شروع ہو جائے لیکن بابو آنند سروپ صاحب کی دُور اندیشی اور اُن کے ہم خیال اصحاب کی کوشش سے ایسا نہیں ہونے پایا۔ اور صوبہ متحدہ کے آریہ سماجیوں میں اس قسم کی گروہ بندی نہیں ہونے پائی۔ بلکہ گروکل بندرابن اور ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج سوسائٹی کے کارکنوں میں ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے اور اُنھوں نے ایک دوسرے کو امداد دینے سے دریغ نہیں کیا

بابو آنند سروپ نے ۱۹۲۹ء میں آریہ سماج کانپور کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر جو تقریر کی تھی وہ اُن کی زندگی کی آخری تقریر تھی، اُس کے خاتمہ پر انھوں نے فرمایا تھا:۔

"اگرچہ مجھے یہ امید نہیں کہ میں سماج کی آئندہ ترقی کی بہار زیادہ دنوں تک دیکھ سکوں گا کیونکہ میں بمثل اُس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے ہوں جس چراغ کا تیل اور بتی قریب قریب ختم ہو گیا ہو اور وہ اپنے گل ہونے کے لئے کسی باد سحری کے جھونکے کا منتظر ہو۔ میں سمجھ رہا ہوں [illegible] بلائی بُرائی دیکھ

تاہم انگریزی ادب کی ادبی حیثیت سے یہ تقریر بہترین پیرایہ میں ذاتیات پر سخت ترین حملہ کرنے کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اور نہ صرف موقع کی اہمیت کے خیال سے بلکہ زبان کی شوکت اور بلاغت کے لحاظ سے بھی وہ ایک غیر فانی چیز ہے۔

فتوحات ہند کے بعد اگرچہ ہندوستان کی فتوحات سے انگریزی ادب میں کوئی مہتم بالشان اضافہ نہیں ہوا تاہم اس کی بدولت مشرقی مباحث پر لکھنے والوں کی ایک خاصی جماعت ضرور پیدا ہوگئی، مگر ہندوستان کی اندرونی زندگی کا راز سربستہ ہی رہا اور اس کی نسبت کسی نے کچھ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ انگلستان والوں نے ہندوستان سے جو دلچسپی لینی شروع کی تو وہ خاص ہندوستان اور اس کے باشندوں کے دلی جذبات و خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے نہ تھی، بلکہ ان کا مقصد تمامتر (ہندوستانی انگریزوں Anglo Indian سے واقف ہونا تھا۔ اگرچہ اکثر انگریز سیاحوں نے ہندوستان کے حالات اپنی کتابوں میں صحیح اور معتبر درج کئے ہیں، لیکن بعد کے مصنفین کی طرح انھوں نے بھی ہندوستانیوں کے دلی جذبات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی وجہ سے عرصہ دراز سے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان اجنبیت کا پردہ حائل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی خود ہندوستان کے انگریزوں (یعنی اینگلو انڈین طبقے) میں بھی لکھنے والے پیدا ہوگئے۔ اور انھوں نے ہندوستان کی نسبت بہت ٹھوس مواد اکٹھا کر کے عام معلومات میں اضافہ کیا۔ اسی زمانہ میں سر ولیم جونس (Jones) جیسا علوم مشرقیہ کا متبحر عالم و السنہ ائے بنکر ہندوستان آیا[۱] جس نے اس کے رخ روشن سے ناواقفیت اور جہالت کے تاریک پردہ کو اٹھا دیا۔ اور اس کے حسن اصلی کا جلوہ اپنے ہم قوموں کو دکھایا۔ چنانچہ اس کی محققانہ تحریرات اس کی شاہد ہیں، با ایں ہمہ اُن کا شمار کسی طرح انگریزی ادبیات میں نہیں ہو سکتا۔ بہر نوع اس طرح انگلستان والوں کو ہندوستان کے صحیح اور معتبر حالات معلوم ہونے لگے جس سے دونوں ملکوں کے درمیان صحیح مفاہمت کے ذرائع پیدا ہوگئے۔

لارڈ میکالے ہندوستان کے متعلق لکھنے والے انگریز مصنفین میں لارڈ میکالے مستثنیٰ قابلیت کا مسلمہ انشا پرداز ہے جو اپنی پُر زور اور رواں طرز تحریر کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ اور ہندوستان میں قیام کی بنا پر ہندوستانی مباحث پر اس کی تحریریں مستند سمجھی جانے لگیں۔ کلائو اور ہیسٹنگز پر اس کے

---

[۱] سر ولیم ۱۷۸۳ء میں فورٹ ولیم کی عدالت عالیہ کا جج بنکر ہندوستان آیا، یورپی السنہ کے علاوہ فارسی اور سنسکرت زبانوں پر کافی عبور رکھتا تھا۔ ۱۷۸۴ء میں اس نے کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جو اب تک قائم ہے۔ اس علمی انجمن کے رسالہ (جرنل) میں ہندوستان کی ادبی، تاریخی اور اثری تحقیقات پر بہت بلند پایہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مضامین[1] آج بھی "کلاسیکل" شمار کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ مابعد کی تحقیقات نے ان کی تاریخی اہمیت کو بہت کچھ گھٹا دیا ہے۔ تعجب ہے کہ ہندوستان سے اس قدر دلچسپی رکھنے کے باوجود میکالے ایک جگہ ہندوستانی ادب کی تحقیر کرتا ہے جس سے اس کو برائے نام بھی آگاہی نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک یونانی شاعر Horace (ہوریس) کی ایک نظم تمام مہابھارت سے کہیں بڑھ چڑھکر ہے، اور انجیل کی کتاب پیدایش رگ وید اور قرآن مجید سے کہیں زیادہ وقعت رکھتی ہے[2]۔

اس میں شک نہیں کہ میکالے نے ہندوستان کے انگریزی تخیل پر جو اثر ڈالا ہے وہ بہت کم لوگ ڈال سکے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے اثرات تمامتر اچھے ہی تھے۔ اسی شاندار طرز تحریر کی بدولت اس کو وہ پایۂ استناد ملا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔ ہندوستان سے اس کی سچی ہمدردی صرف اس موقعہ پر ظاہر ہوئی جبکہ اس نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"انگلستان کے لئے وہ دن نہایت قابل فخر ہوگا جب وہ اعتماد اور رضامندی کے ساتھ ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ سپرد کر دیگا[3]۔"

کمپنی کے عہد تک ہندوستان کا حصہ انگریزی ادبیات میں صرف یہی تھا کہ چند سفرنامے، بعض تاریخی مضامین، نثر و نظم میں بعض حوالہ جات و اشارات پائے جاتے ہیں۔ برک اور میکالے کے بعد اسکاٹ اور تھیکرے کے ناولوں میں اور ٹینی سن کی نظموں میں ہندوستان کا صحیح تخیل پایا جاتا ہے جو براہ راست حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان میں جو کچھ لکھا گیا وہ بھی اس موضوع پر بہت صحیح اور ضخیم تھا۔ مستشرقین کی تحقیقات نے انگریزی شعرا کو صحیح ہندوستانی تخیل بہم پہونچایا تھا۔ چنانچہ رابرٹ ساؤتھے (Southey) نے سر ولیم جانس کی تصانیف کو پڑھکر[4] The Curse of Kehama (کہامہ کی بددعا) کے نام سے ایک نظم لکھی جس میں افسانہ کے پیرایہ میں ہندو اساطیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح Byron (بائرن) نے اپنی نظموں Giaour (گیااور) اور Bride of Abydos[5] (عروس عبیدوس) میں، اور Shelley (شیلی) نے[6] Alastor (الاسٹر) میں ہندوستانی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نیز اپنی ایک مختصر نظم To an Indian air ("نسیم ہند") میں اس نے خاموش اور ساکن چشمہ کو

---

۱ ملاحظہ کیجئے Historical Essays by Macaulay ۲ قدیم روم کے گیت (لیز آف انشنٹ روم)
۳ تقاریر میکالے۔ ۴ و ۵ یہ دونوں ترکی قصے ہیں جن میں مشرقی خصوصاً اسلامی خیالات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ دو ایک جگہ ہندوستان کی نسبت بعض اشارے پائے جاتے ہیں۔ دیکھو کلیات بائرن (چنڈوس کلاسکس) صفحات ۱۷۷ تا ۱۸۷۔ اور صفحات ۱۰۷ تا ۱۹۹۔ ۶ یہ نظم بھی مشرقی تخیل کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں دریائے سندھ اور وادیٔ کشمیر کا ذکر ہے۔
(کلیات شیلی ص ۴۲ ۵ (چنڈوس)

ہواؤں کا چھیڑنا، چمپا کی خوشبوئیں مہکنا، بلبل کے زار و نالے وغیرہ کا نقشہ کھینچا ہے۔[۵۱] آئرلینڈ کے مشہور شاعر طامس مور نے "لالہ رخ" نام کی ایک طویل نظم لکھی ہے[۵۲] جس کا پلاٹ پنجاب اور کشمیر کی سرسبز و شاداب سرزمین ہے۔ اس منظوم فسانہ کی ترکیب میں بہ نسبت ہندوستانی کے مشرقی عناصر زیادہ ہیں، اور اگرچہ مور کے زمانہ کے سیاحوں کے روزنامچوں اور مؤرخین کی تصانیف میں ہندوستانی تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق کافی ذخیرہ موجود تھا۔ تاہم اس نے ان سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ اس کے بیانات میں بجائے اصلیت کے زیادہ تر افسانویت کا رنگ بھر گیا ہے اور غیر ہندی عناصر اس میں شامل ہو گئے ہیں، اور اگرچہ ادبی لحاظ سے یہ ایک شاہکار کہی جا سکتی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مشرقی تخیل نے اس کی وقعت کو مغربی نقادوں کی نظروں میں گرا دیا ہے۔ چنانچہ اس کی نسبت یہ قول مشہور ہے کہ "اس کو نہ پڑھنے سے کوئی زیادہ تہی مایہ نہیں ہو جاتا"۔ اسی طرح "کہامہ کی بد دعا" بھی ایک روکھی پھیکی نظم خیال کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ والٹر اسکاٹ جیسے کامیاب افسانہ نویس کا ناول Surgeon's daughter (جراح کی لڑکی) جو ایک اینگلو انڈین افسانہ ہے، اس کی دیگر شاہکار تصانیف کے مقابلہ میں بہت پست سمجھا جاتا ہے۔

مسیحی مبلّغین کی ادبی کوششیں

عیسائی مشنریوں نے جو مذہبی اور مناظرانہ لٹریچر پیدا کر دیا ہے اس کو انگریزی ادبیات میں جگہ نہیں دی جا سکتی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انھوں نے لسانی تحقیقات کے ذریعہ سے ہندوستانی معاملات کو جاننے اور سمجھنے کا راستہ نکالا۔ اور گو مسیحی مبلّغین کی ان ادبی کوششوں کا نتیجہ کچھ زیادہ قابل تحسین نہیں نکلا، تاہم ہندوستانی خیالات پر مسیحی اثرات کے پیدا کرنے میں ان کی کوششیں رائگاں نہیں گئیں، ان کی سب سے قابل قدر کوشش انگریزی زبان کی اشاعت و ترویج تھی اور اس لحاظ سے اُنھیں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔

مورّخین

ان سے بھی زیادہ انگریزی ادبیات میں اضافہ کرنے کا باعث وہ مؤرخین ہوئے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے۔ اور اگرچہ ان کی تصانیف انگریزی کے نامور مورخین کے ہم پلہ نہیں سمجھی جاتی ہیں تاہم وہ مستند تصانیف تسلیم کر لی گئی ہیں۔ ان مورخین میں مِل، ہنٹر، ایلیٹ اور الفنسٹن نے ہندوستان کی تاریخ کے متعلق مفصل اور ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ کننگھم نے سکھوں کی تاریخ اور ٹاڈ نے راجستان

---

[۵۱] کلیات شیلی صفحہ ۱۵ء (چنڈوس کلاسکس)

[۵۲] اس نظم کا پہلے اردو میں نادر کاکوروی نے ترجمہ کیا جو ان کے مجموعہ منظومات جذبات نادر حصہ دوم کے ساتھ چھپکر شائع ہو چکا ہے دوسرا ترجمہ نثر میں لطیف احمد صاحب اکبرآبادی نے کیا ہے جو پہلے نگار میں باقساط اور پھر مستقل کتابی طور پر شائع ہوا ہے۔

کے حالات لکھے ہیں۔ مالیسن، ایڈورڈیز کے سوا کئی اور مورخین کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا جاسکتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شعرا کے خیالی افسانوں اور سیاحوں کے سفرناموں کی جگہ علمی تحقیقات اور تاریخی تفتیش نے لے لی تھی۔

فنون ہندوستانی فنون لطیفہ کی طرف بھی توجہ کی گئی، ہندوؤں کی شاعری اور فن ڈراما پر انگریزی زبان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ چنانچہ سر ولیم جونس کی تصانیف اور ایشیاٹک ریسرچز کی جلدیں اس کی شاہد ہیں۔ اس سلسلے میں ہندو ڈراما پر وِلسن کی زبردست تصنیف خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اور غالباً اسی کتاب کے مطالعہ نے زمانۂ حال کے سنسکرت کے سب سے بڑے ماہر فرانسیسی مستشرق سلوین لیوی کو ہندوستانی آرٹ کے متعلق طولانی تحقیقات پر آمادہ کیا۔ مشہور انگریزی ادیب اور ماہر فنون لطیفہ جان رسکن بھی ہندوستان کے آرٹ سے ناواقف نہیں تھا۔ مگر اس کی حالت بالکل میکالے کی سی ہے جو استاد ماہر کی حیثیت سے لکھنے کا تو مدعی ہے مگر اس فن سے ذرا بھی واقف نہیں ہے۔

ادب اور افسانہ ہندوستان سے اس قدر واقفیت، میل جول، اور سیاسی و تمدنی تعلقات کے باوجود اہل انگلستان نے اہل ہند کے متعلق جو قصے اور ناول لکھے اُن میں وہ ہندوستانی معاشرت کا کوئی قابل قدر نمونہ پیش نہ کرسکے۔ ان فسانہ نگاروں نے اپنے ناولوں کو زیادہ تر ہندوستانی انگریزوں ہی تک محدود رکھا ہے جن میں کبھی کبھی ایک آدھ ہندوستانی کیرکٹر پیش کردیا جاتا ہے۔ اسکاٹ اور تھیکرے نے اس کو بہت ترقی دی مگر ان کے بعد کے مصنفین نے صحیح ہندوستانی زندگی کا کوئی مرقع پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ رڈیارڈ کپلنگ ابتدا میں اینگلو انڈین قصے لکھتا رہا لیکن اس نے اپنے مشہور ناول Kim (کم) میں حسن زبان و بیان کے علاوہ ہندوستانی زندگی کی صحیح تصویر کھینچی ہے Mrs. Diver (مسز ڈائیور) اور Mrs. Dell (مسز ڈیل) خاصکر اُن افسانہ نگاروں کے طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جو اپنے قصوں میں ایک آدھ ہندوستانی بھی داخل کردیتی ہیں۔ اور مسز فلورا اسٹیل کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے پر ان کی تصویریں اکثر غیر صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ غرض انگریزی افسانوں میں ہندوستان کی نسبت صحیح معلومات نہیں حاصل ہوسکتی ہیں، حالانکہ آئے دن ہندوستان پر تصانیف کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے۔

صنعت صنائع لطیفہ خصوصاً تعمیراتِ ہند پر سرجان مارشل اور مسٹر ہاول اس گروہ کے نمایندے کہے جاسکتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ کا صنعت اور تعمیرات کے ذریعہ مطالعہ کیا ہے۔ ہندوستان کی بعض خاص اقوام کی نسبت لکھنے والوں میں آسام کی ناگا قوم پر مسٹر ہوٹن نے ایک کتاب بطور مونوگراف لکھی ہے جو اس موضوع پر پہلی کتاب کہی جاسکتی ہے

تاریخ و سیاسیات سیاسیات کے دائرہ میں زمانۂ حال کے مصنفین میں سر ویلنٹائن شرول کا نام کافی طور پر گوش آشنا ہوچکا ہے۔ ان کی کتاب "ہندوستان میں سیاسی اضطراب" بہت مشہور ہے۔ اسی طرح قدیم ہندوستان کی تاریخ پر ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ بہت مستند مانے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کتابیں اکبر اور اشوک کے متعلق ہندوستانی حکمرانوں کے سلسلہ میں بہت محققانہ اور مستند مانی جاتی ہیں۔

ان بے شمار ناموں میں سے جنھوں نے ہندوستان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا ہے یہ چند نام خاص طور پر مشہور ہیں، اور اگر اب مصنفین کی مکمل فہرست پیش کی جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائیگی۔ اس لئے اس مختصر سے مضمون میں زیادہ تفصیل کی گنجایش نہیں ہے۔

ہندوستانی مصنفین اس سلسلہ میں خود ہندوستانی مصنفین اور انشاپرداز بھی "واسطة العقد" سمجھے جاسکتے ہیں، خصوصاً پچھلے چند برسوں میں ہندوستانیوں نے اپنے ملک کی نسبت انگریزی ادب میں معتد بہ اضافہ ہے۔

شاعری اور ادب میں بہت کم ہندوستانیوں نے نام پیدا کیا ہے، اس لئے کہ ایک غیر زبان میں شعر اور اچھے شعر کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ تاہم اس فہرست میں طبقۂ رجال میں سر ٹیگور اور طبقۂ نسواں میں مس تورودت اور مسز سروجنی نائیڈو نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ حیدرآباد کے ایک مسلمان بزرگ "نظامت جنگ" بھی انگریزی شعر کہنے پر قدرت رکھتے ہیں، گو اُن کی نظمیں عموماً بہت مختصر ہوا کرتی ہیں۔

ہندوستان کے انگریزی ادیبوں میں ایس۔ ایم۔ متراؔ[۵۱]، بابو رومیش چندر دت[۵۲] (آنجہانی) سردار جوگیندر سنگھ[۵۳] اور اقبال علی شاہ[۵۴] افسانوی ادب میں امتیاز حاصل کرچکے ہیں۔ ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم ابھی تحقیقات کے میدان میں سرگرم خرام ہیں، اور اہم ہندوستانی موضوعات مثلاً ویدوں کی قدامت، آریاؤں کا خروج، ہندوستانی تاریخ کا آغاز، عہد گپتا کی شان و شوکت، اشوک اور سری ہرش کی سلطنتیں، مرہٹوں

---

۵۱ انھوں نے "ہندوپور" نام کا ایک نیم سیاسی ناول لکھا ہے جو انگریزی حلقوں میں بھی بہت مقبول ہوا ہے۔

۵۲ بنگال کا یہ نامور مصنف اپنے تمام معاصرین میں بہت ممتاز تھا، وہ نہ صرف ایک قابل ادیب تھا بلکہ ایک سیاسی، تاریخی، قانونی اور ادبی انشاپرداز بھی تھا۔ اس وقت متعدد تصانیف انکی یادگار ہیں جن میں ایک ناول "کنز آگرہ" ہندوستان کا قدیم تمدن، رامائن اور مہابھارت کے انگریزی تراجم ہیں۔ مس تورودت انہی کی بھتیجی تھیں۔

۵۳ کسی وقت یہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" کے اڈیٹر تھے تین چار ناول ان کے قلم سے نکلے ہیں جو انگلینڈ میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان میں "نسرین" پنڈت رتن ناتھ در کے "جام سرشار" کا چربہ ہے۔ ان کا ایک اور ناول "نورجہاں" کے نام سے بھی شائع ہوچکا ہے

۵۴ انگریزی رسائل میں انکے مختصر قصے چھپتے رہے ہیں، دو ایک کتابیں ان کی تصنیف سے ہیں۔

کا عروج، ہندوستان قرون وسطیٰ میں، عہد مغلیہ کی تاریخی تحقیقات، وغیرہ ہیں۔ جنھوں نے جیسوال اور تلک، بھنڈارکر اور کرشن سوامی آئنگر، جدوناتھ سرکار، اور عبداللہ یوسف علی جیسے مشہور انشاپرداز کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں آنریبل سید امیر علی مرحوم (رکن پریوی کونسل) انگریزی کے ایک نامور انشا پرداز تھے۔ چنانچہ لنڈن یونیورسٹی نے آپ کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی سند دیکر آپ کی ادبی قابلیت کا اعتراف کیا تھا۔ آپ کی تصنیف سے کئی ضخیم کتابیں ہیں جن میں اسپرٹ آف اسلام، ہسٹری آف سارا سین بہت مشہور ہیں۔ قانون پر ان کی کتابیں بہت "مستند" مانی جاتی ہیں۔ سیاسیات اور تعلیم پر لکھنے والوں میں نواب عماد الملک بلگرامی اچھے انگریزی انشا پرداز تھے۔ قرآن مجید کے چند پاروں کا ترجمہ بھی آپ نے انگریزی میں کیا تھا۔ اسلامی موضوعات پر مسٹر صلاح الدین خدا بخش (مرحوم) کی تصانیف اور تراجم بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

دنیائے صحافت میں مولانا محمد علی مرحوم (سابق مدیر کامریڈ) سید حسین (سابق مدیر کرانیکل) مسٹر عبداللہ بریلوی، بابو راماننڈ چٹرجی (اڈیٹر ماڈرن ریویو) مسٹر نٹیسن (اڈیٹر انڈین ریویو) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے پچھلی ربع صدی میں ہندوستانی صحافت کی بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں۔

اسی طرح فلسفہ، اقتصادیات، معاشیات وغیرہ پر ہمارے ہندوستانی علما نے مغربی تعلیم سے استفادہ کرکے لکھنا شروع کردیا ہے۔ لیکن ان چند ناموں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ملک میں دوسرے انگریزی زبان کے اچھے لکھنے والے نہیں ہیں، یہ صرف چند مشہور نام ہیں جو ہم نے پیش کئے ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس معاملہ میں اہل مغرب ہی ہمارے رہنما ہیں وہی مارلو اور ڈرائیڈن کی لغویات سے اُٹھا کر برک اور میکالے کی محدود معلومات سے گزرتے ہوئے ہمیں اس وسیع النظری اور بصیرت کی طرف لے گئے ہیں جس سے ہم ہندوستانی فلسفہ، ہندوستانی ڈراما اور اسلامی تاریخ و تمدن کی عظمت سمجھنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ اب یہ برادران وطن کا کام ہے کہ وہ اہل مغرب کو اپنے صحیح علوم صحیح تاریخ اور صحیح تہذیب و تمدن سے آگاہ کریں اور بتادیں کہ دنیا کے تمام ممالک میں ہندوستان ہر حیثیت سے علوم و فنون سے مالا مال ہے اور اس کے باشندے ہر لحاظ سے دنیا کی تمام بڑی بڑی اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہیں۔

قدیم افغانستان اور اسکے باشندے

(از ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے۔ جرنلسٹ۔ لاہور)

موجودہ افغانستان کا رقبہ کم وبیش ڈھائی لاکھ مربع میل اور آبادی اسی لاکھ کے قریب ہے۔ قریب قریب سارا ملک پہاڑی ہے۔ مگر شمال اور مشرق میں ہندوکش کی عظیم الشان سدّ سکندری حائل ہے اندرون ملک کوہ بابا اور کوہ سفید کابل سے مغرب میں ہرات اور کابل کے مابین واقع ہے۔ کوہستان سلیمان اور کوہ سیاہ بھی ہے۔ ہندوکش چودہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ باقی پہاڑیاں چار ہزار فٹ سے لیکر سات ہزار فٹ تک اونچی ہیں۔ جانب جنوب اور جنوب مغرب میدان ہے جہاں زیادہ تر ریت ہے۔ مغرب میں ایران ہے جس کی سرحد ہرات سے سیدھے خط میں پچاس میل کے قریب آگے ہے۔ پُرانے زمانہ میں ہرات سرحدی شہر تھا۔ شمال میں روسی علاقہ ترکستان کا ہے اور مشرق میں آزاد اور فتنہ پرداز سرحدی قبائل کا ملک ہے پُرانے زمانہ میں ہندوکش افغانستان اور ایشیائے وسط کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ بخارا، سمرقند وغیرہ کا علاقہ کلیتہً علیحدہ تھا۔ مشہور ماہر سر ایچ۔ جے۔ مکنزی رقم طراز ہیں:-

"ہندوکش شمال مغرب کی جانب ملک ہند کی طبعی سرحد ہے۔ اس کی فطری سد سکندری شمال مغرب میں ملک ہند کی شہرپناہ کا کام دیتی ہے۔ اسے انگریز مدبر سائنٹیفک فرانٹیر (Scientific Frontier) کے نام سے پکارتے ہیں جسے حاصل کرنے کے لئے پچھلی صدی میں انگریزوں نے ہرچند کوشش کی مگر ناکام رہے۔ لیکن تاریخ میں ایک مرتبہ ایسا بھی آیا تھا جبکہ ہندوکش فی الحقیقت اور قدرتی سرحد ہند بنا تھا۔ چوتھی صدی قبل از سن عیسوی کے آخری ربع کے دوران میں ہندوکش سلطنت موریہ اور سیلیوکس کی سلطنت کے مابین حدِ فاصل[1] کا کام دیتا تھا"

اگر ہندوکش ہندوستان کی نظری اور بہترین شئے ہے تو اس سے اِدھر کا علاقہ ملک ہند کا جزو اصلی شمار ہونا چاہیئے۔ ماہران جغرافیہ اور تاریخ کی رائے میں سرحدی قبائل اور افغانستان کا علاقہ ہندوستان کا جزوِ لازم ہے۔

پرانے وقتوں میں افغانستان کو اس امر سے خاص اہمیت حاصل تھی کہ مغربی اور وسطی ایشیا اور

[1] ملاحظہ ہو "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" جلد اول [illegible] صفحہ ۱۴۲ [illegible]

ملک ہند میں آنے جانے کا راستہ اسی ملک سے گزرتا تھا۔ کابل ان سڑکوں کا مرجع تھا مشہد سے ہرات اور ہرات سے کابل تک سڑک آتی تھی۔ جہاں سے ایک تو وادیِ کابل سے ملک پنجاب میں اور دوسری وادیِ پنج شیر سے ہو کر ہندوکش کو چیر کر سمرقند، بخارا اور مشرقی ترکستان سے چین کو جایا کرتی تھی۔ سکندر سیستان سے قندھار آیا اور قندھار سے کابل پہونچا۔ پھر وادیِ پنج شیر سے وسطی ایشیا میں پہنچ گیا، بعد ازاں لوٹکر دریائے کابل اور خیبر کے راستہ سے پشاور کے علاقہ میں وارد ہوا تھا۔

بلخ کے ہندو حکمران پرانے زمانہ کا علاقہ باختریہ بہت مشہور ہے، تاریخ سلف میں اس کا بار بار ذکر آتا ہے مگر سکندر کے ہمرکاب یونانی حکما، کی تحریروں کے سبب سے اسے بہت شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس علاقہ کا محلِ وقوع افغانی ترکستان ہے جس کا بڑا شہر بلخ ہے۔ جو کابل کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ کابل اور بلخ کے درمیان تقریباً پونے دوسو میل کا فاصلہ ہے۔ پرانے زمانہ کے باختریہ میں آریہ ہندو آباد تھے۔ اور وہاں پر آریہ ہندوؤں کی حکومت تھی۔ سویڈن کا مشہور محقق کونٹ بجرن جرن لکھتا ہے:۔ "باختری نسخہ جو دبستان کے نام سے مشہور ہے اور جسے کشمیر سے سر ولیم جونز یورپ لائے تھے۔ اس میں حکمرانوں کی جامع فہرست مندرج ہے۔ جو مہابدنی کے خاندان کے راجاؤں کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک میں اس خاندان کا پہلا راجہ حملۂ سکندر سے (۵۶۰۰) سال پہلے گذرا ہے۔" مل نے اپنی مشہور تاریخ ہند[۵۱] میں بھی یہ بیان کیا ہے کہ باختریہ میں آریہ ہندو راج تھا۔ تازہ تاریخی تحقیقات سے دبستان اور مل کے بیانات کی کس حد تک تائید ہوتی ہے یہ کہنا محال ہے۔ ڈاکٹر ایچ۔ ایچ۔ ولسن نامی ماہر سنسکرت نے اب سے سو سال پہلے افغانستان کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کر کے یہ رائے ظاہر کی تھی: "یونانی حملہ سے پہلے افغانستان میں آریہ ہندو آباد تھے جو سیدی قوم کے حملہ سے دب گئے مگر جب اسے زوال لاحق ہوگیا تو آریہ[۵۲] ہندوؤں نے پھر زور پکڑ لیا۔"

ویدک قوموں کی باہمی جنگ آرائی رگ وید سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم کے ہندو آریہ لوگ مشرقی افغانستان سے خوب واقف تھے۔ دریائے کابل (کبھا) اور سوات (سواست و) اور قرم (کرمہ) اور گومل (گومتی) کا ذکر ملتا ہے۔ علاوہ ازیں رگ وید (کے ساتویں منڈل) میں ایک عظیم معرکہ کا بھی حال درج ہے راجہ سداس بھارت قوم کا راجہ تھا۔ اس کے باپ دادا بڑے نامی حکمران نہ تھے دس قوموں اور راجاؤں نے

---

۵۱ "تاریخ ہند" جلد دوم صفحہ ۲۳۸-۲۳۷۔
۵۲ ملاحظہ ہو "افغانستان اَف دی افغانز" صفحہ ۱۹ مصنفہ سردار علی شاہ۔

اس کے خلاف ایک شاندار جتھا بنایا، جس میں شمو، ترلبشہ، درُوہو، گبشتہ، پُورو، انو۔ قرے کرنہ، جادو، متیہ، پکتھ، بھلانہ۔ الینہ، وِشانی۔ شبی۔ آج۔ اور یک شنو قومیں اور ان کے قبائل شامل تھے۔ علاوہ ازیں راجہ تمبر اور راجہ بھید بھی تھا۔ پروفیسر نارائن چند ابندوپادھیا ان قوموں کے دیس کی نسبت حسب ذیل حالات لکھتے ہیں:۔

"ترلبشہ قوم کا رگ وید میں اکثر ذکر آتا ہے اور ان کا جادو، انو۔ پُورو اور دُروہو قوموں سے بہت گہرا ربط ضبط تھا، اور یہ دریائے پُرشنی (راوی) کے کناروں پر آباد تھی۔ زمانہ مابعد میں مشرق کو نقل مکان کر گئی۔ اُڈیا، آنب قوم بھی پُرشنی کے کنارے پر آباد تھی، اور جادو وغیرہ قوموں کے ساتھ جتھے میں شریک تھی۔ آج قوم کے ٹھکانے کا کوئی پتہ نہیں۔ آلینہ قوم کا ذکر پکتھ اور بھلانہ شبی اور وشانی کے ساتھ آتا ہے۔ دُروہو قوم کا حال جادو، ترلبشہ، انو اور پُورو کے ساتھ شامل ہے۔ پکتھ کا بھی رگ وید میں ذکر ہے۔ بھلانہ کا دیس بعض ماہروں نے مشرقی کابلستان قرار دیا ہے۔ متیہ کا ذکر رگ وید میں تھوڑا ملتا ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں اس نے بڑا عروج پکڑا، اس کے ایک تاجدار نے اشومیدھ جگ کیا تھا۔ جادو قوم بہت مشہور ہے۔ رگ وید میں اس کا ذکر بہت پایا جاتا ہے۔ یہ بڑی بہادر اور جفاکش قوم تھی، سُداس کے خلاف جتھا اسی قوم کی کوشش سے مرتب ہوا تھا۔ ترے کرنہ کے کئی قبائل تھے جو جتھے میں شامل تھے۔ اسی طرح شیگرو اور شمو اور شبی قوم کے لوگ بھی سُداس کے مخالفوں میں شریک تھے۔ اٹک کے پار منتہائے مغرب میں کمبوج، گندھاری، الینہ پکتھ، بھلانہ اور وِشانی قومیں رہتی تھیں۔ اٹک کے مشرق میں منجملہ دیگر اقوام کے شبی اور جادو قومیں بھی تھیں جن کا ملک جہلم (وتستا) اور اٹک (سندھو) کے مابین تھا۔ جہلم کے مشرق کے پہاڑی علاقے میں تین اور زبردست قومیں تھیں، اسکنی (چناب) اور پُرشنی (راوی) کے درمیان نیچے کے خطہ میں دُروہو، ترلبشہ اور انو قومیں رہتی تھیں۔ شتدری (ستلج) کے مشرق میں بھارت اور ترت سو قومیں آباد تھیں جو راجہ سداس کی ہم نسل اور نزدیکی رشتہ کے سبب سے معاون تھیں اور ان کے ہمسایہ میں پُورو قوم تھی جو جتھے میں شریک تھی۔"[۱]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ سداس زمانۂ حال کے اضلاع لدھیانہ، انبالہ، سہارنپور وغیرہ کا حکمران تھا، اس کے خلاف غالباً اس کے بڑھتے ہوئے عروج کے سبب سے پندرہ بیس چھوٹی بڑی قوموں اور ان کے راجاؤں نے ایکا کیا جو سرحدی قبائل کے علاوہ افغانستان تک آباد تھیں، متواتر معرکہ آرائیو

---

[۱] ملاحظہ ہو "ڈویلپمنٹ آف ہندو پالیٹی" حصہ اول فصل ۱۔ مطبوعہ ۱۹۲۶ء

میں سداس نے اپنے مخالفوں کو مغلوب کر لیا۔ ڈاکٹر یو۔این۔گھوشال کا بیان ہے کہ النہ قوم کافرستان کے شمال مشرق میں رہتی تھی، بھلانہ اور پکتھ درۂ بولان کے خطہ میں آباد تھی، افغان اپنے کو پکھتن[1] پکارتے ہیں۔

پکتھ قوم کی اصلیت پروفیسر بند و پادھیا کا بیان ہے کہ دریائے اٹک کے بہت آگے منتہائے مغرب میں کمبوج، گندھاری، آلینہ، پکتھ، بھلانہ اور وشانی قومیں آباد تھیں۔ جرمن ماہر سمر کی رائے یہ ہے کہ گندھاری قوم دریائے کابل کے کناروں پر رہتی تھی۔ پکتھ قوم کا رگ وید (۷ منڈل) میں ذکر آتا ہے پروفیسر بند و پادھیا اور گھوشال کا بیان ہے کہ وہ درۂ بولان کے خطہ اور مشرقی کابلستان میں آباد تھی راجہ سداس کے زمانہ کا تعین دشوار ہے۔ کیونکہ رگ وید کے زمانہ کی نسبت سخت اختلاف رائے ہے، مگر ماہروں کی اکثریت کا یہ اندازہ ہے کہ رگ وید کی رچائیں سنہ عیسوی سے دو ہزار اور پندرہ سو سال پہلے بنی تھیں، بہر حال پکتھ عرصہ تک اسی سرزمین میں رہی۔ ہرداطوس یونان کا مشہور سیاح اور مورخ گزرا ہے جو سن عیسوی سے پانچ سو برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ دارا کے حملۂ ہند (انڈیا) کے تذکرے میں وہ پک ٹیکٹکی[2] قوم کا ذکر کرتا ہے۔ مشہور ماہر سنسکرت پروفیسر رالسن "پک تائیک" (Paktyike) کی تشریح یوں کرتے ہیں "اس سے مراد پکھتو[3] یا پشتو یعنی پٹھانوں کا ملک ہے"۔ پھر آپ ہرداطوس کے بیان کا حوالہ دیتے ہیں کہ کشپ پور اور پکھ تو دیس کے لوگ گورے اور شستہ آریہ تھے جیسے باختریہ (بلخ) کے باشندے، ایرانی ان کے بھائی بند تھے"۔ اور جنوبی ہند کے باشندوں کو حبشیوں کے مانند سیاہ فام لکھا ہے۔ ہرداطوس کی پک تائیک قوم رگ وید کی پکتھ کے مشابہ ہے اور یہ آریہ تھی جس کا رنگ گورا تھا اور وہ شائستہ تھی۔ نامی ماہر سر ٹامس ولزلے ہیگ کی رائے ہے کہ سنہ ۵۰۰ ق م (قبل مسیح) سے پہلے افغانستان سلطنت ایران کا ایک صوبہ تھا جس کے حصے آریہ (ہری رود) باختریہ (بلخ) درنگیانہ (سیستان) دریائے ہلمند کی وادی، ارکوشیا (قندھار) خطۂ ہندوکش اور کابل تھے۔ شمال کی طرف ایرانی نسل کے لوگ آباد تھے اور جنوبی اضلاع میں ہندو نسل کے لوگ رہتے تھے، قندھار میں پکتی قوم آباد تھی، اس سے مراد پختن یعنی پشتن[4] ہے۔ افغان اپنے کو اسی نام سے ملقب کرتے اور پکارتے ہیں"۔ مولانا سید سلیمان صاحب عرب سیاح و جغرافیہ نویس ابوالحسن علی مسعودی کے حوالہ سے لکھتے ہیں

---

[1] "انشنٹ انڈین کلچر ان افغانستان" صہ ۵ مطبوعہ سنہ ۱۹۲۸ء

[2] ملاحظہ ہو "پولیٹیکل ہسٹری آف انشنٹ انڈیا" صہ ۱۲۳ مصنفہ پروفیسر رائے چودھری سنہ ۱۹۲۳ء

[3] "انڈیا اینڈ دی ویسٹرن ورلڈ" صہ ۱۶-۱۷-۲۱

[4] "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکہ" جلد ا صہ ۲۰۷ مطبوعہ سنہ ۱۹۲۹ء

"عجیب بات یہ ہے کہ اس نے قندھار کو رہبوط (راجپوتوں[۵۱]) کا ملک بتایا ہے"۔ اور یہ سیاح ۳۰۳ھ میں گزرا ہے اور یہ سنہ ۹۲۵ء کے مطابق ہے۔ مشہور انگریز ماہر میجر جنرل سر جارج گرے اسٹن کی رائے ہے کہ "پٹھان لوگوں کی شریعت رواج عام ہے جو راجپوت دستور سے حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے..... پٹھانوں کے ایک گروہ کے سر کی مساحت (۷۴٫۸) پائی گئی ہے جو ہندوستان کے راجپوتوں[۵۲] کے سوا اور کسی قوم کے سر کی گولائی سے لگا نہیں کھاتی"۔ اس اجمالی بحث سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ رگ وید میں مذکور پکتھ قوم جو درہ بولان اور مشرقی کابلستان میں آباد تھی ہرداطوس کی "پک تائیک" یعنی پکھتو یا پشتن ہے۔ سر ٹامس ولزلے ہیگ اسے پکتی بیان کرتے ہیں جو علاقہ قندھار میں آباد تھی، مسعودی نے وہاں پر رہبوط یعنی راجپوت تسلیم کیا ہے۔ نندو لال ڈے۔ نامی بنگالی ماہر کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ کمبوج افغانستان کا مترادف ہے۔ مارکنڈے پران اور منوسمرتی کی رو سے کمبوج سے مراد افغانستان کا شمالی حصہ ہے۔ ممتاز ماہر ڈاکٹر اسٹائن کی رائے میں کمبوج سے مراد افغانستان کا مشرقی حصہ ہے۔ مہابھارت کے بیان کی رو سے کمبوج دیس گھوڑوں کے لئے بہت مشہور تھا۔ اور فی زمانہ کابل کے گھوڑے اپنی نرالی خوبی کے لئے ضرب المثل ہیں۔ ہندوکش کی سیاہ پوش قوم اسی کمبوج قوم کی اولاد خیال کی جاتی ہے کرنیل ولفرڈ کی تحقیقات کے رو سے کمبوج غزنی کے پہاڑ کے ساتھ شمار اور مذکور ہوتا ہے۔ گندھار دریائے کنار اور دریائے اٹک کے مابین اور دریائے کابل کے دونوں جانب تھا، اضلاعِ پشاور، راولپنڈی علاقہ سوات، یوسف زئی کا علاقہ وادی کا علاقہ پرانے گندھار میں شامل تھا۔ کرنیل راؤلنسن محقق آثار قدیمہ کا بیان ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں خطہ اٹک کے گندھاری لوگ قندھار میں جا کر آباد ہو گئے، اس وجہ سے غالباً ابوالحسن علی مسعودی نویں صدی میں قندھار میں راجپوتوں کی آبادی کا ذکر لکھتا ہے۔ اب افغانستان اور افغان کی اصلیت ملاحظہ ہو:- افغانستان کا پرانا نام کمبوج ہے جس کا ذکر مہابھارت میں آتا ہے، وہاں کے گھوڑے مشہور تھے۔ افغان کا سنسکرت مترادف آو (آپ) گان ہے جس کا ذکر برہت سنگھتا میں آتا ہے۔ اشوکان دوسرا لفظ ہے، اشو سے مراد گھوڑا ہے اور کان یونانی مورخ ایرین اشوکان کو اسک نوئی لکھتا ہے جس سے مراد آشو داتکہ ہے۔ اب کاپشا کا ذکر ملاحظہ ہو جس کا ذکر یونانی اور لاطینی مورخین کرتے ہیں۔ کپشتان اس کا موجودہ محلِ وقوع قرار دیا گیا ہے جو ہندوکش کے ڈھلوان پر ہے، آوپیان سے دس میل جانب مغرب تھا، اس سے مراد دریائے کابل کے شمالی ملک تھا۔ جو ین لکھتا ہے

---

[۵۱] "عرب وہند کے تعلقات" صـ۳۷

[۵۲] "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" جلد ۱۳ صـ۲۸۶

کہ پنج شیر اور تگاؤ کا خطہ کاپشا تھا، جو کوہستان کی شمالی سرحد ہے۔ طالمی کے بیان کی رو سے کاپشا کابل سے ڈھائی درجے شمال کو تھا۔ سر آر۔ جی۔ بھنڈارکر کی تحقیقات کی رو سے افغانستان کے شمال میں کاپشا واقع تھا۔ اور گندھار کا صدر تھا۔ راکپسن کی رائے میں افغانستان ہی پرانے زمانہ کا کاپشا تھا۔ اگر ان مختلف بیانات کو یک جا جمع کیا جائے تو پکتھ اور پشتن کی یکسانیت تسلیم کرنے میں چنداں دقت پیش نہیں آسکتی۔

یونانی مورخوں کے بیانات

اب یونانی مورخوں کے بیانات ملاحظہ ہوں۔ استرابو کا بیان ہے کہ سلطنت ایران کے دلاور بانی قورش (Cyrus) نے جس کا ۵۲۹ ق م میں انتقال ہوا تھا بلوچستان کے راستہ سے ملک ہند پر چڑھائی کی مگر سارا لشکر برباد ہوگیا، دوسری مرتبہ وادی کابل سے لشکر کشی کر کے شاندار کامیابی حاصل کی۔ پلائنی کا بیان ہے کہ قورش نے شہر کاپشا برباد کر دیا۔ ایرین کا بیان ہے کہ "اٹک کے مغربی خطہ میں دریائے کابل تک ہندی اقوام اش واتکہ[51] اور اش ملکہ آباد تھی، یہ پرانے زمانہ میں پہلے آسوریہ اور بعد میں ماریہ والوں کی محکوم رہیں آخر کار قورش کو خراج دینا منظور کر لیا۔ استرابو کا یہ بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایرانیوں نے شدا کہ قوم کے نوجوانوں کو انعام کا لالچ دیکر اپنی لشکروں میں بھرتی کر لیا، یہ شدر کہ وہی قوم ہے جو حملۂ سکندر کے وقت موجودہ ملتان کے شمال میں آباد تھی، اس کی ہمسایہ بہادر قوم مالوا تھی، دونوں نے سکندر کے دانت کھٹے کیے تھے سکندر کے مہلک زخم لگا تھا۔ اش واتکہ قوم کا مہابھارت میں ذکر لکھا ہے، نقش رستم میں جہاں دارا (۴۸۶ ق م میں انتقال ہوا تھا) کا مقبرہ ہے، ایک سنگلاخ کتبہ میں گندھار اور علاقہ آن روئے اٹک جسے ہیرواطوس "انڈیا" پکارتا ہے سلطنت ایران میں شامل تھا، یہ اس کے بیان کی رو سے سب سے دولتمند اور گنجان آباد صوبہ تھا۔ ۲۵۹ من سونا سالانہ خراج میں جایا کرتا تھا، جب دارا کے بیٹے خشی یارشا (Xerxes) نے جس نے ۴۸۶ ق م سے ۴۶۲ ق م تک حکومت کی یونان پر فوج کشی کی تو اس کی سپاہ میں گندھارا اور آن روئے اٹک کی ہندو فوج بھی شامل تھی۔ تاریخ سلف کا دنیا کا سب سے بڑا محقق جرمن ماہر ایڈورڈ مائر (Meyer) اس کی رائے نہایت قیمتی سمجھی جاتی ہے: وہ لکھتا ہے کہ قورش نے سن عیسوی سے ساڑھے پانچ سو برس پہلے ہندوکش کے قبائل زیر کیے، پھر وادی کابل کے ہندو قبائل گاندھاری اور ست گیادی جنھیں اس زمانہ کے ایرانی اپنی زبان میں تھتہ گو پکارتے تھے[52] مغلوب کیے۔ اس بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ چھٹی صدی قبل از مسیح میں وادی کابل اور ہندوکش کے خطہ میں آریہ ہندو اقوام آباد تھیں۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو پولیٹیکل ہسٹری آف انشنٹ انڈیا" صہ ۱۲۲-۱۲۳

۵۲ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد اول صہ ۲۳۳

حملۂ سکندر کے وقت کے حالات

افغانستان اور اس کے مشرق میں گندھارہ، زار (ہزارہ کے لوگ) کا پش (شمالی افغانستان کے لوگ) آن روے اٹک کے علاقہ میں سکندر کے حملۂ ایشیا (پہلے ایران، پھر افغانستان و ترکستان) کے وقت بھی جو سنِ عیسوی سے ۳۲۶-۳۲۹ء کا واقعہ ہے وہاں پر ہندو آباد تھے، اور ان کے اپنے سردار اور فرمانروا تھے، جب وقت سکندر نے کابل سے وسطی ایشیا کی طرف کوچ کیا تو ہندوکش میں ایک چھوٹی حکومت ہندوؤں کی تھی جس کا راجہ ششش گپت تھا۔ اور ہندو فوجی دستے باختریہ والوں کے حسب طلب ان کی معاونت کے لئے باختریہ میں موجود تھے۔ سکندر ششش گپت کو اپنے ہمراہ وسطی ایشیا کو لے گیا اور پھر پنجاب کی لشکرکشی کے وقت بھی اسے اپنے ساتھ ہی لایا۔ اس کا یہ گمان ہوگا کہ اس کے ذریعہ سے ہندوؤں سے معاملہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

اُس وقت پشاور کے شمال کا سارا پہاڑی علاقہ ہندوؤں سے آباد تھا جن کے اپنے چھوٹے بڑے کئی راجے تھے جنھیں زیر کرنے میں سکندر کو کئی مہینے لگے۔ ان میں قابل ذکر حسب ذیل ہیں جن کا ذکر سکندر کے ہمرکاب یونانی حکمانے قلمبند کیا تھا۔

(۱) اسپنی کا ملک۔ یہ دریائے کابل کے شمال میں تھا، اس کا صدر دریائے کُنار کے کنارے پر تھا جہاں راجہ رہا کرتا تھا اور دو بڑے شہر بھی تھے جن کے نام اندکہ اور ارگٹم تھے۔

(۲) گرائین کا راج۔ یہ دریائے پنج کورہ کی سرزمین میں اسپنی اور اشں مکہ کے ملک کے درمیان واقع تھا۔

(۳) اشں مکہ کی حکومت۔ اس کی راجدھانی مساگہ (مزاغہ) تھا جس کا قلعہ بہت مستحکم تھا جو ملاکنڈ کے درہ کے قریب تھا۔ اشں وکہ یا اشں مکہ قوم کا ذکر پانینی نے لکھا ہے۔ اس کا ایک گروہ دکن میں بھی تھا جس کی مشہور اشکہ مہاجن پد مشہور ہے۔ راجہ اشکہ کے پاس بیس ہزار رسالہ تیس ہزار پیدل اور تیس ہاتھی تھے، اس نے سکندر کا بہادری سے مقابلہ کیا مگر تین چار روز بعد مارا گیا۔ تورانی نے ناامید ہوکر سکندر سے صلح کی درخواست کی، ہزارہ کے علاقہ کے کئی ہزار جوان انعام کی لالچ سے راجہ مساگہ کے پاس لڑنے کو جمع تھے، سکندر نے انھیں لالچ دیا کہ ہمارے ساتھ چلو، اُنھوں نے پہلے آمادگی ظاہر کی پھر خیال آیا کہ اپنے بھائی بندوں سے لڑنا دھرم نہیں ہے چنانچہ رات کو کھسک جانے کی صلاح ٹھہری جس کا سکندر کو پتہ لگ گیا، پندرہ بیس ہزار سپاہیوں نے ان کا کمپ گھیر لیا خوب گھمسان کا معرکہ ہوا، جب کوئی مرد مرتا تو اس کی عورت اس کے ہتھیار لے کر لڑتی جس سے یونانیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔

(۴) پس کلاوتی کا راج۔ جہاں اب چارسدہ ہے وہاں پر اس حکومت کا صدر تھا، سکندر کے وقت راجہ ہستی حکومت کرتا تھا، سکندر کے ایک لشکر سے خوب لڑا مگر مارا گیا۔

اس مختصر بیان سے واضح ہے کہ سکندر کے وقت ہندوکش سے لیکر پشاور تک ہندو قومیں آباد تھیں یونانیوں نے وزیرستان وغیرہ کا حال نہیں لکھا ہے کیونکہ وہ اُدھر نہیں گئے۔ مگر گمان غالب ہے کہ اس ملک میں اور اُس سے آگے غزنی وغیرہ کے علاقے میں وہی پرانے گروہ آباد تھے جو دو سو سال پہلے سے شاہِ ایران کو خراج دیا کرتے تھے اور ان میں کچھ قوم بھی تھی۔

عظیم الشان سلطنت موریہ

سکندر دل شکستہ ہوکر جہلم کے دریائی راستہ سے سندھ پہونچا اور وہاں سے مکران کے راستہ سے سوزہ (ایران) ۳۲۴ قبل مسیح میں چلا گیا۔ اور ۳۲۳ ق م میں شہر بابل میں مرگیا۔ وہ سندھ سے چلا ہی تھا کہ اقوام و سرداران کا زبردست جتھا نوعمر چندر گپت موریہ کی کوشش اور ہوشیاری سے مرتب ہوگیا، جس نے سکندر کے والسرائوں کو جو بیاس سے لیکر پشاور تک مع زبردست یونانی سپاہ کے تعینات تھے جنگ آزمائی کا اعلان کردیا۔ واضح ہو کہ مفتوحہ ملک پنجاب کے انتظام اور یونانی تسلط کے قیام کے لیے سکندر نے اپنے نہایت ہوشیار دلاور اور آزمودہ کار جرنیل اور آزمودہ کار یونانی سپاہ کا بھاری لشکر تعینات کردیا تھا، جنگ شروع ہوئی، ہر میدان میں یونانی جرنیل شکست کھاتے رہے، چندر گپت نے ہزیمت پر ہزیمت دے کر یونانی سپاہ کا ستیاناس کردیا، انھوں نے اطاعت قبول کرکے جان بچائی۔ اس طرح پر سکندر کا کام جو سال ڈیڑھ سال میں سرانجام ہوا تھا، دلاور چندر گپت نے جس کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہ تھی اتنے ہی عرصہ میں خاک میں ملا دیا، شاندار یونانی سلطنت نقش بر آب ثابت ہوئی۔ آخرکار چندر گپت بیاس سے لیکر پشاور تک فرمانروا ہوگیا۔ بعد میں اس نے مگدھ کے مہاراجہ پدم نند کو سخت معرکہ میں شکست فاش دی جس میں اُس زمانہ کا سب سے بڑا ہندو فرمانروا کام آیا اور چندر گپت عظیم سلطنت مگدھ کا جو برہم پتر سے لیکر الہ آباد تک ادھر ہمالہ کے دامن سے لیکر بندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھی تاجدار بن گیا۔ نند کی بھاری فوج اور بے قیاس دولت جس کے لئے وہ بہت ہی مشہور تھا چندر گپت کے ہاتھ آئی، پھر اس نے رفتہ رفتہ اپنی سلطنت مغرب میں گجرات کاٹھیاواڑ اور سندھ تک پھیلائی اور جنوب میں ریاست میسور کے شمالی اضلاع تک اپنا تسلط بٹھالیا۔ چندر گپت اعظم صرف فاتح ہی نہ تھا بلکہ وہ بڑا عجیب و غریب منتظم بھی تھا، خوش قسمتی سے اُسے چانکیہ کوٹلیہ ایسا عالی دماغ مدبر وزیر اعظم مل گیا تھا جو ہندو فنِ حکومت کا سب سے بڑا اُستاد سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ نظامِ حکومت چندر گپت کے نظم و نسق کی ہوبہو نقل ہے۔ مغربی محقق اسے بہت پیچیدہ قسم کی دفتر شاہی حکومت بتلاتے ہیں۔ ملک کے چاروں طرف سڑکیں تھیں جو پشاور سے بر ہمپترا اور کوشان بی (الہ آباد کے قریب) سے سندھ۔ گجرات اور دکن کی طرف جاتی تھیں، دونوں طرف درخت، جابجا کنوئیں اور سرائیں تھیں، جا بجا ستونوں پر تختے لگے ہوئے تھے جن پر مختلف مقامات کے نام اور فاصلے درج تھے اور سڑکوں پر کوسوں کے نشانات تھے

مردم شماری، خانہ شماری، خسرہ گرداوری اور رجسٹر ملکیت مکانات (قصبات اور شہروں کے لئے) محصول
کی چنگیاں، مسافروں کی نگرانی اور جاسوس اور بیسیوں باتیں تھیں جن کا تفصیلی ذکر کسی اور موقع کے
لئے اٹھائے رکھتے ہیں۔

سکندر کے مرنے کے بعد اس کے ایشیائی مقبوضات پر اس کے جرنیل قابض ہوگئے، افغانستان
اور بلوچستان تک اُن میں تقسیم ہوگیا، سلیوکس نے بابل لے لیا اور آسوریہ کے یونانی حریف سے معرکے
شروع کردیئے۔ ۳۱۱ ق م میں وہ شہنشاہ بن گیا تو فوراً پنجاب پر از سر نو یونانی تسلط بٹھانے کی کوشش
شروع کردی، چار پانچ سال کی تیاریوں کے بعد ۳۰۵ ق م میں بہت بھاری لشکروں اور سامانوں کے
ساتھ کوچ کا حکم دے دیا۔ مصر تک کی فوجیں اور حکمرانانِ یونانی اس کے ہمرکاب تھے۔ ۳۰۴ ق م میں وہ
جہلم کے کنارے اسی جگہ خیمہ زن ہوا جہاں مئی ۳۲۶ ق م میں سکندر نے ڈیرے ڈالے تھے، کیونکہ سلیوکس
کا منشا سکندر کی طرح شاندار فتح حاصل کرکے پنجاب کو یونانی حکومت میں شامل کرنے کا تھا، ادھر چندر گپت اعظم
تھا جو یونانی دھاوے کی اہمیت سے خوب آگاہ تھا، اُس نے ہر قسم کی سپاہ اور سامان عین اسی میدان میں
جمع کردیئے جہاں پورو کی مٹھی بھر فوج سکندر کی مزاحمت کے لئے تعینات کی گئی تھی۔ یونانی بیان کی رو سے
چندر گپت کی ہر قسم کی چھ لاکھ فوج تھی، معرکے شروع ہوئے، سلیوکس کے منصوبے برباد ہوگئے، جب کامیابی
کی امید نہ دیکھی تو صلح کی استدعا کی، چندر گپت رضامند ہوگیا، سلیوکس نے افغانستان اور بلوچستان
سلطنت موریہ سے ملحق کردیا اور اس کے علاوہ اپنی بیٹی بھی چندر گپت کو بیاہ دی۔ یہ معاہدہ ۳۰۳ ق م
میں طے پایا تھا جس کے باعث سلطنت موریہ کی حد ہندوکش کے جنوبی ڈھلوان سے لیکر ہرات، ہری رود
اور سیستان تک جا پہونچی۔ نئے علاقوں میں چندر گپت اعظم نے اپنے وائسرائے اور گورنر مقرر کردیئے، کوئی
سو سال تک موریہ کی حکومت رہی۔

یونانی مورخ پولی بیوس کا بیان ہے کہ ۲۰۶ ق م میں کابل میں راجہ سوبھاگ سین حکمراں تھا،
جس سے ملنے کو انطیاکس اعظم آیا تھا۔ یونانی حملہ اس سے کچھ عرصہ بعد ہوا تھا جس سے افغانستان پر باختریہ
کے یونانی تاجدار کا تسلط جم گیا اور دیر تک رہا، مگر ہندو شستگی کا اثر کوہستان ہندوکش تک بدستور سابق
رہا۔ اس زمانہ کے یونانی سکے جو برآمد ہوئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ باختریہ کے حکمران خالص یونانی
سکے مضروب کراتے تھے۔ مگر جب وادی کابل اور قندھار اور گندھارا پر دم طریاس کا پورا قبضہ ہوگیا تو سکے
کے ایک طرف یونانی اور دوسری خروشتی خط میں پراکرت ہوتی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں پراکرت بولنے
اور جاننے والے ہندو لوگ آباد تھے۔ مگر دو یونانی تاجداروں (پنٹلیاس اور اگستہ قلس) نے ٹھیٹھ ہندی،

نمونے کے سکے رائج کئے جو مربع نما تھے۔ اور ان پر براہمی حروف کندہ تھے۔ افغانستان کے مختلف حصّوں سے یہ سکّے برآمد ہوئے ہیں جس سے یونانی سلطنت کی وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ قندھار بھی یونانیوں ہی کے زیرنگیں تھا۔ اگراتی دس نے ایک تانبہ کا سکہ رائج کیا تھا جس کے ایک طرف خروشتی حروف میں "کاپُشئے نگرد یوتا" کندہ ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہے کہ اُس زمانے میں پراکرت بولنے والے لوگ وادیِ کابل اور علاقہ سرحد اور گندھارو کاپشا میں آباد تھے۔

اِس کے بعد سدی قوم آئی جس کا بڑا نامی بادشاہ موگہ تھا، پھر پارتھی قوم آئی جس کا سیستان اور قندھار پر قبضہ ہوگیا۔ ۵۰ء میں کشان قوم کے مختلف گروہ ہندوکش سے گزر کر آئے اور کابل اور قندھار پارتھیہ والوں سے چھین لیے۔ کدفس ثانی نے پنجاب چھوڑ بنارس تک ہندوستان زیر کرلیا، کنشک کے زمانہ میں کشان قوم کا عروج انتہائی درجہ پر پہونچ گیا جس میں کشمیر کے علاوہ کاشغر اور یارقند اور ختن کے علاقے بھی شامل تھے۔ کنشک نے بدھ مت قبول کرکے اس کی اشاعت کے لئے بڑی کوشش کی۔ تمام علاقۂ سرحد جہاں اب شورہ پشت آزاد قبائل رہتے ہیں بدھ مت کا پیرو ہوگیا۔ افغانستان اور ترکستان کے علاوہ مشرقی ایشیا تک جا پہونچا، اس نے افغانستان میں ٹوپ اور وہار تعمیر کرائے جو اب تک اِس ملک میں کئی جگہ موجود ہیں۔ بالائی وادیِ کابل میں جو ٹوپ ہیں ان میں سے بھوج پتر کی پُرانی تحریریں برآمد ہوئی ہیں، جن کی زبان پراکرت اور رسم الخط خروشتی ہے، ترکستان کے صحرا سے سنسکرت نسخے گپتا کے زمانہ کے رسم الخط میں اور پراکرت کے خروشتی حروف میں دستیاب ہو چکے ہیں۔ سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان کی پراکرت اور ختن کی خروشتی رسم الخط کی زبان ایک ہی ہے، وادیِ قرم سے بھی ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں پر بھی پراکرت کا رواج تھا۔[1]

دوسری صدی عیسوی میں ہندوستان کی سرحد بہت وسیع ہوگئی تھی۔ قرش اور اُس کے جانشینوں کے زمانہ میں گندھار یعنی پشاور کے مشرق اور شمال کا علاقہ۔ خطۂ آن روئے اٹک سے بالکل جدا تھا۔ گمس تھینز کے بیان کا تتبع کرکے استرابو اور آیرین نے ملک ہند کی سرحد اٹک قرار دی تھی مگر دوسری صدی مسیحی میں طالمی یونانی سیاح جغرافیہ لکھتا ہے کہ ہند کی مغربی سرحد پر کابل، قندھار اور بلوچستان ہے جس سے یہ ظاہر ہے کہ تمام موجودہ علاقہ سرحد ملکِ ہند میں شامل تھا، اور طالمی کے بیان کی چینی جاتری ہیون تسنگ نے جو ساتویں صدی میں آیا تھا اپنے بیان سے تائید کردی ہے، اور نویں صدی میں نگرہار (جلال آباد) اترا پتھ کا ہرا[2] قرار دیا گیا تھا

---

[1] انشنٹ انڈین کلچر ان افغانستان" ص ۱۵ [2] ملاحظہ ہو "انشنٹ انڈین کلچر ان افغانستان" صفحہ ۲

بودھ آثار قدامت بدھ مت کی قبولیت کے سبب سے افغانستان میں ہزاروں ٹوپ اور دہار تعمیر ہوئے تھے، اور یہ سب زیادہ تر اس بڑی سڑک کے آس پاس پائے جاتے ہیں جو شمال مغربی ہند اور وادیِ کابل کے درمیان تھی اور ہندوکش سے ہوکر مغربی اور مشرقی ایشیا کو جاتی تھی۔ جلال آباد (ننگرہار) کے میدان میں اتنے ٹوپ اور دہار ہیں کہ ان کا بیان محال ہے۔ کوہستان کابل میں پرانی شاہراہ سے کچھ دور اور ایک پرانے بدھ شہر کے نشانات نظر آتے ہیں جو سیہ توپان، کامری اور شیو کی کے محلات و قورع میں منتشر ہیں۔ کاپشا کی وادی میں بھی ایک مٹھ کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ وادی بامیان ہندوکش اور کوہ بابا کے مابین واقع ہے۔ وہاں پر بے شمار گپھائیں ہیں اور مہاتما بدھ کی سنگلاخ کوہ پیکر مورتیاں ہیں، چھوٹی پینتیس چالیس گز اور بڑی پچاس ساٹھ گز اونچی ناپی گئی ہیں۔ ان کی صنعت کاری قابل تعریف سمجھی جاتی ہے۔ ابوالفضل نے سترھویں صدی میں ان کا شمار بارہ ہزار لکھا تھا جس سے ظاہر ہے کہ وہاں پر بودھ لوگوں کا کتنا بڑا زور تھا۔ بامیان میں رنگین تصاویر حجروں کے اندر پائی جاتی ہیں جیسے اجنٹا میں ہیں۔ پرانے زمانہ میں یہ مقام بڑا مقدس سمجھا جاتا تھا، ہزارہا جاتری ترکستان مشرقی، بخارا، بلخ اور دیگر ملکوں سے وہاں آتے تھے۔ افغانی ترکستان کے اندر بھی ٹوپ وغیرہ پرانی عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ چھٹی صدی میں وحشت کے شیدا ہن آگئے، ساتویں صدی میں ترکی شاہیہ کا کابل میں تسلط ہوگیا جسے نویں صدی میں ہندوؤں نے زیر کرکے اپنی حکومت قائم کرلی، اس کا کچھ مدت زور رہا مگر سبکتگین نے کابل کے ہندو راج کو مٹا دیا، ساتویں صدی میں مغربی افغانستان نے اسلام قبول کرلیا اور سلطنت خلیفہ میں ملحق ہوگیا، مگر کابل جو ترکی شاہیہ اور ہندو شاہیہ کے ماتحت تھا اسلام سے دیر تک متاثر نہ ہوا۔

ڈاکٹر گھوشال کا بیان ہے کہ بلخ میں ویسے تو سو کے قریب بودھ مٹھ تھے مگر نوہار (نوبہار) بہت ہی بڑا تھا جسے مسلمانوں نے برباد کیا تھا، اس کے پجاری برمک نے اسلام قبول کرلیا پھر وہ خلیفہ کا وزیر بن گیا، البرامکہ خاندان کا اقتدار بہت شاندار سمجھا جاتا ہے۔ کاپشا میں سو مٹھ تھے جن میں چھ ہزار بھکشو رہتے تھے۔ لمپاکہ اور ننگرہار اور گندھار کا راجہ قوم کا کشتری مگر بدھ مت کا بڑا بھاری حامی تھا، کابل کا ہندو شاہیہ فرمانروا، گندھار، اُدیان اور پنجاب کے شمالی خطہ پر حکومت کرتا تھا۔ گویا خیبر کے شمال کا سارا پہاڑی ملک جس میں سوات، دیر، چترال وغیرہ کی ریاستیں ہیں اس کے زیر نگیں تھا۔ ڈاکٹر گھوشال لکھتے ہیں کہ پاشائی زبان جو اب دریائے کابل کے شمالی علاقہ ہی میں محدود ہے دیسی زبانوں میں بہت بلند مرتبہ پر شمار ہوتی ہے۔ اگلے وقتوں میں اس وادی کے بالائی اور درمیانی حصے میں بہت مقبول تھی۔ شمال مشرقی افغانستان کی کافر بولیاں جن پر شمال مغربی سرحد کی قوموں

کے راہ و رسم کا بہت اثر پڑا ہے ہندی اصل سمجھی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق ایرانی زبان سے نہیں بلکہ ملک ہند کی زبانوں سے ہے۔

اس بحث سے ظاہر ہے کہ نہایت پرانے زمانہ میں افغانستان میں کون لوگ آباد تھے، رگ وید سے واضح ہے کہ الینہ، بھلانہ اور گندھاری اور پکتھ قومیں جو آریہ تھیں اس ملک کے مشرقی، وسطی اور جنوبی خطہ میں آباد تھیں۔ شورہ پشت قبائل کا علاقہ بھی آریہ قوموں سے آباد تھا، اور ملک ہند شمالی کا ضروری حصہ شمار ہوتا تھا۔ گویا ظہور اسلام سے ہزارہا سال پہلے افغانستان میں ہندو آریہ رہتے تھے ... شمال مغرب یعنی باختریہ میں ایرانی آباد تھے۔ اسلام کا ظہور نویں دسویں صدی میں مشرقی حصوں میں ہوا تھا۔ سرحد اور افغانستان کے موجودہ باشندوں کا بڑا حصہ ان ہی پرانے آریہ لوگوں کی نسل سے ہے۔

بہترین انسان

میں نے ایک پھلدار درخت کو دیکھا اس کی شاخیں بار سے جھکی ہوئی تھیں اور بیشمار خوشنما پرندے اُن پر بیٹھکر پھلوں کو کھا رہے تھے اور خوشی سے چہچہا رہے تھے۔

درخت کے نیچے چند بوڑھے اور نوعمر بچے بھی تھے جو پھلوں کو لکڑی اور پتھروں سے توڑ رہے تھے۔

میں نے درخت سے کہا کہ اے درخت یہ لوگ اس بیدردی سے تجھے لکڑی پتھروں سے مار رہے ہیں اگر تجھ میں پھل نہ لگتے تو اچھا ہوتا۔

درخت نے کہا کہ اے بندۂ خدا یہ لوگ صرف اسی پر بس نہ کریں گے بلکہ جب میرے پھل ختم ہو جائیں گے تو مجھے کاٹ کر آگ میں جھونک دینگے۔ لیکن میں ہوں کہ ان سب مصائب پر شکر کرتا ہوں۔ تو نے مجھ سے مہربانی کی باتیں کی ہیں اس لئے میں تجھے بعض ایسی باتیں بتاتا ہوں جو آج تک میں نے کسی نہیں بتائیں۔ خدا نے مجھے اس لئے پیدا کیا ہے کہ انسان مجھے دیکھکر سبق حاصل کرے، یعنی جب تمہارے پاس کچھ ہوگا تو بہت سے لوگ تمہارے عزیز و اقارب بن جائیں گے اور اگر کچھ نہ ہوگا تو یگانہ بھی بیگانے بن جائیں گے۔ جس طرح میں کچھ عرصہ تک پھل دیکر فنا ہو جاتا ہوں اُسی طرح دنیا بھی کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو جائیگی۔ جس طرح میں لوگوں کو باوجود اُن کی بدسلوکی کے لذیذ پھل دیتا ہوں اسی طرح تم کو چاہیئے کہ اگر لوگ تم سے بدسلوکی بھی کریں تو تم اُن کو نفع پہونچاؤ۔ کیونکہ بہترین انسان وہی ہے جس سے دوسروں کو فائدہ پہونچے۔

(ماخوذ)

چکا ہوں، اب دل میں سوائے یادرفتگاں کے کوئی آرزو باقی نہیں، میرے بہت سے رفیق او عزیز اس دنیا سے مجھے تنہا چھوڑ کر چل بسے اور ہر چلنے والا میرے دل کو پاش پاش کر گیا

من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم لختے بردار از دل کر رود ہر کہ زپیشم

لیکن مجھے قوی امید ہے کہ گو میں اس سماج کی آیندہ ترقی دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہوں لیکن چونکہ یہ سماج نہایت قابل عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے اس کی روز افزوں ترقی ہوگی ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

افسوس اِس کے دو ہی برس بعد بابو انند سروپ اس دنیا سے کوچ کر گئے اور جن کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے اُن میں سے بھی کئی

کمر باندھے ہوئے چلنے کو اب تیار بیٹھے ہیں

جہاں بابو انند سروپ کی یہ کوشش تھی کہ سماج کے کاموں میں پبلک کو کسی شکایت کا موقع نہ ملے وہاں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ خواہ مخواہ حکام کو بھی کسی شکایت کا موقع نہ دیا جائے لیکن کبھی انھوں نے کسی کی خوشامد یا خوشنودیِ مزاج کی خاطر اصول کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ ایک مرتبہ جب سماج کا نگر کیرتن مسٹر ٹمتھوے کلکٹر کانپور نے روک دیا تھا تو اُنھوں نے اس وقت تک چین نہیں لیا جب تک صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سے کلکٹر کانپور کا حکم منسوخ نہیں کرا لیا۔ ایک دفعہ وہ اور منشی دیبی پرشاد کرائسٹ چرچ کالج کے احاطہ سے ایک کالیستھ خاندان کو بچا لائے تھے جو عیسائی ہونے والا تھا، اور اس طرح اُن کو اپنے آبائی دھرم میں قائم رکھا۔ ۱۹۰۷ء میں جب لالہ لاجپت رائے جلا وطن کئے گئے تھے تو آریہ سماج کانپور ہی پہلا سماج تھا کہ جس نے سب سے پہلے ایک پبلک جلسہ میں صدائے احتجاج بلند کی تھی اور اُس موقعہ پر جو زبردست تقریر بابو انند سروپ نے کی تھی وہ بڑے معرکہ کی تھی، یہ وہ وقت تھا جبکہ پنجاب کی سماجیں اس قسم کی کارروائی کرنے میں پس و پیش کرتی تھیں۔ آریہ سماج اور اس کے انسٹیٹیوشنوں کے ساتھ اون کی دلچسپی آخر وقت تک قائم رہی، اور اپنی آخری علالت کے زمانہ میں بھی جو ساڑھے تین برس سے کچھ زائد عرصہ تک رہی سماج کے ہر کام میں وہ بڑی سرگرمی کا اظہار کرتے رہے اور اپنی صائب رائے و مفید مشورہ سے فائدہ پہونچاتے رہے۔ پنجاب کے بعض برگزیدہ آریہ سماجی لیڈر اُن کو یو۔ پی کا لال چند کہا کرتے تھے یعنی جس طرح جسٹس لال چند ایم۔ اے پریسیڈنٹ کالج سوسائٹی لاہور پنجاب میں اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کے لحاظ سے ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے وہی درجہ بابو انند سروپ کو صوبۂ متحدہ میں حاصل تھا۔

رفاہ عام سوشل رفارم و دیگر خدمات رفاہ عام اور سوشل رفارم کے کاموں میں بابو انند سروپ کو بڑی دلچسپی تھی

چنانچہ جب کانپور میں ۱۹۱۰ء میں رفاہ عام ایسوسی ایشن پنڈت پرتھی ناتھ و دیگر اصحاب کی کوشش سے قائم کی گئی تو منشی شیام لال اُس کے پریسیڈنٹ اور بابو انند سروپ اُس کے سکریٹری مقرر کئے گئے۔ کانپور کا ہندو یتیم خانہ، بالکا ودیالہ، پرتھی ناتھ اسکول، کاولم پاٹھ شالہ، ایجوکیشن کمیٹی میونسپل بورڈ، ہندو سبھا کالیستھ سبھا بدھوا آشرم وغیرہ کانپور کا ہر ایک انسٹی ٹیوشن جس کی غرض رفاہ یا سوشل اصلاح یا ترقی تعلیم ہے بابو انند سروپ کی خدمات کا زیر بار احسان ہے۔ تعلیم نسواں، بدھوا بواہ، اچھوت اودھار، شدھی و سنگٹھن وغیرہ تحریکوں کے وہ زبردست حامی تھے اور اُن میں ہمیشہ سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ میونسپل بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے بھی جو خدمات انھوں نے شہر کانپور کی انجام دیں اُس کا اعتراف پبلک اور گورنمنٹ دونوں طرف سے ہوا، بورڈ مذکور کے بائی لاز انھیں کے مرتب کئے ہوئے ہیں جو ماڈل بائی لاز متصور کئے جاتے ہیں۔ موجودہ میونسپل ایکٹ کے متعلق آپ نے ایک معرکتہ الآرا نوٹ لکھا تھا جس کی گورنمنٹ اور رعایا دونوں نے بڑی قدر کی۔ کانپور میونسپل بورڈ کی تعلیمی کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے آپ نے کانپور میں ابتدائی تعلیم کی توسیع میں بڑی کوشش کی اور اس صوبہ میں یہ پہلا شہر تھا جس میں بابو صاحب کی تحریک اور توجہ سے جبریہ ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ انھیں پبلک خدمات کے سلسلہ میں گورنمنٹ نے اُن کو "رائے بہادر" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

پالیٹکس بابو انند سروپ پالیٹکس میں لبرل خیالات کے حامی تھے، وہ طبعاً بھی انتہا پسندی کے خلاف رہا کرتے تھے۔ اُن کی طبیعت کا رجحان ہمیشہ اعتدال کی طرف تھا۔ ہندوؤں کے جائز حقوق کے تحفظ کا اُن کو بڑا خیال رہتا تھا چنانچہ جب کونسل میں جہانگیر آبادی ترمیم پیش کی گئی جس کی رو سے میونسپل بورڈ وغیرہ لوکل باڈیز میں مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا حق دیا گیا تو انھوں نے اُس کی بڑی مخالفت کی تھی اور اس کے متعلق کانپور کے ایک پبلک جلسہ میں زبردست تقریر کی تھی جس کو اخبار لیڈر الہ آباد کے قابل اڈیٹر مسٹر چنتامنی نے شائع کر کے عوام میں تقسیم کیا تھا۔ وہ صوبہ کی کونسل میں تقریباً سات برس تک پہلے نامزد و بعد کو منتخب شدہ ممبر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جبریہ ابتدائی تعلیم کے قانون کا مسودہ اُنھیں نے کونسل میں پیش کر کے منظور کرایا تھا۔ کونسل کی مختلف سب کمیٹیوں میں انھوں نے ہمیشہ نہایت قابلیت سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ وہ کونسل کے پہلے ڈپٹی پریسیڈنٹ منتخب کئے گئے اور اس عہدہ کے فرائض بھی انھوں نے بڑی خوبی سے انجام دیئے۔ بقول مسٹر چنتامنی اڈیٹر لیڈر ان کے دوست اور مداح بھی اُن کی اس واقفیت کو دیکھکر حیران و ششدر رہ جاتے تھے جو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران میں برٹش پارلیمنٹ کے عملدرآمد کے متعلق ظاہر کیا کرتے تھے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اگر بابو انند سروپ کونسل میں پہلے غیر سرکاری پریسیڈنٹ کے انتخاب کے وقت ممبر ہوتے تو وہی اُس کے پہلے پریسیڈنٹ بھی منتخب کئے جاتے۔

شاعری

منشی شیام لال وکیل کو شاعری کا بھی شوق تھا، اُنھوں نے وکالت کا امتحان دیتے وقت کئی قانون نظم کر ڈالے تھے۔ ان کے یہاں شام کو اکثر شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا جس کا اثر بابو آنند سروپ پر بھی پڑا اور وہ بھی کبھی کبھی اشعار کہنے لگے۔ ان کا تخلص یاس تھا، انھوں نے دو منظوم رسالے "نالۂ دل" اور "سرمۂ چشم" بھی لکھے جو بہت دلچسپ اور پر اثر ہیں۔ ایک مرتبہ منشی کرشن سہائے صاحب وحشی تخلص جو کانپور کے ایک مشہور شاعر ہیں اپنے یہاں ایک بزم مشاعرہ منعقد کی۔ بابو آنند سروپ کو بھی انھوں نے خاص طور پر مدعو کیا تھا مصرعہ طرح حسب ذیل تھا

رہنما آج مری لغزشِ مستانہ ہے

مشاعرہ سے کچھ دیر قبل ہی بابو صاحب نے چند اشعار موزوں کئے جو حاضرین کی ضیافت طبع کے لئے درج ذیل ہیں:-

دل یہی چاہتا ہے بزم میں پہونچوں لیکن ۔۔۔ رہنما آج مری لغزشِ مستانہ ہے
کون ہوتا ہے رفیق اس سفرِ ہستی میں ۔۔۔ ہم قدم اپنا یہ دردِ دلِ دیوانہ ہے
بزمِ رنداں میں جو جانا تو ادب سے جانا ۔۔۔ ایک شیشے میں بھری حرمتِ میخانہ ہے

کبھی کبھی وہ فارسی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ ذیل میں اُن کے فارسی اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

دیدہ را بر نوکِ مژگاں میزنم ۔۔۔ لختِ دل را بر نمکداں میزنم
از دہانِ زخمہائے بے شمار ۔۔۔ خندہ بر خارِ مغیلاں میزنم
از فراموشیِ اہلِ کانپور ۔۔۔ نشترِ غم بر رگِ جاں میزنم
تا کنم بیدار مستِ خواب را ۔۔۔ نالہ با مرغِ سحرخواں میزنم
یاس چوں سخنم نمی شنود کسے ۔۔۔ با دلِ مظلوم دستاں میزنم

عادات و اطوار

بابو آنند سروپ میں قدرت نے بہت سے اوصاف جمع کر دئے تھے، اُن کا مزاج سنجیدہ واقع ہوا تھا، طبیعت سادگی پسند تھی، تکلف و تصنع کو مطلق دخل نہ تھا۔ بقول منشی دیا نراین صاحب اڈیٹر زمانہ اُن کا مزاج بناوٹ اور خوشامد سے کوسوں دُور تھا اور اعلیٰ درجہ کی خودداری اور دیانتداری اُن کی طبیعت ثانی بن گئی تھی۔ ہر معاملہ کے متعلق وہ کافی غور و فکر کے بعد رائے قائم کرتے تھے اور کسی کام میں وہ زیادہ عجلت کو پسند نہ کرتے تھے، ہر کام کو قاعدہ کے ساتھ انجام دینے کے عادی تھے، چنانچہ کھانے پینے کے معاملہ میں بھی وہ ہمیشہ وقت مقررہ کی پابندی کیا کرتے تھے اور ناوقت کوئی چیز نہیں کھاتے تھے جس کام کو وہ ایک دفعہ شروع کرتے تھے اُس کے درمیان میں دوسرا کام نہیں اُٹھاتے تھے، غصہ تو انھیں آتا ہی نہ تھا

اعتدال پسندی ان کی طبیعت کا خاصہ تھا، پبلک معاملات کے متعلق کئی دفعہ ایسے اصحاب نے ان کی مخالفت کی جن سے اُن کو مخالفت کی توقع نہ تھی لیکن اس کے باوجود ان اصحاب کے ساتھ بھی ان کے تعلقات برابر دوستانہ رہے۔ استقلال اُن کی ذات کا جوہر تھا اور سخت مخالفت اور جانکاہ موقعوں کے وقت بھی بڑے صبر و تحمل سے کام لیتے تھے اور اُن کی آخری طویل علالت میں بھی انھوں نے بڑی مستقل مزاجی سے کام لیا۔ کانپور میں اُن کی ذات ایک ایسی ذات تھی جس پر اہل شہر کو بڑا اعتماد اور بھروسہ تھا اور ان کی وفات سے جو ۱۸- نومبر سنہ ۱۹۳۱ء کو واقع ہوئی کانپور و نیز صوبہ متحدہ کو جو نقصان عظیم پہونچا اس کی تلافی مشکل ہے۔

زرّیں اقوال

(۱) انسان اپنی فطرت کو بمشکل بدلتا ہے، اگر موچی کو بادشاہ بنا دو تو بھی وہ اپنے پیشہ کو نہیں چھوڑیگا

(۲) جسمانی اور دماغی اصلاح لازم و ملزوم ہیں، دونوں الگ الگ نہیں ہو سکتیں۔ اگر ایک سے غفلت کرو تو دوسری خراب ہو جائیگی　　(واشنگٹن)

(۳) انسان دھرم کو کبھی ترک نہ کرے، نہ کسی آرزو، نہ خوف نہ لالچ اور نہ جان کی خاطر۔ سکھ دکھ چند روزہ ہے۔ دھرم ہمیشہ ہے اسلئے دھرم کی پابندی لازم ہے۔　　(مہابھارت)

(۴) جو شخص غصہ کو پی جاتا ہے، خدا قیامت میں اُسے عذاب سے بچا لیتا ہے اور جو خدا سے معذرت کرتا ہے خدا اُس کی معذرت قبول کر لیتا ہے۔　　(پیغمبر اسلام)

(۵) ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی کمال کو پہونچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ مصروفیت کو صلاحیت اور طاقت کے اندر محدود رکھے　　(وکیلے)

(۶) مصیبت کے وقت رونا فضول ہے بلکہ ایسی کوششیں کرنی چاہیئے کہ مصیبت دور ہو　　(سقراط)

(۷) انسان کی روح سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرنے کی پوری طاقت رکھتی ہے۔　　(سوامی دیانند)

(۸) دوسروں کا اعتماد کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر دنیا کے کام نہیں چلتے۔　　(ٹینی سن)

(۹) انسان کو اپنی ذاتی بھلائی یا نجات کی اتنی خواہش نہیں کرنی چاہیئے جتنی کہ ہر جگہ اور ہمیشہ تمام دنیا کی بھلائی اور نجات کی کوشش کرنی چاہیئے۔　　(مہاتما بدھ)

(ماخوذ)

میری شہسواری

(از مرزا عظیم بیگ چغتائی، بی۔اے۔ایل ایل۔بی)

حماقت پر حماقت تو میری ملاحظہ ہو! ..... میری شادی کو مشکل سے بیس پچیس ہی روز ہوئے ہونگے کہ کمرہ میں آیا تو خانم نے اپنی دانست میں ایک عجیب واقعہ سُنایا، کہ ایک دفعہ ایک نہایت شریر گھوڑا آیا جس پر کسی سے چڑھا نہ گیا، بھائی صاحب نے کہا کہ ہم چڑھیں گے اور کوشش بھی اُنھوں نے بہت کی مگر کامیاب نہ ہوئے بالآخر اُس کو ایک چبوترے کے پاس لاکر غڑاپ سے زین پر پھاند پڑے لیکن گھوڑے نے جوٹا ہیں ماریں تو بس دیکھتے ہی بنا، الف ہوگیا، بل کھائے، دولتیاں چلائیں، چرخ کھایا اور کیا کیا تلملایا ہے کہ خدا کی پناہ مگر بھائی صاحب نے اُسے نہ چھوڑا۔ دیکھنے والے اُن کی شہسواری کو دیکھ کے واہ واہ کرنے لگے۔ بالآخر بجلی کی طرح وہ ایک دم سے بنگلہ کی دیوار کود گیا اور اُنھیں ایسا لے بھاگا کہ لوگ گھبرا اُٹھے کہ خدا معلوم کہاں لیجا کر پھینکے، غرض سب کے چہرے فق تھے۔ بھابی جان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، نانی اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں البتہ والد صاحب کھڑے ہنس رہے تھے کہ ایک آدھ گھنٹہ بعد کیا دیکھتے ہیں کہ بھائی صاحب ہنستے ہوئے چلے آرہے ہیں، گھوڑے کو اُنھوں نے بالکل شل کردیا تھا۔

میں کیا عرض کروں کہ خانم نے شہسواری کی یہ کیفیت کس طرح بیان کی۔ میرا دل کڑھنے لگا کہ ہائے میں بھی کیوں نہ ایسا شہسوار ہوا، جب چھوٹا تھا تو عموماً ٹٹو پر سوار ہونے کی اپنی باری بھائی صاحب کے ہاتھ ایک پیسہ میں فروخت کرڈالتا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ تجارت اور یہ منفعت کچھ کام نہ آئیگی۔ خانم نے تمام کیفیت بیان کرکے مجھ سے میری شہسواری کا حال پوچھا تو میں نے پہلے تو خانم کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اس خیال سے کہ ان کی دلشکنی نہ ہو جائے میں نے کہہ دیا کہ "ہاں مجھے گھوڑے پر چڑھنا آتا ہے" اس کے ساتھ ہی دو تین واقعات بھی سُنا ڈالے، گھٹنہ پر چوٹ کے نشان تھے وہ دکھائے کہ دیکھو اسی شوق کی بدولت یہ چوٹیں آئی ہیں ایک دفعہ ایک بدمعاش گھوڑے نے گرا کر زخمی کردیا تھا، حالانکہ اصل واقعہ تو یہ تھا کہ ایک نالایق کتے نے بھونک بھونک کر مجھے گرا دیا تھا

کوئی وجہ نہ تھی کہ خانم میرے جھوٹ کو سچ نہ مان لیتیں، خدا کے فضل سے سارا گھر شہسواری کا دلدادہ تھا

والد صاحب کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ وہ اپنی سواری کا گھوڑا کسی کو نہیں دیتے، گھر میں لے دیکر اب صرف یہی ایک گھوڑا رہ گیا تھا اس لئے کہ انھیں سواری کی ضرورت پڑا کرتی تھی، بہر حال مجھے معلوم تھا کہ نہ کبھی والد صاحب گھوڑا دیں گے اور نہ میری شہسواری کا امتحان ہوگا، اگر کبھی ایسا کوئی موقعہ آیا بھی، تو اس کو ٹال دینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

مجھ سے بھابی جان سے کوئی لڑائی نہیں پھر نہ معلوم کیوں انھوں نے میری شہسواری کے افسانوں کو جمنے ہی نہیں دیا، اور میرے لئے ایک مصیبت یہ تھی کہ خانم اکثر میری شہسواری کے قصے لے بیٹھتیں اور بھابی جان ہنس ہنس کر اُن کی پرزور تردید کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتی تھیں۔ اور خانم کا یہ حال ہوگیا کہ بھابی جان کی تردیدوں کو وہ اپنے دق کرنے اور مذاق اُڑانے کا بہانہ تصور کرکے آگ ہوجاتی تھیں۔ ان کے دل میں یہ یقین ہوگیا تھا کہ بھابی جان انھیں اپنے مذاق کا تختہ مشق بنا رہی ہیں۔

میں بھی کس سادگی سے بھابی جان کے منہ پر یہ کہدیتا تھا کہ "کیوں مذاق کرتی ہو؟" مگر وہ حقیقت سے واقف تھیں، ہنسی کے مارے دوہری ہوجاتیں اور آنکھیں پھاڑ کر کہتیں "غضب کرتے ہو! ایسا سفید جھوٹ! آخر یہ جھوٹ کے دن چلے گا؟" بھائی صاحب اس بارہ میں کبھی نہ بولے بلکہ جب ذکر آیا فوراً تسلیم کرلیا کہ میں اُن سے کہیں اچھا شہسوار ہوں، وہ بھی اس پیرایہ میں کہ کبھی پتہ نہ چلا کہ مذاق کرتے ہیں یا سچ کہتے ہیں، نتیجہ اس بحث مباحثے کا یہ ہوا کہ خانم اور بھابی جان نے شرط بدی، بھابی جان نے یہ شرط کی کہ جس گھوڑے پر میں کہوں اگر بھائی چڑھ لیں تو دس روپیہ ہاروں گی ورنہ تمہیں دینا پڑینگے۔ خانم نے تیہے میں آکر فوراً یہ شرط پختہ کرلی اس کے بعد دو تین دفعہ میری شہسواری کے امتحان کا موقعہ آیا لیکن ہر دفعہ بہانہ کرکے ٹال گیا، ادھر والد صاحب قبلہ کا یہ حال کہ آئے دن چھانٹ چھانٹ کر بگڑے تگڑے اور بدمعاش گھوڑے منگواتے، بہر حال کچھ عرصہ تک میری ٹالم ٹول مزہ سے چلتی رہی۔

بھابی جان تو جانتی ہی تھیں کہ میرے لئے کسی گھوڑے پر چڑھنے کی ہمت کرنا ناممکن ہے، انھوں نے ایفائے شرط کے لئے خانم سے موٹی موٹی قسمیں لے رکھی تھیں

میں لحاف میں لیٹا ہوا مزے سے ایک کتاب پڑھ رہا تھا اور سگرٹ کا دھواں اڑا رہا تھا کہ آواز آئی "اے میاں مُنّن ....."

جلدی سے میں نے سگرٹ دیوار سے رگڑ کر بجھایا اور اٹھ بیٹھا کہ پھر آواز آئی۔

"کیا کر رہے ہو؟ ..."

میں باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ والد صاحب قبلہ اس بلا کی سردی میں صرف ایک قمیص پہنے چبوترہ پر کھڑے ہیں اور سائیس ایک گھوڑا لیئے سامنے کھڑا ہے، مجھے دیکھتے ہی والد صاحب بشاش ہو کر بولے:-

"کہو کیسا گھوڑا ہے؟"

میں نے کہا "کیا آپ لیں گے؟"

"یہی سوچ رہا ہوں"۔ مسکرا کر کہا۔

میں نے کہا "کیا کیجیئے گا ضرورت تو نہیں ہے"۔ پھر میں نے سائیس سے کہا کہ "لیجاؤ یہاں کسی کو گھوڑا ووڑا نہیں لینا ہے"۔

والد صاحب اس پر ہنس پڑے اور کہنے لگے "میاں ٹھہرو، بھی لے تھوڑی رہے ہیں، ذرا دیکھنے تو دو"۔ میں نے لاکھ کہا کہ دیکھکر کیا کیجئے گا مگر وہ کاہیکو مانتے۔ کہنے لگے "ذرا اونھیں ہاتھ پر لیکر دوڑا تو سہی"۔ اب سائیس تو لگا گھوڑا دوڑانے اور میں نے والد صاحب قبلہ کو لکچر دینا شروع کیا۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ آپ کے والد یا کسی اور بزرگ کو ساٹھ ستر برس کی عمر میں یہ مرض لگ جائے کہ چلبلا سا گھوڑا اکڑ پائیں تو اچھل کر اُس کی پیٹھ پر ہو لیں اور روزانہ دس بارہ میل تک کا چکر لگا آئیں، آپ ہی بتائیے کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہونگے، جب تک ملازمت پر رہے چار چار پانچ پانچ گھوڑے رکھتے رہے جب پنشن ہوئی اور آمدنی میں کمی ہو گئی تو وہی ایک پر اکتفا کی مگر ہم لوگوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ شغل محض بے ضرورت اور لغو ہے، کیونکہ بدقسمتی سے ادھر گھوڑا عمر پر آیا اور اُدھر انھوں نے اُسے الگ کر کے پھر کوئی دوسرا نہایت شریر گھوڑا ڈھونڈھنے لگے۔ ان باتوں سے مجھے گھوڑے سے نفرت ہی نہیں بغض ہو گیا ہے، آپ بھی غور فرمائیے کہ کس قدر نالایق جانور ہے، دانہ کھلاؤ، گھاس کھلاؤ اور موقعہ پا جائے تو لات مار دے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کون حضرت تھے جنھوں نے گھوڑے ایسے نامعقول جانور کو سواری کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے، جب کوئی چیز سواری کو میسر ہی نہ تھی تو گھوڑے کا سواری میں رکھنا حق بجانب تھا مگر آج کل گھوڑے کی کیا حیثیت رہ گئی، اگر کسی موٹر سائیکل، ریل، ٹریم یا کسی دوسری سواری میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ ادھر مسافر اُس کے قریب آیا اور اُدھر اُس کا پہیہ ٹوٹ کر مسافر کی پسلی میں لگنے لگے تو وہ کہاں تک سواری کے قابل سمجھی جائیگی، گھوڑے میں یہ عیب موجود ہے پھر بھی وہ سواری کی تعریف میں داخل ہے! یا اگر آپ کی موٹر سائیکل میں ایسا انجن لگا دیا جائے جو آپ

کے قبضہ میں نہ ہو اور جب زور پہ آئے تو جہاں جی چاہے لیکر چلدے مثلاً اگر آپ اسے سڑک کے بیچ میں چلانا چاہیں اور وہ کنارے کسی کھڈ میں لیجا کر ڈال دے اور روکنے پر بھی نہ رُکے تو یہ کوئی سواری ہے۔ گھوڑے میں یہ سب عیب موجود ہیں اور جب کبھی اس کے جی میں آتا ہے تو اس زور سے دوڑتا ہے کہ روکے رکتا ہی نہیں، اور آپ کو لئے بھاگا جاتا ہے، اگر آپ زیادہ روکیں اور راس تانیں تو وہ کوشش کرکے آپ کو ہوا میں اوچھال دیگا اور گرتے گرتے اوپر سے دولتی بھی جڑ دے گا اور خود ایسا بے تحاشا بھاگے گا جیسے کوئی ریل چھوٹی جا رہی ہے۔ آپ کہیں گے کہ تم اناڑی سوار کی طرح باتیں کر رہے ہو، مجھے یہ نامعقول سواری واقعی پسند نہیں ہے مگر بھائی صاحب کو اکثر گھوڑے سے گرتے دیکھا ہے اور جب کبھی اُنھوں نے آسن جما کر بیٹھنے کی کوشش کی تو گھوڑے نے دوسری ترکیب نکالی، یعنی تھوڑا سا اُلٹا چلا، گھوما اور پھر الف ہو گیا! والد صاحب قبلہ کی ہدایت ہے کہ جب گھوڑا الف ہو جائے تو آگے کو جھکو، یوں راس جھٹکو، یوں زین پر جمو وغیرہ وغیرہ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر یہ مصیبت مول ہی کیوں لی جائے، بہر حال اگر آپ بیحیائی سے زین پر جمے رہے تو گھوڑا آپ کو اُلٹا پلٹا کر اور جھٹکا دیکر نت نئی حرکتیں کریگا اور اگر خدا خدا کرکے چلا بھی تو عجیب شان سے چلیگا، اگر منہ پورب کی طرف ہو گا تو دُم پچھم کی طرف ہو گی مگر وہ خود جائیگا دکھن کی طرف! یعنی آڑے آڑے کو دتے ہوئے چلے گا۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس معصوم کا کوئی قصور نہیں، ان کی رائے میں یہ کھڑ کا اور گھوڑے کو بدکنے کا حق حاصل ہو گیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، بات دراصل یہ ہے کہ والد صاحب نے کسی نہ کسی بہانہ سے اپنے گھوڑے کو علیحدہ کر دیا اور علیحدہ کیا کر دیا، ڈاکٹر صاحب نے انھیں ڈرا دیا کہ اگر آپ کچھ دنوں کے لئے گھوڑے کی سواری ترک نہ کریں گے تو آپ کے اعضا کو نقصان پہونچے گا۔ بہر حال گھوڑا بھی بڈھا تھا بیچ ڈالا جب تک دوسرا خریدا جائے کو چوان بھی جو بتیس برس کا ملازم تھا کہیں چلدیا۔ غرض اس طرح کچھ عرصے تک گھوڑے کی خریداری کی نوبت نہ آئی، اور والد صاحب ٹینس میں گھوڑے کی کسر نکالنے لگے، روز جا کر کھیلتے تھے مگر جناب بڑھاپا بری چیز ہے، اڑسٹھ سال کی عمر میں اس قسم کی کود پھاند میں ضرور کسی نہ کسی دن نقصان اٹھانا پڑیگا چنانچہ ایک روز جست وخیز کرنے میں گھٹنے میں چیک پیدا ہو گئی اور دوڑنے کی سکت باقی نہ رہی، اب تانگے پر آنے جانے لگے، مگر تانگے والے بھی بڑے باتونی ہوتے ہیں، ان سے گھوڑوں کی باتیں ہوتے ہوتے ایک روز گھوڑا لانے کو کہدیا گیا، بس پھر کیا تھا وہ یہ شریر گھوڑا دکھانے کو لے آیا۔ جب اس کو دوڑایا جانے لگا تو مجھے بھی حکم ملا کہ "ذرا تم بھی چڑھ کے اس پر دُلکی نکالو"

یہ وہ جانتے تھے کہ نہ کبھی میں گھوڑے پر چڑھا ہوں اور نہ چڑھ سکتا ہوں، ایسی صورت میں ان کا یہ کہنا کہ "لو بھئی اب تم چڑھو" محض ایک طنز آمیز اور مزاحیہ فقرہ تھا، بھائی صاحب تو ابھی سو کر بھی نہ اُٹھے تھے

اور میں بھی حشر تک کمرے سے نہ نکلتا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ باہر گھوڑا آیا ہوا ہے، مگر اب تو پھنس گیا ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے کی طرف خانم اور بھابی جان بھی کھڑی ہیں، دل میں سوچا کہ آج ہی بھانڈا پھوٹا، میں بت کی طرح ساکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ یہ نازک پوزیشن جلد ہی نازک تر ہوگئی، کیونکہ خانم اور بھابی جان میں نہایت زور و شور سے بحث ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں نے اشارے سے بلایا۔

چار و ناچار جانا پڑا مگر میں گھبرایا ہوا پہونچا۔ دم بھر کے لئے دل کو مضبوط کر کے نہایت ہی لاپروائی کے ساتھ دونوں کی باتیں سننے لگا۔ کس اطمینان اور بھروسے کے ساتھ خانم مجھ سے شرط جیتنے کی فرمائش کر رہی تھیں اور بھابی جان کے چہرہ پر گویا انبساط و شادمانی کا دریا لہریں مار رہا تھا وہ جانتی تھیں کہ میرے فرشتے بھی کبھی گھوڑے پر نہیں چڑھے، مگر خانم کا جوش قابل دید تھا وہ خود بھی میری شہسواری کے کرتب دیکھنے کے لئے بیچین تھیں

بہرحال خوش و بشاش ہو کر خانم نے مجھے چبوترے پر ڈھکیل دیا اور کہنے لگیں کہ "جلدی جاؤ چڑھو اور تھکا کر اس کو شل کر دو، بڑی تیزی دکھا رہا ہے، سب بھول جائے تو بات ہے"۔ میں ان الفاظ کو سنکر سمجھا کہ موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ مگر یہ سوچ کر کہ مرنا برحق ہے، خیال کیا کہ چاہے جو کچھ ہو ایک دفعہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ ہی جاؤں، پھر راس کھینچے رہونگا، چمکارتا رہونگا اور تھوڑی دیر میں روک راک کر کسی نہ کسی بہانہ سے اتر پڑونگا، یہ خیال کر کے ایک دم سے ہمت کی، مڑ کر خانم کے باغ باغ چہرہ کو دیکھا تو اور بھی ہمت ہوگئی۔ پھر کیا تھا سائیس کو حکم دیا کہ "لاؤ جی ادھر لاؤ ادھر"۔ والد صاحب دیکھکر مسکرائے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میں کبھی چڑھا نہیں ہوں مگر میرے لئے گھوڑے کی سواری کو اس قدر ضروری سمجھتے تھے کہ خواہ میں گر کر مر ہی کیوں نہ جاؤں لیکن چڑھوں ضرور، بلکہ گھوڑے سے گر کر مرنے کو وہ شہادت سے کم نہ خیال کرتے تھے۔

خیر جب میں گھوڑے کے قریب پہونچا تو ایسا معلوم ہوا کہ میں میدان جنگ میں کود پڑا، گھوڑا کمبخت الگ بگڑ رہا تھا مگر میرے بدن سے جرأت کے فوارے چھوٹ رہے تھے یعنی انتہائی جرأت کے باعث سارے بدن میں پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو چمکارنے کی کوشش کی مگر منہ سے آواز نہ نکل سکی، شاید سردی کی وجہ سے! پھر کپکپائے ہاتھوں سے اُس کی باگ پکڑی، گھوڑے کے بائیں طرف کھڑا تھا، دل میں خدا کو یاد کر رہا تھا، گھوڑا بدمعاش خواہ مخواہ تھر تھرا رہا تھا، میں بیٹھنے کو ہوا، نصرٌ من اللہ کہنے سے مجھ میں ایک دم سے تمام جسم کی روحانی قوت عود کر آئی، پھر یاد آیا کہ ایک روز ایک مولوی صاحب نے وعظ کے دوران میں کہا تھا کہ ہر مہم کو بسم اللہ سے شروع کرنا چاہیئے اور جب کہیں

کوئی کام کرنا ہو تو بسم اللہ کہکر سیدھا پیر رکھے انشاء اللہ فتح ہوگی، چنانچہ بسم اللہ کہکر میں نے بھی سیدھا پیر رکاب میں رکھا، مگر پیر رکھتے ہی ادھر پیچھے سے والد صاحب اور بھائی صاحب نے بھی (جواب آگئے تھے) زور سے للکارا اور ہیں! ہیں! کرکے قہقہہ لگایا، میں بیٹھ ہی گیا ہوتا مگر گھوڑا چلدیا لہذا مجھے پیر نکالنا پڑا۔ والد صاحب ہنس ہنس کر کہنے لگے کہ "تم بالکل گدھے ہو، سیدھا پیر رکھکر کیا دُم کی طرف منہ کرکے بیٹھتے؟ گدھے کہیں کے"۔

میں نے اپنی حماقت کو محسوس کیا مگر واہ ری حاضر جوابی میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ، خواہ مخواہ آپ میرا مذاق اُڑاتے ہیں، میں تو تنگ کو دیکھتا تھا کہ کھسکتا تو نہیں ہے"۔

انھوں نے کہا "اچھا اب چڑھو، جلدی چڑھو"۔

میں نے پھر گھوڑے کو چمکارا اور بسم اللہ کہکر بایاں پیر اُس کی رکاب میں رکھا مگر پیر رکھا ہی تھا کہ وہ پھر چمکا جس پر میں نے جلدی سے پیر نکال لیا، لیکن دم بھر بعد پھر چمکار کر پیر رکھا مگر گھوڑا چلدیا اور مجھے پھر پیر نکالنا پڑا، دو تین دفعہ یہی ہوا، والد صاحب گھُڑک کر مجھ سے کہنے لگے "پاؤں میں رکاب مار کے ایک دم سے اوچھل کر پیٹھ کیوں نہیں جاتے ہو، یہ بھی کوئی بیل گاڑی ہے کہ تمہارے لئے کھڑی رہیگی" بھائی صاحب بھی لپک کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "تم بھی عجب آدمی ہو، آخر تم انتظار ہی کیوں کرتے ہو، ہلکے پھلکے آدمی ہو پیر رکھتے ہی بجلی کی طرح چمک کے غڑاپ سے زین پر بیٹھ جاؤ"۔

او ہو ہو اب تو مجھے بھی گُر معلوم ہوگیا، لاحول ولا قوۃ، میں بھی واقعی عجیب آدمی ہوں۔ یہ خیال کرتے ہی میں نے بھائی صاحب سے کہا کہ "ہٹیے مجھے چڑھنے دیجئے گا یا نہیں، میں یہ سب باتیں جانتا ہوں" میں نے یہ فقرہ زور سے کڑک کر کہا تاکہ خانم بھی سُن لیں۔

یہ کہکر میں نے بچکیاکر ہونٹھ دبا کر اور جست کرنے کی پوری تیاری کرکے بایاں پاؤں رکاب میں رکھ ہی تو دیا، مگر مشکل سے پیر رکھ پایا تھا کہ تڑپ کر بجلی کی طرح اُس پار گرا اور اس طرح اوندھے منہ گرا کہ لگام ہاتھ سے چھوٹ کر پیر میں اُلجھ گئی۔ ادھر اس موذی گھوڑے نے جو دیکھا کہ میری پیٹھ پر بجلیاں کوندگئیں تو وہ طرارہ بھر کے یہ جا وہ جا۔ میرا پیر جھٹکے کے ساتھ بلند ہوا اور اس طرح گھوما گویا میں پھرکی ہوگیا۔ .... میں کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑا بنگلہ کے احاطہ کو طے کرکے سرپٹ اُڑا جا رہا ہے، اور والد صاحب اور بھائی صاحب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہے، بھابی جان کی کیفیت تو بیان سے باہر، مارے ہنسی کے دوہری ہوگئیں، حلق میں پھندا پڑگیا۔ آنسو نکل آئے۔ خانم کی حالت البتہ قابل رحم تھی، رنج و یاس کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھیں، میں نے کہا "ہیں..... دیکھتی کیا ہو..... گرتے ہیں شہسوار ہی میدان

جنگ میں، کون گھوڑے پر سے نہیں گرتا"۔

خانم کا چہرہ ایکدم سے بشاش ہوگیا، بھابی جان کی طنز آمیز تکلیف دہ ہنسی پر وہ بگڑ کھڑی ہوئیں، جب ذرا بھابی جان کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو ہنسی کو روکتی ہوئی آئیں اور بولیں:۔

"لاؤ بہن میری شرط کے روپے"

"واہ، واہ" خانم نے کہا۔ "خوب! شرط تم ہاریں یا ہم"۔

ادھر میں نے کہا کہ "اگر اتفاق سے گھوڑا اکھڑ کر نکل جائے تو کوئی کیا کرے"۔ اس کے بعد میں نے دنیا کے مشہور شہسواروں کے گرنے کے واقعات بیان کرنا شروع کئے، اور والد صاحب اور بھائی صاحب کے گرنے کے بھی واقعات بتلائے تو بھابی جان تو کیا قائل ہوتیں ہاں خانم کو البتہ اطمینان ہوگیا اور دونوں میں بڑے لطف کی حجت ہونے لگی۔ ایک طرف بھابی جان کہتی تھیں کہ میری شرط کے روپے مار لئے اور قسمیں کھاتی تھیں، دوسری طرف خانم یہی کہتی رہیں کہ میری شرط کے روپے تم کو ہضم نہ ہونگے۔

بھابی جان پھر شرط لگانے کہتی ہیں مگر میں نے خانم سے کہہ دیا ہے کہ جب تک پہلی شرط کے روپے ادا نہ ہو جائیں تم ہرگز ہرگز شرط نہ بدنا، اور میں دعا مانگتا ہوں کہ خدا نہ کرے بھابی جان کبھی شرط کے روپئے ادا کریں۔

بہر صورت میں بھی ایک دفعہ گھوڑے پر چڑھا ہوں، کب اور کس طرح، یہ آپ نے خود دیکھ لیا۔

عمدۃ القواعد

مؤلفہ مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری۔ کراون سائز۔ ۲۵۵ صفحات۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: مطبع انوار احمدی، الہ آباد

گزشتہ چند سال میں اُردو زبان کی متعدد قواعد لکھی گئیں جن میں مولوی عبدالحق بی۔اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو کی قواعد بہت مشہور و مقبول ہوئی مگر اُردو زبان جس تیزی سے ترقی کر رہی ہے اس کی بنا پر قواعد میں ترمیم و تنسیخ بھی لازمی ہے اور ہر زبان کا یہی قاعدہ ہے کہ ایک مدت کے بعد قواعد میں ترمیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھکر یہ قواعد مرتب کی گئی ہے جا بجا مستند شعرا کے اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے اور مختلف فیہ مسائل کے متعلق دہلی اور لکھنؤ کے استعمال کو یکجا کر دیا ہے اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی لکھدیا ہے کہ آجکل کسکو زیادہ ترجیح ہے۔ چونکہ اس قواعد سے دوسرے شایقین کے علاوہ زیادہ تر طلبہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اس لئے اصطلاحات قواعد کے انگریزی مترادف بھی بریکٹ میں درج کر دئے گئے ہیں۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ قواعد مکمل و مفید معلوم ہوتی ہے۔

تنقید کتب

مرقع دہلی از نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ خانِ دوران مرحوم۔ رائل سائز حجم تقریباً ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ؎۔

ملنے کا پتہ: مہتمم خزینۂ یوسفیہ، ڈیوڑھی نواب مستقیم الدولہ مرحوم۔ چھتہ بازار، حیدرآباد دکن۔

نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ حضرت مغفرت مآب نظام الملک آصف جاہ اول کے دربار کے ایک رکن خاص تھے اور حضرت مغفرت مآب کے ہمراہ ۱۱۵۱ھ میں دہلی تشریف لے گئے تھے۔ اس کتاب میں نواب مرحوم نے دہلی کے معاشرتی و تمدنی حالات، مجالس و محافل وغیرہ کا مختصر تذکرہ ایک دلکش انداز میں تحریر فرمایا تھا جس کے مطالعہ سے اب سے دو صدی پہلے کی دہلی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں علما و مشائخ، شعرا و رؤسا، قوال و مرثیہ خواں، مشاعرے اور جلسے، ارباب نشاط وغیرہ سب کا ذکر ہے۔ زبان فارسی ہے مگر سلیس و شگفتہ، انداز تحریر دلکش و موثر ہے۔

کتاب کے شروع میں حکیم سید مظفر حسین حیدرآبادی نے ایک بسیط مقدمہ اردو میں لکھا ہے جس میں نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں کے ذاتی و خاندانی حالات، مراتب و مناصب نیز تذکرۂ ہٰذا کے محاسن پر قابل قدر تبصرہ کیا ہے۔ واقعی یہ تذکرہ اہل بینش و ذوق کے لئے نہایت دلچسپ ہے۔ فارسی زبان کا مذاق رکھنے والے حضرات کو یہ تذکرہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ مصنف تذکرہ اور ان کے خاندان کے دوسرے چند بزرگ نیز باغ و مقبرہ وغیرہ کی نو تصویریں بھی کتاب کی ظاہری زینت کو بڑھا رہی ہیں۔

فروغ بیان از جناب شاد صابری، کراؤن سائز۔ ۱۲۴ صفحات۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: حضرت مصنف (اوورسیر میونسپلٹی) کراچی

حضرت شاد موجودہ زمانہ کے ان سخنوروں میں ہیں جو قدیم طرز سخن کے ساتھ جدید رنگ میں بھی

شعر کہتے ہیں۔ آپ صوبہ متحدہ کے باشندے ہیں اور فن شعر میں مولانا غریب سہارنپوری مرحوم اور حضرت افسر صدیقی امروہوی کے شاگرد ہیں۔

فروغ بیان شاد صاحب کے کلام کا ایک دلکش مجموعہ ہے جس میں غزلیات، رباعیات، قطعات کے علاوہ جدید طرز کی دس نظمیں بھی ہیں۔ شروع میں مولانا قمر بدایونی کا لکھا ہوا ایک مختصر مگر لطیف مقدمہ ہے اور مصنف کی تصویر بھی شامل مجموعہ ہے۔ جہانتک غزلیات کا تعلق ہے شاد صاحب کا کلام سادہ و موثر معلوم ہوتا ہے۔ البتہ نظموں میں دلکشی کسی قدر کم نظر آتی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ کلام درج ذیل ہیں:

سعیِ لاحاصل بھی قسمت سے مجھے حاصل نہیں — وائے بدبختی کہ علم دوریِ منزل نہیں
اے غمِ پنہاں الٹ دے پردۂ سوزِ دروں — شمعِ در فانوس وجہِ گرمیِ محفل نہیں
پوچھتی ہیں عشق سے اکثر مری مایوسیاں — اے تموّج خیز دریا کیا ترا ساحل نہیں
حُسن میں موجود ہے پیرایۂ دلبستگی — قابلِ عنواں مگر ارمانِ اہلِ دل نہیں
منزلِ مقصود ہے ہر منزلِ راہِ طلب — دامنِ رہرو پہ داغِ حسرتِ منزل نہیں
ہوشیار بیخودی کو عقل دیتی ہے سبق — واقفِ معنی نہیں اپنے سے جو غافل نہیں

شاد تھک کر بیٹھنے کا قصد جب میں نے کیا
شوق نے بڑھکر ندا دی یہ تری منزل نہیں

باخبر ہوں ہستیِ موہوم کے انجام سے — صبح کا آغاز ہوتا ہے سوادِ شام سے
چھوڑیئے یا قید کیجیے آپ خود مختار ہیں — میں وہ مجرم ہوں جسے مطلب نہیں انجام سے
کائناتِ باغِ عالم ہو اسیرِ ذوقِ دید — کاش واقف ہو کوئی حالِ اسیرِ دام سے
اب مرا حسنِ نظر تصویر خلوت خانہ ہے — بے حجابی اُٹھ چکی ہے جلوہ گاہِ عام سے

شاد یہ سمجھو مآلِ خلقتِ دنیا و دیں
انجمن کی انجمن موسوم ہے اِک نام سے

کلام جوہر

از رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم۔ چھوٹا سائز ۱۵۶ صفحات۔ قیمت ۸/
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

یہ مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں دردِ دل اور جوش و خروش پورے طور پر موجود ہے۔ شروع میں مولانا عبدالماجد بی۔ اے۔ دریابادی کا لکھا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ مولانا مرحوم کے

کلام کا ایک مختصر مجموعہ پہلے بھی شایع ہوا تھا مگر اس مجموعہ میں ابتدائی اور آخری زمانہ کا قریب قریب کل کلام موجود ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

اسکو کیا خوفِ رہِ ظلمات ہے — جس کی رہبر خود خدا کی ذات ہے
قیدِ تنہائی کا لذت آشنا — کیسے کہدوں تارکِ لذات ہے
دل سے ہوتی رہتی ہیں سرگوشیاں — اب یہی اک مشغلہ دن رات ہے
قیدِ تنہائی میں بھی چھوڑا نہ ساتھ — نفس موذی بھی بڑا بدذات ہے

مستحقِ دار کو حکم نظربندی ملا — کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہگئی

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ — اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشق نا تمام کی بتلاؤں سرگزشت — دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

اے دل تجھی کو صبر جو پروردگار دے — تکلیف کیوں یہ کشمکش انتظار دے
ہم اسکے ہولئے تو پھر اب اس سے کیا غرض — وہ جیت اپنی فوج کو دے یا کہ ہار دے
تو کس خیال میں ہے یہ وہ عشق ہی نہیں — لے بوالہوس جو فرصت بوس و کنار دے
دے نقدِ جاں تو بادہ کو ثر ابھی ملے — ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے اُدھار دے
کٹتی ہے شغلِ عشق میں پل بھر میں عمرِ خضر — یہ دن ہی کیا ہیں قید کے ایدل گزار دے
رہرو تھا راہِ عشق کا منزل کو پا لیا — اب اور کیا نشان مری لوحِ مزار دے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ماہتاب

(از لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی)

یہ کس لئے برجِ زمرّد سے منہ نکالا ہے ۔ ہر اک طرف شبِ تاریک میں اُجالا ہے
شرابِ نور اُبل آئی آفتابے سے ۔ تجلیوں کا سمندر بہا قرابے سے
تڑپ اُٹھا اثرِ چشمِ مستِ ساقی سے ۔ چھلک گیا ہے جو پیمانہ دستِ ساقی سے
چمک ہے ماہ سبک سیر کی سواری میں ۔ چھپا ہوا ہے کوئی بدر کی عماری میں
مگر ہے لیلےٰ شب کا محافہ سیمیں ۔ دکھا رہا ہے جھلک اپنی کوئی پردہ نشیں
اُبل پڑا ہے شب آتے ہی چشمۂ پر جوش ۔ ہر ایک چیز زمانے کی ہے تجلی پوش
ہزار نقش طراز جہاں حجاب میں ہے ۔ فروغِ رُخ کا اثر کشتِ ماہتاب میں ہے
چڑھا ہے ایک روپہلا ورق زمانے پر ۔ برس رہا ہے تجلی کا ابر خوش منظر
لباس نور کا پہنے ہوئے ہے پیاری رات ۔ سحر کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے ساری رات
کوئی حسین ہے مصروف دشت گردی میں ۔ ترنجِ نور ہے یا طشتِ لاجوردی میں
تجلیوں سے زمانہ ہوا ہے مالا مال ، ۔ بغور دیکھ یہی ہے مآلِ کسبِ کمال
یہ عکس جب ہے تو وہ محوِ ناز کیا ہوگا ۔ یہ آئینہ ہے تو آئینہ ساز کیا ہوگا
دکھا رہا ہے گل یوسف اپنی تابانی ۔ چمک اُٹھا ہے جو دامانِ پیر کنعانی
ہر اک طرف سرو سامانِ ناز پھیلایا ۔ سمٹ کے نور نے دامانِ ناز پھیلایا
یہ کس کی ضو سے ستاروں کی بزم تاباں ہے ۔ یہ کون شاہدِ زیبائے گوہرستاں ہے
کہاں سے پھول یہ آیا ہے دستِ گلچیں میں ۔ یہ کس نے شمع جلائی رواقِ رنگیں میں
روائے نور ہے اور بزمِ عالمِ اسباب ۔ زمانہ اوڑھے ہوئے سر سے چادرِ مہتاب
یہ وقت اور مرا شیشہ و سبو خالی ۔ سنوں زمانے سے آوازِ اشربوا خالی

ہر ایک بحر میں غوطے لگائے ماہِ تمام
مگر نہ ہو تو نہ ہو غرقِ بادۂ گلفام

مستقبلِ دہر

از بابو شیام موہن لال جگر بریلوی، بی۔اے۔

جب بگڑنے لگا جہاں کا نصیب — پھیلی دنیا میں مغربی تہذیب
مادّیت کا زہر پھیل گیا — عظمتِ روح کی ہوئی تخریب
دین و اخلاق ہو گئے برباد — نفس مانا گیا عمل کا ادیب
ہو گئیں بے حجابیاں مطبوع — رقصِ عریاں تھا زینتِ تہذیب
اس پہ قہرِ خدا ملوکیّت — چیرہ دستی بڑھی بعید و قریب
اہلِ سرمایہ نے کئے وہ ظلم — آ گئے تنگ زندگی سے غریب
ٹھہرے سامانِ امن توپ و تفنگ — رزم سے بزم کی ہوئی ترتیب
جنگ سمجھی گئی بنائے بقا — یہ بھی منطق ہے کیا عجیب و غریب
رفتہ رفتہ ہوا جہاں تاریک — نظر آتا تھا یومِ حشر قریب

روحِ عالم کی بے قرار ہوئی
حالتِ جنگ، ناگوار ہوئی

ہوئے اصلاح کے ہم ساماں — پھر چمکنے لگا نصیبِ جہاں
پھر تجلّی ہوئی زمانہ میں — ہوا خورشیدِ ہند میں تاباں
مٹیں گمراہیاں جہالت کی — پھر ہوا خضرِ راہ ہندستاں
آئے دنیا میں حضرتِ گاندھی — ولیٔ پوشیدہ ظاہر الشاں
سادگی راستی ہے جن کا ضمیر — اور اہنسا ہے جن کی روحِ رواں
جن کا ایمان نیاز و خدمتِ خلق — جن کا مذہب محبتِ انساں
مسلکِ زیست جن کا راست روی — اور تہذیبِ نفس مایۂ جاں

جن کے خدمات و جہد ناز عمل | اور اعمال زینتِ دوراں
نازشِ دہر و فخرِ عالم ہے | آج یہ ہستیٔ عظیم الشاں

فیضِ گاندھی تمام جاری ہے
پرتوِ حق کی جلوہ باری ہے

دہر میں انقلاب آئیگا | آئیگا اور شتاب آئیگا
ورقِ حال الٹ گیا یعنی | اب کوئی تازہ باب آئیگا
ظلمتیں دور ہونگی عالم کی | چرخ پر آفتاب آئیگا
مقصدِ زیست ہوگا راست روی | کج روی سے حجاب آئیگا
ہوگی آخر شکست باطل کو | اور حق فتحیاب آئیگا
آہِ مظلوم مستجاب ہوئی | ظالموں پر عتاب آئیگا
انتزاعِ ملوکیت ہے قریب | دورِ راحت مآب آئیگا
ہوگا حاصل سکونِ قلب و جگر | ختم پر اضطراب آئیگا
غیب سے لطفِ زیست کا ساماں | بیحد و بے حساب آئیگا

ہم نئے ہونگے اور نیا عالم
زندگی ہوگی راحتِ پیہم

عشق

(از سید احمد اللہ قادری نایب ایڈیٹر رسالہ "تاریخ")

تیرے جلوے فطرت کونین میں روپوش ہیں | تیرے نغمے نبض کی جنبش سے ہم آغوش ہیں
تیری آبادی میں اِک دنیائے آباد ہے | کچھ دلوں مسرور ہے اور کچھ دلوں ناشاد ہے
زندگی اور موت لذت میں تری مستور ہیں | تجھ پہ مرمٹنے کو ساری فطرتیں مجبور ہیں
تو سراپا سوز بھی ہے اور ساز انگیز بھی | تو ہے لذت بخش بھی تو ہے مصیبت خیز بھی

تو وہ منزل ہے جہاں کوئی سنبھل سکتا نہیں
ابلقِ شام و سحر اس رہ میں چل سکتا نہیں

فلسفۂ حیات

از جناب برق دہلوی، بی۔ اے

تجھے نخل بندِ حیات نے تری کاوشوں کے یہ پھل دیے ۔ کیا خلق باغِ جہاں میں جب تو ثمر بھی حسبِ عمل دیے

کوئی ڈھونڈے لیکے چراغ بھی، نہ ملے گا کوئی سُراغ بھی ۔ کہیں اُن کا نام و نشاں نہیں جو عدم کو قافلے چل دیے

نہ بہارِ خندۂ گل ہے اب، نہ وہ دَورِ ساغرِ مُل ہے اب ۔ نہ وہ باغ ہے، نہ وہ میکدہ کہ خزاں نے رنگ بدل دیے

یہ طلسم خانۂ دہر ہے وہ نظر فریب کہ قہر ہے ۔ ہمیں کیا حیاتِ دو روزہ دی جو ہزار اسمیں خلل دیے

جو مآلِ کار یہ ہے نظر، دل و جاں سے خدمتِ خلق کر ۔ کہ یہ عقل و ہوش یہ دست و پا تجھے بہرِ حسنِ عمل دیے

یہ غرورِ حسن یہ بیرخی، یہ رمیدگی یہ کشیدگی ۔ کبھی مل گئے سرِ راہ بھی تو نگاہ پھیر کے چل دیے

یہ رَوا روی کا مقام ہے یہ اجل کا شیوۂ عام ہے ۔ جو لباسِ زیست کُہن ہوئے تو وہ دم زدن میں بدل دیے

جو کسی نے ہمتیں صرف کیں تو دلی مرادیں اُسے ملیں ۔ جو شکم میں خاک کے تھے نہاں وہ دفینے اُسنے اُگل دیے

یہ گلہ ہے ربِّ کریم سے، ملا کچھ نہ فیضِ عمیم سے ۔ جو دیے ہیں چند نفس ہمیں وہ برائے نذرِ اجل دیے

مرے قلب پر جو یہ داغ ہیں، نکر انکو گل یہ چراغ ہیں ۔ مری جان شوق سے لے مگر نہ بجھا یہ بادِ اجل دیے

نہ غرض متاعِ جہاں سے کچھ نہ ہمارا مال ہے نقدِ جاں ۔ تہی دست آئے تھے ہم یہاں تہی دست دہر سے چل دیے

تو ہی شش جہت میں ہے ضوفشاں نہیں ماسوا کا کہیں نشاں ۔ پسِ پردہ ہو کے عبث نہاں یہ فریبِ حسنِ ازل دیے

یہی برق چرخ سے ہے گلہ ہمیں گردشوں نے مٹا دیا
جو ہمارے روزِ نشاط تھے وہ شبِ الم سے بدل دیے

لطفِ سخن

(از لسان الملک جناب صفی لکھنوی)

تو بھی مایوسِ تمنا مرے انداز میں ہے
جب تو یہ درد پپیہے! تری آواز میں ہے

شوخیِ حُسن حسینوں کے ہر انداز میں ہے
کبھی چِتون میں کبھی پردۂ آواز میں ہے

اُف رے ناسازیِ دل گو کہ زمانہ گزرا
ضعف اب تک وہی ڈوبی ہوئی آواز میں ہے

کعبۂ دل کا ہمارے ہے خدا ہی حافظ
اختیارِ صنمِ خانہ بر انداز میں ہے

بُلبلیں شور مچائیں نہ چمن میں کہدو
بسترِ گل پہ کوئی خوابگہِ ناز میں ہے

نو اسیرانِ چمن کے کوئی دل سے پوچھے
وہ اذیت جو شکستِ پرِ پرواز میں ہے

دیکھ یوں تھک کے نہ بیٹھ اے دلِ حسرت انجام
قدمِ سعی ابھی سرحدِ آغاز میں ہے

کہیئے یہ رمز و کنایات کوئی کیا سمجھے
اُن کی جو بات ہے وہ سلسلۂ راز میں ہے

کوئی آزاد ہے لذت کشِ گلگشتِ چمن
کوئی محبوسِ قفس حسرتِ پرواز میں ہے

بے خطا کون ہوا ہے ہدفِ ناوکِ ظلم
ایک رعشہ سا کمانِ قدر انداز میں ہے

اسے خاموش ہی رہنے دو صفی کیوں چھیڑو
اثرِ سوزِ تپِ غمِ دلِ ناساز میں ہے

(از بابو ہر گوبند دیال سریواستو نشتر)

ہمصفیرو رہنے دو افسانۂ ابرِ بہار
آپ ہی دیوانہ ہے دیوانۂ ابرِ بہار

ایک مدت سے قفس کی زندگی ہے اور ہم
کیا سُناتے ہو ہمیں افسانۂ ابرِ بہار

جب تصور بندھ گیا اُس کا وہیں مخمور ہیں
میکشوں کے ساتھ ہے میخانۂ ابرِ بہار

دَیر سے مطلب نہ کچھ ہم کو حرم سے واسطہ
ہم تو ہیں بس ساجدِ بتخانۂ ابرِ بہار

دیکھیے گلشن کی سرسبزی و شادابی کا رنگ
پتّی پتّی کہتی ہے افسانۂ ابرِ بہار

ایک دن وہ تھے کہ ہم تھے اور چمن کی سیر تھی
اب تو ہم ہیں اور فقط افسانۂ ابرِ بہار

اب تو نشتر کو جہاں دیکھا کہ سب کہنے لگے
لیجئے وہ آگیا دیوانۂ ابرِ بہار

(مسٹر وشیشر پرکاش بھٹناگر رعنا سکندر آبادی)

جفا پر وہ جفا، بیداد پر بیداد کرتا ہے
ستم ایجاد ہے، ہر دم ستم ایجاد کرتا ہے

کہوں کیا کس طرح رہ رہ کے وہ بیداد کرتا ہے
کبھی آباد کرتا ہے، کبھی برباد کرتا ہے

زمانے نے کسی کو اس طرح مٹتے نہیں دیکھا
مجھے جو چاہتا ہے ہر طرح برباد کرتا ہے

دلِ حسرت زدہ کی خو سے تم واقف نہیں شاید
یہ اپنے بھولنے والے کو اکثر یاد کرتا ہے

قفس میں روز رکھ دیتا ہے کچھ تنکے نشیمن کے
کرم کی شکل میں مجھ پر ستم صیاد کرتا ہے

مرے آتے ہی چھوڑی زمزمہ سنجی اسیروں نے
مجھے صیاد اس الزام میں آزاد کرتا ہے

وفا کا ہے اثر یا ضبط کی تاثیر ہے رعنا
کہ مجھ کو وہ ستمگر ہر جفا پر یاد کرتا ہے

(قاضی اختر جوناگڈھی)

نکلے وہ بزمِ ناز سے منہ اپنا پھیر کر
گردن پہ اپنی خونِ تمنا لئے ہوئے

آغازِ عشق سے ہوئی اپنی نمود و بود
آئے ازل سے ہم دلِ شیدا لئے ہوئے

یہ دل جلوں کی آہِ شرربار کا اثر
ہے داغ دل پہ لالۂ صحرا لئے ہوئے

موسیٰ کی طرح محوِ نظارہ ہوں میں ادھر
وہ ناز سے اُدھر یدِ بیضا لئے ہوئے

ایمن کی وادیوں میں ابھی ہے شرارِ برق
آئے تو کوئی شوقِ تمنا لئے ہوئے

اسرارِ کائنات کو اختر وہ پا سکے
آئے یہاں جو دیدۂ بینا لئے ہوئے

از جناب سرشار (خیرپور سادات)

وہ شمع ہوئی روشن وہ آ گئے پروانے
آغاز تو اچھا ہے انجام خدا جانے

یہ محفلِ عشرت کا انجام ہے دیوانے
اجڑی ہوئی محفل ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے

یا آپ ہی آ جاتے یا دم ہی نکل جاتا
رکھا نہ کہیں کا بھی اس وعدۂ فردا نے

دولت سے قناعت کی گر دل کو غنی کر لے
رسوائی سے در در کی کیوں خاک کوئی چھانے

جذبات کی دنیا نے طوفان اُٹھایا ہے
مرنے کی ضرورت نے جینے کی تمنا نے

یاد آتے ہیں رہ رہ کر تڑپاتے ہیں رہ رہ کر
وہ عشق و محبت کے بھولے ہوئے افسانے

جو عشق میں مرتے ہیں موت اُن کو نہیں آتی
سمجھا ہی نہیں ابتک اس راز کو دنیا نے

سرشار محبت کے آئین نرالے ہیں
فرزانے ہیں دیوانے دیوانے ہیں فرزانے

علمی خبریں اور نوٹ

گذشتہ مئی میں ہند کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کی عمر کے ستر سال ختم ہو گئے ہیں، چنانچہ اس مبارک واقعہ کے اعزاز میں بابو راما نند چٹرجی ایڈیٹر ماڈرن ریویو کی ایڈیٹری اور مہاتما گاندھی موسیو رومان رولینڈ سر جے۔ سی۔ بوس، پروفیسر البرٹ السٹین اور موسیو کاسٹی پلاسس کی سرپرستی میں "ٹیگور کی سنہری کتاب" کے نام سے ایک مہتم بالشان یادگاری مجموعہ زیر طبع ہے۔ جس میں ٹیگور کے متعلق برطانیہ۔ فرانس۔ اسپین۔ اٹلی پولینڈ۔ روس۔ سویڈن۔ ترکی۔ امریکہ۔ افریقہ۔ آسٹریا۔ عراق۔ مصر۔ لنکا۔ برما۔ چین۔ جاپان۔ جاوا۔ غرض تمام مہذب دنیا کے مشاہیر اہل قلم اور اہل الرائے اصحاب کے مضامین درج ہونگے حجم تقریباً چار سو صفحات ہوگا اور ہندوستان۔ چین و جاپان کے مشہور مصوروں نے اس کے لئے خاص تصویریں اور مرقع بنائے ہیں خود شاعر اعظم کے مختلف نئے فوٹو اس میں ہدیۂ ناظرین ہونگے۔ غرض لکھائی چھپائی، مضامین ہر اعتبار سے یہ ایک نادر مجموعۂ مضامین ہوگا۔ قیمت اٹھارہ روپیہ تجویز کی گئی ہے۔ غالباً اس ماہ کے آخر تک شائع ہو جائیگی۔

بنارس یونیورسٹی کے نامور بانی پنڈت مدن موہن مالویہ صاحب کی ستترھویں سالگرہ کی تقریب میں بھی دار العلوم بنارس کے اہتمام سے اسی قسم کا ایک یادگاری مجموعہ زیر طبع ہے جو ممدوح کی خدمت میں آیندہ بسنت پنچمی کو جو یونیورسٹی مذکور کی سالگرہ کا دن ہے پیش کیا جائیگا۔ اس مجموعے میں بھی ملک کے ہر قوم اور ہر جماعت کے مشاہیر نے مضامین لکھے ہیں۔

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی ہر سال اردو ہندی پنجابی زبان کی بہترین تصانیف کے صلہ میں بیش قرار انعامات دیا کرتی ہے سنہ ۱۹۳۰ء کی اعلیٰ تصانیف کے جن مؤلفوں اور مصنفوں کو انعامات تقسیم کئے گئے ہیں انکے نام نامی یہ ہیں

مولوی فیروز الدین شرف مصنف "سنہری کلیاں"	مبلغ ۷۵۰	روپیہ
پروفیسر سری کانت شاستری ایم۔ اے۔ ایچ۔ او۔ ایل	" ۷۵۰	"
لالہ موہن لال جیٹھی، ایم۔ ایس۔ سی ہوشیار پوری	" ۵۰۰	"
خانصاحب مولوی فیروز الدین اینڈ سنز لاہور پبلشر فیروز اللغات فارسی	" ۵۰۰	"
مسٹر کے۔ ایل۔ رلیارام مصنف "موسیقی ہند"	" ۵۰۰	"

پنڈت رام نریش صاحب ترپاٹھی کئی سال سے نہایت عرقریزی کے ساتھ صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع کے عام ہندی گیتوں کو یکجا کر رہے ہیں۔ آپ کی پانچ سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہندی مندر الہ آباد نے اِن گیتوں کا قابل قدر مجموعہ شائع کیا ہے۔ ان گیتوں سے ملکی رسم و رواج اور عوام کے خیالات پر غیر معمولی روشنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ اہل بصیرت ان کی قدر کر رہے ہیں مسٹر شیرف کلکٹر مراد آباد نے ان میں سے بعض گیتوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے اور انگریز صاحبان قدیم انگریزی اور اسکاچ گیتوں سے انکا مقابلہ کر رہے ہیں۔

مزارِ انیس کی مرمت کا مسئلہ عرصہ سے چھڑا ہوا ہے، مگر ابھی تک اسکا خاطر خواہ حل نہیں ہو سکا مولانا محمد علی مرحوم نے بھی اس کی کوشش کی تھی اور شاید کچھ چندہ بھی جمع کیا تھا مگر اسکی تکمیل انکی حیات میں نہ ہو سکی، اب بعض سرفراز لکھنؤ نے قدردانانِ انیس سے مالی امداد کی اپیل کی ہے۔ قریب ساڑھے تین سو روپیہ جمع بھی ہو چکا ہے، کیا اچھا ہو کہ انجمن ترقیِ اردو اس کام کو اپنے ذمہ لیلے یا سرپرستانِ اردو مثلاً سرکار نظام نواب صاحب رامپور یا نواب صاحب بھوپال میں سے کوئی اس طرف توجہ فرما کر ضروری سرمایہ کا انتظام کرے۔

پچھلے دنوں گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال بھی انگلستان تشریف لے گئے تھے، چنانچہ لندن کے ادبی حلقوں نے انکی بہ حیثیت شاعر اچھی خاصی عزت افزائی کی۔ "اقبال ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک جدید علمی انجمن بھی آپ کی تشریف آوری کی یادگار میں قائم ہوئی۔ آپ کے خیر مقدمی جلسہ میں منجملہ دیگر اصحاب کے مہاتما گاندھی، سر آغا خاں، مسز سروجنی نیڈو اور مسٹر عبداللہ یوسف علی وغیرہ شریک تھے۔

لندن میں ڈاکٹر اقبال نے ایک ملاقات کے دوران میں فرمایا کہ اب انھوں نے اردو میں شعر کہنا ترک کر دیا ہے اور اسلامی دنیا کی خاطر آیندہ صرف فارسی زبان میں اپنے شاعرانہ خیالات و جذبات کو قلمبند کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اہل ملک علمی حیثیت سے کئی سال سے اس فیصلہ سے واقف ہیں تاہم وہ اس پر اپنے افسوس اور مایوسی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ اردو کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ جو لوگ اسکی توسیع و ترقی مین سب سے نمایاں حصہ لے سکتے ہیں وہ اسکے ساتھ انتہائی سرد مہری کا برتاؤ کرتے ہیں ڈاکٹر ٹگور نے شروع سے ابتک بنگالی زبان ہی کو اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اسی زبان میں انکی بہترین تصانیف ہیں اور دنیا کی جن جن زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے ہیں وہ سب بنگالی زبان سے کئے گئے ہیں مگر ڈاکٹر اقبال اردو کو اپنی شاعری کے قابل نہیں سمجھتے ہیں۔ افسوس!

ہندوستانی اکیڈیمی کی تیسری ادبی کانفرنس مارچ سنہ ۱۹۳۲ء میں الہ آباد میں منعقد ہونیوالی ہے۔ اس

کانفرنس میں اردو ہندی ماہرینِ ادب کو ان زبانوں کے وسائل ترقی پر تبادلۂ خیال کرنے اور مختلف مباحث اور موضوعات علمی پر مضامین پڑھنے یا تقریر کرنے کی دعوت دیگئی ہے، مفصل پروگرام بعد کو شائع ہوگا۔

سال ڈیڑھ سال سے ہمارے مکرم مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی فنِ تنقید کے متعلق ایک اہم کتاب لکھ رہے تھے، شکر ہے کہ اب وہ ختم ہوگئی ہے اور انشاء اللہ مارچ آئندہ تک شائع ہوجائیگی، اسکا نام نقد الادب تجویز کیا گیا ہے

"صحیح نستعلیق ٹائپ" کے نام سے مسٹر ایس۔ ایچ۔ قریشی صاحب (پوسٹ نمبر ۷، ۴ بمبئی) نے ایک نستعلیق ٹائپ مکمل کیا ہے، جسکی نسبت اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ حیدر آباد کے نوایجاد سرکاری ٹائپ سے بھی زیادہ مکمل اور خوبصورت ہے۔ آپ نے ہمارے پاس اس کے بعض نمونے بھی بھیجے ہیں۔ جن صاحبوں کو اُردو ٹائپ سے دلچسپی ہو وہ آپ سے پوسٹ بکس نمبر ۷، ۴ بمبئی کے پتے سے خط وکتابت کریں۔ آپ نے تجارتی اغراض کے لئے اس ٹائپ کو کافی مقدار میں ڈھلوا لیا ہے اور ضرورتمند اصحاب کی فرمائشیں پوری کرنے کا انتظام بھی کر لیا ہے۔

حال میں جرمنی کے مشہور فلسفی وشاعر گوئٹے کے مشہور ڈرامے فاسٹ کا ترجمہ اُردو نثر میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ جس کے شروع میں جرمن لٹریچر، گوئٹے کے سوانح حیات اور شاعرانہ کمال پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کے اہتمام سے شائع ہوگیا ہے

حال میں منشی پریم چند صاحب کا ایک طولانی ناول "پردۂ مجاز" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس طرف "غبن" نام سے ہندی میں بھی آپ کا ایک ناول طبع ہوا ہے۔

ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے اس سال بھی اردو وہندی کی بہترین تصانیف نظم ونثر کے صلے میں پانچ پانچ سو روپے کے چار انعامات دینا تجویز کئے ہیں، دو انعامات ہندی کتابوں کے لئے اور دو انعامات اردو کتابوں کے لئے منظور کئے گئے ہیں۔ نثر کی انعامی کتاب کا موضوع دماغی اور اخلاقی سائینس ہونا چاہیئے نظم کے لئے کوئی خاص قید نہیں رکھی گئی ہے مگر نظم ونثر دونوں مصنفین کی طبعزاد ہونا چاہیئے۔

نظم کے لئے طولانی مسلسل نظم کے علاوہ ایک ہی مصنف کی مختلف نظموں کے مجموعے بھی مقابلے میں شریک کئے جائیں گے۔

مقابلے میں شریک ہونے کے لئے مصنف حضرات کو اپنی کتابوں کی سات سات جلدیں ۲۶ اگست ۱۹۳۲ء سے قبل جنرل سکریٹری صاحب ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی خدمت میں بھیجنا چاہیئے۔

آخری ہفتہ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں نامور ادیب وفلسفی مرزا رسوا لکھنوی کی وفات حسرت آیات سے اُردو ادب کو جو نقصانِ عظیم پہونچا ہے اسکی تلافی ناممکن ہے۔ شاعری، افسانہ نگاری، ترجمہ وفلسفہ غرض ہر صنفِ ادب میں

مرحوم کو جو کمال حاصل تھا اسکی مثال ڈھونڈھے سے بھی کہیں نہ مل سکیگی۔ کئی سال سے آپ علالت کے باعث بہت کچھ معذور و مجبور ہو چکے تھے تاہم موت سے غالباً دو تین دن قبل تک آپ جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ کی خدمات انجام دیتے رہے پچھلے اکتوبر کے وسط میں راقم الحروف کو نستعلیق ٹائپ کمیٹی کے سلسلہ میں حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ ایک دوست کی ہمراہی میں مرزا صاحب مرحوم کی خدمت میں بھی کئی دفعہ حاضری کی نوبت آئی، مرزا صاحب علیل تھے اور ہر دفعہ اُن کو دیکھکر یہی خیال دل میں آتا تھا کہ اب یہ صورت دیر تک قائم رہنے والی نہیں ہے، چنانچہ صاحب مرحوم کے گردوپیش جو احباب واعزا تھے اُن سے آپکے فوٹو کا انتظام کرنے اور سوانحی حالات لکھنے کی بار بار استدعا کی گئی۔ ان حضرات نے اسوقت تو از راہِ لطف وکرم بڑے بڑے وعدے کرلیے لیکن ان کی تکمیل تک ان صاحبوں کو موقع نہیں ملا۔ افسوس اب یہ کامل الفن ادیب ہمیشہ کیلئے ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا، مگر اردو کی جو اہم خدمات مرحوم اپنی زندگی میں انجام دےگئے ہیں انکا احسان قدردانانِ ادب پر ہمیشہ قایم رہیگا اور انکی تصانیف انکے نام نامی کو زندۂ جاوید بناوینگی۔ آپکا ناول امراؤ جان ادا اُردو کا ایک بہترین ناول ہے۔ "شریف زادہ" بھی ایک بہترین افسانہ ہے جسکا ہر صفحہ ہمیشہ نوجوانانِ ملک کیلئے چراغ ہدایت کا کام دیگا۔ مرزا صاحب جس کامیابی سے روزمرہ کے معمولی معمولی واقعات زندگی قلمبند کرسکتے تھے اسی خوبی و خوش اسلوبی سے ادق فلسفانہ مضامین پر عالمانہ بحث کرسکتے تھے۔ آپکی زندگی ہمت مرواں مدد خدا کی صداقت کا علمی نمونہ تھی۔ عربی فارسی میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ کو انگریزی علم ادب سے واقفیت حاصل کرنے کا خیال آیا تو آپ نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند بھی حاصل کرلی۔ زبان اُردو کے آپ بہت بڑے ماہر تھے۔ فلسفہ کے ادق سے ادق مباحث کو دلنشین پیرائے اور سلیس زبان میں ادا کرنے میں آپکو ید طولیٰ حاصل تھا۔ سیرت نگاری میں آپکو خاص کمال حاصل تھا۔ صاف، سلیس اور بامحاورہ اُردو کے آپ مالک تھے۔ نظم میں آپ حضرت اوج کے شاگرد اور غالب کے پیرو تھے۔ آپکی شاعری بیجا تصنع اور فضول مبالغہ سے پاک نیچر کے مطابق ہوتی تھی۔ آپکی خاص تصانیف میں مثنوی نو بہار، امید وبیم، خونِ عاشق، شریف زادہ، ذات شریف، امراؤ جان ادا، خاص طور پر مشہور ہیں۔ دار الترجمہ کی سرپرستی میں آپنے بعض ادق کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا، لیکن اس خدمت سے طبعزاد اور یخیل تصانیف کا سلسلہ بالکل ختم ہوگیا۔ افسوس موت نے اس خدمت کو بھی قائم نہ رہنے دیا۔

خوشی کا مقام ہے کہ خطابات سال نو کے سلسلہ میں گورنمنٹ ہند نے ہمارے دیرینہ کرمفرما منشی ابن علی صاحب ایڈیٹر نیر اعظم مراد آباد کو "خانصاحب" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ خدا کرے موصوف کو یہ عزت مبارک ہو۔

تصاویر اس نمبر کی رنگین تصویر عہد مغلیہ کی اٹھارھویں صدی کی مصوری کا ایک دلکش نمونہ ہے انکی اصل برٹش میوزیم میں ہے دوسری تصویر مہاراجہ پرتھی راج چوہان کے دربار کی ہے اسکی اصل ریاست جو دھپور کے نامور منصف و مورخ منشی دیبی پرشاد صاحب مرحوم سے دستیاب ہوئی تھی اسکے ساتھ کی ایک اور تصویر بھی مرحوم نے بھیجی تھی یعنی مہاراجہ جے چند کا دربار جو آئندہ پیش کیجائیگی

فہرست مضامین زمانہ جلد ۵۷ بابتہ جولائی لغایتہ دسمبر ۱۹۳۱ء

تصاویر: سترھویں صدی کی ایرانی مصوری کا نمونہ۔ عہد مغلیہ کی ہندوستانی مصوری کا نمونہ۔ ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال۔ مسٹر وجے راگھوا چاریہ۔ لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند اور مہاتما گاندھی۔ اعلیٰ حضرت نظام دکن اور لارڈ ارون۔ مرحوم مہاراجہ صاحب بنارس۔ مسٹر پی۔ سی۔ راما سوامی لا ممبر گورنمنٹ ہند ہز ہائینس سر آغا خاں۔ عبدالرحیم خان خاناں (عہد اکبری) مسٹر کے۔ سی۔ رلیے مرحوم۔ پنڈت وشنو دگمبر گائن آچاریہ۔ مہاتما گاندھی کے سفر لندن کی دو تصویریں۔ گول میز کانفرنس میں ریاستہائے ہند کے قائم مقام۔ شاہنشاہ جہانگیر اور چوگان بازی۔ جعفر بیگ وزیر شاہجہاں۔ ایک مغل شہزادہ منشی رام دیال سکسینہ مرحوم۔ منشی جے دیال سکسینہ مرحوم۔ شریمتی چاندرانی مرحومہ۔ شریمتی ہیرا کنور دیوی

نثر

نظم

سالانہ انتہائی رعایتی اعلان
شایع کر کے حسب دستور اس سال بھی پبلک کو فائدہ اٹھانیکا موقع دیتے ہیں گھڑیوں کے متعلق ہمارا ۲۰ سالہ وسیع تجربہ ہماری شہرت اور مال کی عمدگی کا ضامن ہے اگر آپ نے کبھی ہماری خدمات سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے تو آج ہی بطور تجربہ کوئی گھڑی منگائیے پھر آپ ہمیشہ کیلئے ہمارے گاہک بن جائینگے۔ گذارش ہے کہ (۱) ہر گھڑی کا محصولڈاک پیکنگ و وی پی کمیشن بذمہ خریدار ہوگا (۲) ہر گھڑی کے ہمراہ تحریری گارنٹی روانہ کیجاتی ہے (۳) فرمایش لکھتے وقت گھڑی کا نام۔ نمبر قیمت اور اپنا پتہ صحیح اور خوشخط تحریر فرمائیے۔
موٹے گلاس کی رسٹ واچ
اسکرو کیس لیور جوئل دار
امریکن انگرسول ریڈیم رسٹ واچ
جنٹلمین چوکور رسٹ واچ
۵ سال
گارنٹی
نکل سلور کیس بہت موٹا شیشہ پائدار مشین گھوڑے کی سواری اور بھاگ دوڑ میں بند نہو نیوالی
الیضاً سلور کیس
الیضاً رولڈ گولڈ کیس
الیضاً طلائی کیس
اس کی جوڑ بھی اس قدر عمدگی سے بیجار بنائی گئی ہے کہ پانی اور ہوا کی مشین تک رسائی نہیں ہوسکتی فوجی حضرات کیلئے خاص طور پر بنائی گئی ہے ۵ یا قوتی جوئل
اس گھڑی کو چاہے آپ کتنے اونچے مقام سے نیچے پھینکدیں مشین کا کوئی بھی پرزہ نہ ٹوٹیگا
اس کے شیشہ پر کتنی ہتھوڑیاں ماریئے مجال ہے کہ ٹوٹ جائے غرضیکہ یہ گھڑی ہر حالت میں مضبوط ہے
الیضاً جرمنی کارخانہ کی مذکورہ بالا صفت کی۔ لیکن شیشہ گرنے سے ٹوٹ جاتا ہے
صرف یہی گھڑی ہے جو ہر مذاق کے شخص کو پسند آئی ہے اب تک ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوچکی ہے بیحد مضبوط خوبصورت صحیح ٹائم دینے والی
الیضاً پندرہ یاقوتی جوئل
وسوئیوں کے لئے ایکرو پیہ زائد ہوگا۔
نیو ڈزائن سکٹینگولر رسٹ
گولڈن ریڈیم رسٹ واچ
پائدار دو گھنٹی والا الارم ٹائم پیس
جدید منقش زنانہ رسٹ
بالکل جدید قسم کی مختلف شیپ والی نہایت خوبصورت اپنی مضبوطی اور صحیح ٹائم دینے سے بہت مقبول ہوچکی ہے
یہ گھڑی اپنی ساخت نقش خوبصورتی اور صحیح ٹائم دینے میں بے مثل ہے
اس کی دونوں گھنٹیاں اتنی بلند آوازیں بجتی ہیں کہ غافل سے غافل سونے والا بھی فوراً جاگ جاتا ہے۔ طالب علموں اور ڈیوٹی پر جانیوالے اصحاب کیلئے بہت مفید ثابت ہوا ہے
مستورات کی کلائی کی زیب و زینت چھوٹے سے چھوٹے سائز کی نفاست اور عمدگی ساخت میں بے مثل ہے تصویر سے اس کی خوبصورتی اور نقش و نگار کا اندازہ تھوڑا سا ہو سکتا ہے تحفہ اور شادی میں دیجاتی ہے

پچاس سالوں سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کے بے مثل موجد

بچوں کا پیارا!

لال شربت (REGD)

بچے۔ لڑکے اور پرسوتی کے لئے مثل آبحیات اکسیر ہے میٹھا اور خوش ذائقہ ہونے کی وجہ سے بچے بڑے شوق سے پیتے ہیں اس سے ان کی ہڈی مضبوط، جسم قوی اور خون گاڑھا ہو کر کف۔ کھانسی۔ بدہضمی ولاغری رفع ہوتی ہے۔ پرسوتی کی کمزوری اور ان میں دودھ کی کمی کو رفع کرنے کی اس میں بے مثل طاقت ہے۔

قیمت فی شیشی تیرہ آنہ ۱۳ر محصول ڈاک دس آنہ ۱۰ر نمونہ کی شیشی دو آنہ

جو صرف ایجنٹوں سے مل سکتی ہے۔

(REGD)

لاکھوں مریضوں پر آزمودہ یہ دوا ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مشہور ہے۔ دمہ خواہ کتنے ہی روز کا پرانا ہو وے ایک خواہ دو خوراک پیتے ہی دب جاتا ہے۔ دمہ کے جو مریض اور دوائیں کھاکر نا امید ہو چکے ہوں اُن کو اس دوا کی بھی آزمائش کرنی چاہیئے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ چھ آنہ عہ ڈاک محصول سات آنہ ۷ر

نوٹ: ہماری دوائیں سب جگہ دوا خانوں میں فروخت ہوتی ہیں۔ ڈاک خرچ بہت زیادہ ہو گیا ہے اس لئے اس کی کفایت کے لحاظ سے اپنے مقامی ہمارے ایجنٹوں سے خریدیں۔

صیغہ نمبر (۶۷) پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴۔ کلکتہ (ایجنٹ کانپور نیا گنج میں محمد حفیظ محمد نصیر صاحبان)

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

بزم خیال

اس میں اُردو اور فارسی شعرا کی مجالس کے لطائف وظرائف اور برجستہ گوئی وحاضر جوابی کے نمونے جمع کئے گئے ہیں جو خوش مذاق حضرات کی تفریح کا بہترین سامان ہے۔

قیمت صرف ایک روپیہ عہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر بھی اظہار خیال کیا ہے

قیمت فیجلد ۹؍

خاک پروانہ

منشی پریم چند کی تازہ ترین جو دہ منتخب مضامین کا مجموعہ۔ پریم چند صاحب کے افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

قیمت ایک روپیہ عہ

انتخاب اودھ پنچ

اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ان مضامین کا مجموعہ جو ۱۸۷۷ء میں اس میں شائع ہوئے تھے علاوہ اس کے بہت سا تفریح کا سامان بھی موجود ہے

قیمت صرف ایکروپیہ آٹھ آنہ عہ

بہرام کی رہائی

سیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے قیمت عہ

خیالات عزیز

مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب جسکی باضابطہ رجسٹری ہوگئی ہے حجم ۲ سو صفحات ہر ورق پر مصنف کی تصویر ٹائیٹل خوشنما نہیں لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت صرف دو روپیہ

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا مشہور ومقبول دیوان ہے جو حال میں حسن وخوبی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ داغ صاحب کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ قیمت بلحاظ دیوان صرف ایکروپیہ آٹھ آنہ عہ

مثنوی سحر

یعنی شکنتلا و دشنیت منظوم حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز اول اڈیشن کی قیمت ۱۲؍ دوسرے اڈیشن کی قیمت جس کی مصنف نے نظر ثانی بھی کی ہے صرف ۸؍

مرقع ادب

حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری اسمیں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز شعرا کے خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

مینیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمایئے

ہاف ٹون عکسی تصاویر

یہ تصاویر ہاف ٹون بلاک سے عمدہ آرٹ پیپر پر شائع ہوئی ہیں اور انکو عام پسندیدگی کا فخر حاصل ہے

تصاویر رنگین

فی تصویر ۲ر

مسیح ابن مریم
نغمۂ محبت
موسم سرما
جادو بہاری
انتظار
ہدایت
خواب راحت
گل پنج روز
رفیق طفلی
شکنتلا و دشینت
مشعل ہدایت
تار شکستہ
صبح نوروزی

بھکارنی ۲ر
گنگا اور بھیشم ۲ر
سمندر سا شن ار
امید وفاداری ۲ر
مہاراجہ پرتھی راج ار
شیواجی اور رامداس ۲ر
قدیم زمانہ کا طریق جنگ
یورپ کا ایک معرکہ ۲ر
ایک قدیم مشرقی مدرسہ ۲ر
مصطفےٰ کمال پاشا کی ترکی کونسل ۲ر
غسل کی تیاری ۲ر
سیتہ وان اور ستری ۲ر
راجہ کمانڈ کے بیٹے کا قتل ۲ر
باسدیو اور دیوکی قید ۲ر
زوجہ کمپنی متعلق بیگ

فن تصویر کے نمونے

کثرت میں وحدت ۲ر
وقت نزع ۲ر
رام بن باس ۲ر
کرشن اجودھیا جی ۲ر
...کا اتار ۲ر
راجر آج کا ملاپ ۲ر

دوت کالیداس ار
گوتم بدھ ار
اکبر اعظم ار
راجہ مان سنگھ ار
اکبر اور چیتے کا شکار ار
دربار شاہجہاں ار

عہد مغلیہ میں شاہی سواری کا جلوس
محاصرہ چتوڑ
پیدائش شاہزادہ سلیم دربار جہانگیر میں
سفیر فارس
دارا شکوہ کا سر اورنگزیب کے سامنے پیش ہوتا ہے
میرن صاحب میر جعفر
ٹیپو سلطان
دربار مادھو راؤ پیشوا
دربار شاہ عباس

موسمی تصاویر

ماہ چیت ۲ر بیساکھ ۲ر
جیٹھ ۲ر اساڑھ ۲ر
بھادوں ۲ر ماگھ ۲ر
پھاگن ۲ر ساون ۲ر

مشہور انشا پردازان اردو

مولانا شبلی ار
شمس العلماء ذکاء اللہ ار
شمس العلماء ڈاکٹر سید علی ار
میر تعشق علی ۲ر

حضرت انیس مرحوم ۲ر
حضرت سرور ۲ر
مولوی عزیز مرزا صاحب ۲ر
بابو بالمکند گپتا ۲ر
اڈیٹر بھارت متر ۲ر
مشاعرہ کیننگ کالج منعقدہ سنہ ۱۹۱۱ء ار
منشی احمد علی شوق ار
مرزا سلطان احمد ار
مرزا محمد رفیع سودا ۲ر
مرزا انشاء اللہ خاں ار
مولانا عبدالرزاق الہ آبادی ۲ر
مولانا آزاد دہلوی ۲ر
مسٹر رام بابو سکسینہ ۲ر
منشی نوبت رائے نظر ۲ر
جناب چکبست ۲ر
حضرت صفی ۲ر
ڈاکٹر اقبال ۲ر
مولانا حسن نظامی ار

لیڈران ہندو نامورانِ ملک

راجہ رام موہن رائے ۲ر
مسٹر دادا بھائی نوروجی ار

سر سالار جنگ ۲ر
ڈاکٹر نذیر احمد خاں ار
اراکین دیانند کالج ار
مسٹر تلک ۲ر
جسٹس محمود ۲ر
بابو سریندر ناتھ بنرجی ار
مسٹر کالیچرن بنرجی ار
سر رام کرشن بھنڈارکر ار
بابو گنگا پرشاد ورما ۲ر
سوامی دیوکانند ۲ر
نواب محسن الملک ۲ر
مسٹر رس بہاری ۲ر
ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی ار
پنڈت بشمبھر ناتھ ۲ر
بابو پرتاب چندر بنرجی ۲ر
جسٹس لالچند ایم اے ار
آنریبل مسٹر گوکھلے ۲ر
انجمن خادمان ہند ۲ر
مسٹر داداس ۲ر
مہاتما گاندھی ۲ر
پنڈت مالوی ار

کرنل بھولاناتھ ۲ر
پنڈت موتی لال نہرو ۲ر
لالہ لاجپت رائے ۲ر
ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ۲ر
سر ابراہیم رحمت اللہ ار
لالہ ہنسراج ۲ر
راجہ صاحب محمود آباد ۲ر
لارڈ سنہا دوقسم ار
سر آغا خاں ۲ر
مولانا محمد علی ۲ر
مسٹر سچدانند سنہا ۲ر
مسز سروجنی نائیڈو ۲ر
مسٹر وی۔ پی۔ مادھو راؤ ار
مہاتما منشی رام ۲ر
سوامی شردھانند ۲ر
سر سریندر ناتھ بنرجی
ٹیگور ۲ر
بابو بھگوانداس ار
سید امیر علی ار
نواب سید حسن بلگرامی ار
نواب سید محمد ۲ر

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے منگائیے

مکتبۂ جامعہ ملیہ | قرول باغ - دہلی

ہمزاد (ڈراما)

اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم - اے کا وہ دلچسپ ڈراما جس میں کم عمر بیوی اور "بزرگوار" شوہر کے معاملات قدرے ظرافت آمیز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں - اچھی سوسائٹی میں اسٹیج کرنے کیلئے یہ ڈراما بہت مناسب ہے طباعت کتابت، کاغذ بہت اچھا - یہ اُردو کی اُن کتابوں میں سے ہے جو تمام لوازم اشاعت سے آراستہ ہوتی ہیں - ۶ ؍

گناہ کی دیوار (ڈراما)

مصنفہ اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم - اے - گناہ بُری چیز ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر بدتر ہیں - گناہ کی دیوار شاید ٹوٹ سکتی ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر کے بتوں کو توڑنا بہت دشوار ہے - یہ ایک باعصمت خاتون کا قصہ ہے جسے کچھ عرصہ تک مجبوراً عصمت فروشی کی زندگی گزارنی پڑی لیکن بالآخر خدا نے اُس کی گریہ وزاری سُن لی اور اس زندگی سے نجات دلائی - قیمت ۸ ؍

کھیتی (ڈراما)

مصنفہ محمد مجیب صاحب بی - اے (آکسن) مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لئے ایک دلچسپ ڈراما مذہب اور اخلاق کس رستے پر چلانا چاہتے ہیں، زمانے کی مصلحتیں، قوم وملت کی ضروریات سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے - اور ایک معیار بھی تجویز کیا گیا ہے جو رہنمائی کے دعویداروں کو پرکھنے میں کام آسکتا ہے قیمت صرف ۶ ؍

پردۂ غفلت

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم - اے - پی ایچ - ڈی - کا وہ ڈراما جو انھوں نے قیام جرمنی میں لکھکر وہیں چھپوایا تھا - مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر - تعلیم نسواں، آزادی نسواں اور پردہ پر مفید ث - دلچسپ ظرافت آمیز اور نتیجہ خیز قصہ - عمدہ طباعت - قیمت [illegible]

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔ اے

نمبر ۲	فروری سنہ ۱۹۳۲ء	جلد ۵۸

فہرست مضامین

تصاویر: سورداس ۔ پنڈت مدن موہن صاحب مالویہ، آنریبل سر محمد شفیع مرحوم

قیمت فی پرچہ ۴/
زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا
قیمت سالانہ ۳/
قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۶/ ششماہی ۲/ ہندوستان سے ششماہی قیمت تین روپیہ

سالانہ انتہائی رعایتی اعلان
شائع کر کے حسب دستور اس سال بھی پبلک کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیتے ہیں گھڑیوں کے متعلق ہمارا ۳۰ سالہ وسیع تجربہ ہماری شہرت
اور مال کی عمدگی کا ضامن ہے اگر آپ نے کبھی ہماری خدمات سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے تو آج ہی بطور تجربہ کوئی گھڑی منگائیے پھر آپ
ہمیشہ کے لئے ہمارے گاہک بن جائیں گے۔ گذارش ہے کہ (۱) ہر گھڑی کا محصولڈاک پیکنگ وغیرہ وی۔ پی کمیشن بذمہ خریدار ہو گا (۲) ہر گھڑی
کے ہمراہ تحریری گارنٹی روانہ کی جاتی ہے (۳) فرمائش لکھتے وقت گھڑی کا نام۔ نمبر۔ قیمت اور اپنا پتہ صحیح اور خوشخط تحریر فرمائیے۔
موٹے گلاس کی رسٹ واچ
اسکرو کیس لیور جویل دار
امریکن انگرسول ریڈیم رسٹ واچ
جنٹلمین جوکو رسٹ واچ
نکل سلور کیس بہت موٹا شیشہ پائدار
مشین گھوڑے کی سواری اور
بھاگ دوڑ میں بند نہ ہونے والی
اس کی چوڑی اسقدر عمدگی سے بنائی گئی ہے کہ پانی اور ہوا کی مشین
تک رسائی نہیں ہو سکتی فوجی
حضرات کیلئے خاص طور سے بنائی گئی ہے
الفا سلور کیس
اس گھڑی کو چاہے آپ کتنے اونچے مقام سے
نیچے پھینک دیں مشین کا کوئی پرزہ بھی نہ ٹوٹے گا
غرض یہ گھڑی ہر حالت
میں مضبوط ہے
الفا جرمنی کارخانہ کی
صرف یہی گھڑی ہر جوہر مذاق
کے شخص کو پسند آتی ہے
ابتک ہزاروں کی تعداد میں فروخت
ہو چکی ہے۔ بیحد مضبوط خوب
صورت صحیح ٹائم دینے والی
ریڈیم ڈائل و سوئیوں کے
زائد ہوگا۔
نیو ڈزائن کیلکولر رسٹ
گولڈن ریڈیم رسٹ واچ
پائدار دو گھنٹی والا
الارم ٹائم پیس
جدید منقش زنانہ رسٹ
بالکل جدید قسم کی مختلف شیپ
والی نہایت خوبصورت اپنی مضبوطی
اور صحیح ٹائم دینے سے بہت
مقبول ہو چکی ہے
یہ گھڑی اپنی ساخت فیشن خوبصورتی
اور صحیح ٹائم دینے میں بے مثل ہے
اس کی دونوں گھنٹیاں آنی بلند
آوازیں دیتی ہیں کہ غافل سے غافل سونے والا
بھی فوراً جاگ جاتا ہے۔ طالب علموں اور
ڈیوٹی پر جانے والے اصحاب کیلئے بہت مفید ثابت
مستورات کی کلائی کی زیب و زینت
چھوٹے سے چھوٹے سائز کی
نفاست اور عمدگی ساخت میں
بے مثل ہے تصویر سے اسکی خوبصورتی
اور نقش و نگار کا اندازہ تھوڑا سا
ہو سکتا ہے
گارنٹی
گارنٹی ۵ سال
مشتہر ایڈورٹائزنگ مینیجر جان سن واچ ہاؤس نمبر ۸۸ صدر بازار میرٹھ (یو۔پی) تار کا پتہ "واچ ہاؤس" میرٹھ

ALETRIS
CORDIAL RIO
THE WOMANIS TONIC
الٹرس کارڈی اٹل یعنی اکسیر نسواں
ڈاکٹر اس کو جسمانی صحت کے لئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں
ہر گھر میں اس کا رہنا نہایت ضروری ہے
ماں بیٹی و بہن کے واسطے بہترین دوائی
Rio Chemical Co;
79. BARROW STREET
NEW YORK (U.S.A)
ہندو شعراء
خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چار سو پچاس گزشتہ و موجودہ ہندو شعراء کے حالات موثر و دلکش قابل دید چیدہ اشعار
قیمت
تذکرہ آب بقا گذشتہ و موجودہ شعرا کے حالات
شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں
لغات اردو مکمل سٹ
سال اردو ہندی اور اردو کی حقیقت الفاظ کا فرق
اصلاح زبان اردو - متروکات کی تشریح
ترجمان پارس اردو سے فارسی بنانے کی آسان ترکیب
زباندانی - اردو کے مستند قواعد
اصول اردو - صرف و نحو کے مختصر قواعد
المشتہر
مینجر عشرت بک ڈپو - احاطہ خانساماں لکھنؤ
انقلاب زندہ باد
انتخاب لاجواب
زندگی میں آسودگی اور آرام اچھا نام اور اچھے کام نہ ہوئے تو زندگی ہی ناکام ہے لیکن جب آپ کی صحت ہی اچھی نہیں اور جسم میں طاقت ہی نہیں تو ان کا حاصل کرنا غیر ممکن ہے۔ اگر آپ اپنی حالت میں انقلاب چاہتے ہیں تو اس کے لئے مقویات سرتاج عالم آتنک نگرہ گولیاں کا انتخاب لاجواب ہوگا۔ یہ گولیاں آپ کی جملہ شکایتوں۔ قبض۔ بدہضمی۔ خون اور منی کی خرابی و کمی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت انزال۔ دل و دماغ کی کمزوری۔ قوت ہاضمہ اور قوت حافظہ کی کمی اور جملہ شکایتوں کو دور کر کے پورا آرام پہونچا کے آسودگی عطا کر کے اچھے اور اہم کام کے انجام دینے کی ہمت عطا کر کے نامور بنادیگی قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں عہ ۵ ڈبیاں للعہ علاوہ محصول ڈاک۔ اسی طرح ہمارا طلا واجی کرن ہے۔ تمام بیرونی نقائص دور کر کے اعلیٰ درجہ کی مردمی عطا کرنے میں پوری فتح حاصل کر چکا ہے۔ قیمت فی شیشی پانچ روپیہ صہ صحت تندرستی کی تیجر راہ راست کی رہبر اور سب سے عمدہ مضامین سے مزین کتاب کام شاستر بالکل مفت طلب فرمائیے۔
وید شاستری، جام نگر - کاٹھیاواڑ
ایجنٹ - عبدالکریم اینڈ سنز - بسٹن روڈ - کانپور

زمانہ بک ایجنسی کی دلچسپ و قابل دید کتابیں

نصائح چانکیہ

یعنی نامور ہندو چانکیہ کے
مشہور و معروف دنیتی کا
ترجمہ از جناب پنڈت ہمنت
راؤ صاحب مدد گار خزانہ
سرکار عامرہ گورنمنٹ نظام
دام اقبالہٗ قیمت ۶ر

گل کدہ

لسان الملک حضرت عزیز لکھنوی
کا مجموعہ کلام جس کا ہر صفحہ
ایک چمن زار اور ہر شعر ایک
خوش رنگ پھول ہے قیمت عہ

لسان الغیب

شرح دیوان حافظ معہ مفصل
سوانح عمری ملک کے مشہور
اہل قلم حضرات کی رائے ہے
کہ یہ شرح یکتائی کے درجہ تک
پہونچگئی ہے قیمت جلد اول ۱ر

کاس الکرام

شرح رباعیات عمر خیام معہ مفصل
سوانحعمری تمام ارباب سخن کا
اسپر اتفاق ہے کہ اس موضوع
پر اس سے زیادہ مکمل و مبسوط
کتاب آج تک شایع نہیں ہوئی
قیمت تین روپیہ ہے

قومی نمبر رسالہ زمانہ

جسمیں بہت قابل دید مضامین
نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر
اور مہاتما گاندھی اور لالہ لاجپت
رائے ڈاکٹر سپرو مسٹر نائیڈو۔
ڈاکٹر اقبال کے خاص بیانات
اور بہت سے قابل دید مقامین
نظم و نثر شایع ہوتے ہیں قیمت عہ

اثرستان

ملک مشہور سخن سنج مرزا جعفر علی
خان اثر لکھنوی کا دیوان جسکا
ہر مصرعہ پر تاثیر اور ہر شعر تیر و
نشتر ہے قیمت عہ

مکمل عورت

وہ لڑکیدن کی تعلیمی و سوشیل حالات
کا مقابلہ ایک یورپین اسکول اور
دوسری کو کنیا ودیالہ مین داخل
کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کنیا
ودیالہ کی لڑکی تعلیمی و سوشیل
حالت مین بہتر ہے قیمت ۸ر

روٹھی رانی

جس مین حسن و عشق کی سچی
داستان اور راز و نیاز کا
دلچسپ معرکہ اور تریاہٹ
کی دلکش مثال موجود ہے
قیمت چھ آنہ ۶ر

پریم بتیسی

یعنی اردو کے مشہور فسانہ نگار
منشی پریم چند بی اے کے بہترین
قصوں کا مجموعہ زبان کی لطافت
اور بیان کی صفائی قابل دید
ہے حصہ اول ۱۲ر حصہ دوم ۱۲ر

دنیائے راز

از ابو الفاضل راز چاندپوری
قدیم و جدید کی دلکش
نظموں کا مجموعہ ہے ہر نظم بلحاظ
موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع
تصویر مصنف قیمت صرف عہ

یادگار قومی

جسمیں ملک کے مشہور ترین انشا
پردازوں کے ۵ مضامین
اور چار عکسی تصاویر ہیں
کاغذ لکھائی چھپائی صاف ہے
قیمت ایک روپیہ عہ

ترجمہ رامائن منظوم

بال کانڈ کا اصلی حصہ ہے دوہے
اور چوپائیاں ہندی ترجمہ
اردو اشعار مین مترجمہ سکھ
پرشاد تصویر قیمت عہ

بزم احباب

اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ قیمت ۸ر

سیر المصنفین

اردو انشا پردازی کی
مکمل تاریخ از جناب مولوی
محمد یحییٰ صاحب بی اے
شعر اکیطرح نثاروں کا
جامع تذکرہ قیمت عار

طریق دولتمندی

یہ کتاب ہر شخص کے قابل
خریدہے دولت کی چاہ
سب کو ہے لیکن دولت
کمانے کے طریقوں سے کم
لوگ واقف ہیں اس
کتاب میں دولت حاصل
کرنے کے طریقے نہایت
خوبی سے بتلائے گئے ہیں
قیمت ۸ر

اردو مضمون نویسی

مضمون لکھنے کیمتعلق بابو
نانک چند کھنا بی اے پروفیسر کی نہایت
عمدہ کتاب ہے قیمت ۸ر

حیات بیوہ

جسمیں مصنف نے بیوگان
کی حالت زار کا سچا فوٹو کھینچا ہے
اور انکی جانکاہ مصیبتوں کا
دلگداز سین پیش کیا ہے
قیمت ۵ر

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمائیے

پیپس Peps
سانس کیساتھ استعمال ہونیوالی حیرت انگیز دوا
کھانسی۔ سردی۔ ٹھنڈ۔ حلق کی سوزش۔ برانکٹیز وغیرہ کیواسطے
کھانسی۔ سردی اور برانکٹیز کیواسطے یہ حیرت انگیز پیپس کے ٹکیوں کی دوا جن سے ایسے کیمیاوی
بخارات نکلتے ہیں جو سانس کے ساتھ براہ راست سانس کیساتھ پھیپھڑوں تک پہونچ جاتے ہیں۔
ایک بہت ہی اہم ایجاد ہے۔
جیسے ہی مفید پیپس منہ میں گھلتی ہیں تو اُن سے پھیپھڑوں
کے حق میں مفید صنوبر کے درختوں کی ہوا کا جوہر بخارات
کی شکل میں نکلتی ہیں۔ پیپس حلق کی نازک جھیلوں اور گلے
کے اندر پھیپھڑوں تک سانس لینے والی نلیوں پر
ایک فوری تسکین دہ۔ صحت بخش اور جراثیم کش
اثر ڈالتی ہیں۔ پیپس خطرناک جراثیم کو مار ڈالتی ہیں
وہ سینہ کو تسکین اور طاقت دیتی ہیں اور ہر قسم کی
کھانسی۔ ٹھنڈ یا خطرناک سردی کو پورے طور
پر فوری تدارک کرتی ہیں۔
ایک شیشی ہمیشہ اپنے پاس رکھئے
PEPS
FOR COUGHS COLDS & BRONCHITIS
پیپس کی ہر ٹکیہ پر نقرئی غلاف ہوتا ہے
تمام انگریزی دوا فروش پیپس فروخت کرتے ہیں
قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ)
ایجنٹ:۔ مسرز اسمتھ اسٹینسٹریٹ اینڈ کمپنی کلکتہ

سورداس

جلد ۵۸ فروری سنہ ۱۹۳۲ع نمبر ۲

مآثر العرب

از مولانا محمد عبدالرزاق صاحب کانپوری مصنف "البرامکہ" وغیرہ

جزیرۃ العرب اسلام کا گہوارہ اور مسلمانوں کا مرکز ارضی ہے، اور جو قوم اس ملک میں آباد ہے وہ اقوام عالم میں ایک عظیم الشان درجہ رکھتی ہے اور اس کی تاریخی عظمت صدیوں سے مسلم ہے۔

تاریخی تقسیم عربوں کی تاریخ دو حصوں پر تقسیم ہے، ایک قبل اسلام جس کو اصطلاحاً "عہد جاہلیت" کہتے ہیں اور دوسرا دور "عہد اسلام" کا ہے۔

واقعات کے لحاظ سے یہ دونوں دَور نہایت شاندار ہیں۔ دَور اول کی نسبت عموماً یہ خیال ہے کہ یہ عربوں کا عہدِ ظلمت تھا۔ اس زمانہ میں اُن کی زندگی وحشیانہ تھی اور وہ دن رات خانہ جنگیوں اور ڈکیتیوں میں مصروف رہتے تھے اور ان میں کوئی اخلاقی وتمدنی جوہر نہ تھے مگر اس خیال کی تاریخ سے تردید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس عہد میں بھی ان میں شریفانہ اوصاف تھے جن پر وہ فخر کیا کرتے تھے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جب عربوں میں اسلام کا ظہور ہوا تو اُن کے بعض محاسن ذمائم قرار پائے اور اسلامی شریعت نے ان کو ناجائز قرار دیا۔ چنانچہ اس مختصر مضمون میں ہم عربوں کے وہ مآثر لکھتے ہیں جن کا تعلق عہد جاہلیت سے ہے

۱۔ حُریت آزادی یا خود مختاری اور اپنی عزت آپ کرنا، یہ عربوں کی ایک طبعی صفت ہے، ہر عرب یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی آزاد اور حریت پسند نہیں ہے۔ قدیم عربوں میں یہ خیال اس درجہ راسخ تھا کہ ہر شخص اپنے آپ کو بادشاہ وقت جانتا تھا چنانچہ واقعات سے قطع نظر کرکے اس خیال کی تائید متعدد الفاظ

اور امثالِ عرب سے بھی ہوتی ہے

علامہ زوزنی شارح سبعہ معلقہ کی رائے ہے کہ لفظ حُر (بمعنی آزاد) کے ساتھ متعدد اضافتیں ہیں جو عربوں کی خالص حریت پر دلالت کرتی ہیں مثلاً:-

۱- ارضٌ حُرّہ — وہ زمین جس پر مالگزاری تشخیص نہ ہو۔

۲- طینٌ حرّہ — وہ خالص مٹی جس میں ریت کی آمیزش نہ ہو

۳- احرار البقول — اعلیٰ قسم کی ترکاریاں (بقول جمع بقل بمعنی سبزی و ترکاری)

ایامُ العرب (عربوں کی عظیم الشان خانہ جنگیوں) کے سیکڑوں واقعات اسی حریت کی بدولت یادگار ہیں اسی فطری جوہر نے ہر عرب کو سپاہی بنا دیا تھا، اسی جذبہ نے فراعنۂ مصر[1]، سلاطین اشوریہ[2]، خسروانِ عجم[3]، اور قیاصرۂ روم[4] سے عربوں کو لڑایا اور اُن کو کبھی اس ملک پر قابض نہ ہونے دیا، اور اگر قبضہ ہوا تو وہ بھی عارضی اور ملک کے کسی خاص حصہ پر۔

۲- بدویت | عرب چونکہ آزادی پسند تھے اس لیے وہ شہروں کے اندر قید ہو کر رہنا پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ جنگلوں (بادیہ) کی کھلی ہوئی فضا میں ڈیروں، خیموں کے اندر رہتے تھے، اور سکونت بادیہ کے لحاظ سے بَدوِی (جنگلی) یا اعراب کہلاتے تھے۔ اور اسی بنا پر وہ حضریوں (حضریت، شہری زندگی اور حضری، شہر کا باشندہ) کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اپنی بدویت (جنگلی پن) اور جاہلیت پر فخر کرتے تھے[5]۔

۳- شہسواری | بہادر اقوام کے لئے شہسوار رہنا لازم ہے، عرب عہدِ طفلی ہی سے اپنے بچوں کو سواری کی تعلیم دیتے تھے اور جوانی میں سواری کی مشق کو معیوب سمجھتے تھے، چنانچہ اسی شوق کی وجہ سے عربوں میں گھوڑ دوڑ

---

(۱) شام و فلسطین پر فراعنۂ مصر نے سنہ ۱۸۰۰ ق م سے سنہ ۱۱۶۶ قبل مسیح تک حملے کئے۔ تاریخ مصر میں احمسس[1]، تحوتمس[2]، رعمسس[3] سوم اور رعمسس چہارم (اٹھارھواں اور بیسواں خاندان) کے واقعات ملاحظہ ہوں۔

(۲) اشور، یعنی شاہان بابل (کلدان) کے حملے بلادیمن، شام اور مصر پر سنہ ۹۰۰ ق م سے سنہ ۵۶۲ قبل مسیح تک ہوئے۔ شاہان اشور کا خیال تھا کہ جزیرۃ العرب میں معدنیات بکثرت ہیں۔ ان حملہ آوروں میں تغلات[1] بلاسر ثانی، سرجون[2] ثانی، سنجاریب[3]، اسرحدون[4]، شوربنی پال[5]، بنو خدنصر (بخت نصر)[6] کے حالات تاریخ میں پڑھنا چاہیئے۔

(۳) خسروان عجم، قورش (کیخسرو) نے سنہ ۵۳۹ ق م میں بابل فتح کرنیکے بعد عرب پر حملہ کیا، اور دوسرا حملہ براہ بحرین سابور ذوالاکتاف نے سنہ ۲۵۸ء میں کیا۔

(۴) قیاصرۂ روم: رومی صدیوں سے عرب کو فتح کرنا چاہتے تھے چنانچہ قیصر آگسٹس نے سنہ ۱۸ ق م میں والی مصر الیوس گالوس Aelius-gallus کی قیادت میں شاہان انباط کے دار الحکومت بطرا (پٹرا) پر حملہ کیا۔ یہ توراۃ کا قدیم شہر ادومیہ ہے۔ جو وادیِ موسیٰ میں مابین تدمر (بال مالٹ) و غزہ واقع تھا، غزہ سرحد مصر پر بحر احمر میں ہے۔

(۵) لم تکن الحضارۃ اعجبتہ ... بادیۃ ... (ترجمہ) جسکو شہروں میں رہنا پسند نہ رہے، مگر ہم تو دیہاتی ہیں اور تو ہم کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

جاری ہوئی۔

حلبہ و رہان دوڑ کے لئے گھوڑوں کے جمع کرنے کا نام حلبہ اور گھوڑ دوڑ کا نام رہان ہے۔ یہ رہن سے مشتق ہے۔ کیونکہ سوار، بازی لیجانے میں اپنی ذات کو گویا رہن کر دیتا ہے۔ اور جس زمانہ میں دوڑ ہوتی ہے اسکو ایام الرہان کہتے ہیں۔ یہ عربوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اور اس مردانہ کھیل کو انھوں نے درجۂ کمال تک پہنچایا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں خوب جُوا ہوتا تھا اور دل کھول کر بازی لگائی جاتی تھی، اور ذرا سی بے اعتدالی پر میدان کارزار گرم ہو جاتا تھا جس کی مثال حرب داحس اور غبرا ہے۔

مولانا حالی نے اپنی مسدس میں لکھا ہے:-

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

اس کی تفصیل یہ ہے کہ داحس (نر) اور غبرا (مادہ) دو مشہور گھوڑے تھے۔ داحس کا مالک قیس بن زہیر عبسی اور غبرا کا مالک حذیفہ بن بدر فزاری تھا۔ ایک دن دوڑ میں داحس بہت تیز جا رہا تھا اور قریب تھا کہ بازی جیت جائے، لیکن فریق مخالف کے ایک سوار نے آگے بڑھکر اُس کو بدکا دیا اور غبرا بازی جیت گئی اس پر دونوں قبیلوں میں جنگ شروع ہوئی۔ جو ۵۶۸ء سے ۶۱۳ء تک جاری رہی، اور اس خانہ جنگی کا خاتمہ اُس وقت ہوا جب یہ قبیلے اسلام لائے۔ چنانچہ عربوں میں یہ جنگ ضرب المثل ہے[۵]

عرب ایک ساتھ دس گھوڑے بڑھاتے تھے اور رفتار کے لحاظ سے اُن کے ترتیب وار نام یہ تھے ان ناموں سے زبان عرب کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کس قدر مادّے ہیں۔

۱۔ سابق ومجلی ۲۔ مصلی ۳۔ مسلی ۴۔ تالی ۵۔ عاطف ۶۔ مرتاح ۷۔ موئل ۸۔ حظی ۹۔ بطیم ۱۰۔ سکیت، فسکل، قاشور

سابق (نمبر ۱) جب میدان جیت کر آتا تھا تو اُس کے منہ پر شفقت اور محبت سے ہاتھ پھیرنا لازم تھا جریر کا مشہور شعر ہے

اذا شئتموا ان تمسحوا وجه سابق
جوادا فمدوا فی الرهان عنانیا

---

[۵] فلا کانت الغبرا ولا کان داحس + ولا کان یوماً حل فیه رهان + (ترجمہ) نہ تو غبرا رہی اور نہ داحس اور نہ وہ دن رہا جس میں گھوڑ دوڑ ہوئی تھی۔

دوڑ سے پہلے ایک رسّی تانی جاتی تھی اور سب گھوڑے صف باندھکر کھڑے ہوتے تھے اور اسی جگہ سے میدان میں چھوڑے جاتے تھے۔ اس رسّی کا نام مقوس اور مقبض تھا اور دوڑ کے راستہ میں ایک لکڑی نصب کردی جاتی تھی جو سوار سب سے آگے نکل جاتا وہ اُسکو اُکھاڑ لیتا تھا اور یہ جیت کی دلیل تھی۔

سب سے بڑی دوڑ بارہ میل کی ہوتی تھی۔ اور گھوڑوں کی چال عمر کے حساب سے مقرر تھی۔ بڑی دوڑ میں صرف پانچ سال یا اس سے زیادہ عمر کے گھوڑے دوڑائے جاتے تھے۔ اہل یورپ نے یہ کھیل اندلس (اسپین) کے عربوں سے سیکھا تھا اور اسلام نے بھی گھوڑ دوڑ کو جائز رکھا البتہ بازی لگانا ممنوع کردیا۔ دورِ حاضرہ میں اب یہ مستقل فن ہوگیا ہے۔

اغانی وغیرہ میں نامی شہسواروں کے حالات تفصیل سے درج ہیں، ہم صرف ناموں پر اکتفا کرتے ہیں ربیعہ بن مکدم، عنترہ بن شداد، عامر بن مالک ملقب بہ ملاعب الاسنہ، زید الخیل، عامر بن الطفیل، عمرو بن معدیکرب، دُرید بن الصمہ، زید الفوارس، امیہ بن حرثان، عمرو بن کلثوم تغلبی، شنفریٰ حارثی، مہلہل بن ربیعہ ان میں سے بعض عہد اسلام تک موجود تھے۔ عامر بن الطفیل بڑا مشتاق شہسوار تھا اور گھوڑے کی پشت پر وہ زشتی عمل کرتا جس کی تکمیل اندلس کے عربوں نے کی۔ یہ ویسے ہی عمل تھے جو سرکس والے دکھلاتے ہیں شہسواری کے علاوہ پیادہ پا دوڑنے کی بھی مشق کرتے تھے اور گھوڑے سے زیادہ تیز جاتے تھے، بلکہ بعض اوقات گھوڑا پیچھے رہ جاتا تھا۔ یہ لوگ محاضیر کہلاتے تھے۔ سُلیک (حرث بن عمرو تمیمی) شنفریٰ (ثابت بن جابر) عمرو بن براق، اسیر بن جابر اور ابوزہیر ثابت یہ پانچ شخص سرعت رفتار میں ضرب المثل تھے اور اکثر ملکر چوریاں بھی کرتے تھے، اور علی الصباح بڑے دھاوے کرکے گھر آجاتے تھے، ان میں سلیک، زہیر شاعر بھی تھے اور شنفریٰ تو زبردست شاعر تھا، طغرائی نے اسی کے قصیدہ کے جواب میں لامیۃ العجم لکھا ہے عہدِ مغلیہ میں ڈاک کے ہرکارے بھی محاضیر الہند کے خطاب کے مستحق تھے، تانتیا بھیل مشہور ڈاکو بھی بڑھاپے میں سو میل دوڑ کر دم لیتا تھا۔

۴۔ گھوڑوں کی پرورش

گھوڑوں کی نسل بڑھانا اور ان کی پرورش کرنا امارت میں داخل تھا۔ عربوں میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ سے گھوڑے کی سواری جاری ہوئی اور وہی سب سے پہلے عرب کے شہسوار ہیں، حیوانات میں گھوڑے سے زیادہ خوبصورت اور حسین کوئی دوسرا جانور نہیں ہے۔ شرافت نفس اور علو ہمتی میں بھی وہ سب سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ عرب کے گھوڑے بھی سب سے افضل ہوتے ہیں کیونکہ اُس کی آب و ہوا گھوڑے کے حق میں آبحیات کا اثر رکھتی ہے۔ عربی گھوڑا قد و قامت میں بلند نہیں ہوتا مگر تیزی، چالاکی اور

۱؎ ضاحتہ الطرب نوفل آفندی مطبوعہ بیروت
۲؎ انتخاب از تمدن عرب

شتاب روی میں اس کا جواب نہیں ہے۔ یہ بھی اپنی آزادی کے غرور میں چور ہوتا ہے۔ عربی گھوڑے کی صفت یہ ہے کہ تیز پتلیاں، پھولے ہوئے نتھنے، اونچی گردن، پتلی کمر، چھوٹا سر، پشت کسی قدر لمبی، دُم پیچھے کو اُبھری ہوئی، پانوں پتلے، نازک مزاج، غریب، تربیت پذیر، جاندار، کم خوراک، اور مہذب یہ اوصاف دوسروں میں مفقود ہیں۔

عرب میں ہنوز یہ دستور ہے کہ جب کوئی خاندانی گھوڑی بچہ جنتی ہے تو اسکی پیدائش کی تاریخ، ماں کا نام اور خاندان ایک پرچہ پر لکھکر معززین قبیلہ کی گواہی لکھائی جاتی ہے، اور یہ شجرہ ایک نلکی میں رکھکر بچہ کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ عربوں کو گھوڑے کی محبت مختلف اسباب سے ہے، لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مصیبت کے وقت وہ اسکی جان بچاتا ہے اس لئے دشمن کی زبان سے بھی نکل جاتا ہے کہ پہلے اپنے گھوڑے کے پانوں دھو پھر پانی پی"۔

اوصاف کے لحاظ سے عرب اپنے گھوڑوں کے نام رکھتے تھے، مثلاً:۔

۱۔ لغامہ (شترمرغ)

۲۔ عقاب (گدھ، تیز نظر)

۳۔ جرادہ العیار (ٹڈی کی طرح تیز رفتار)

۴۔ ذات الرماح (لانبے پانو والا جیسے تیر ہوتا ہے)

۵۔ ذوالخمار (یمنی چادر کی طرح گلدار)

اجدع بن مالک کے پاس ایک مشہور گھوڑی تھی جسکا نام سکاب تھا۔ فرمانروائے وقت نے اسکو طلب کیا۔ لیکن اجدع نے اس کے دینے سے صاف انکار کردیا، اور یہ شعر پڑھے۔

ابیت اللعن ان سکاب عِلقٌ　　نفیس لا یُعار ولا یباعُ

اے بادشاہ! خدا کرے کہ تو بُرے کاموں سے بچا رہے۔ میری گھوڑی سکاب بڑی قیمتی اور نفیس ہے۔

اس لئے وہ نہ مستعار دی جاسکتی ہے اور نہ فروخت ہوسکتی ہے۔

مفدا اةٌ مکرمةٌ علینا　　تجاع لها العیال ولا تجاع

اس پر ہماری جانیں قربان ہیں، یہ اس قدر عزیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں بال بچے بھوکے رکھے جاسکتے ہیں، مگر وہ نہیں۔

بعض عرب اپنے گھوڑوں کو اونٹنیوں کا سب دودھ پلادیتے تھے اور اہل وعیال بھوکے رہ جاتے تھے جیساکہ ورد (ایک گھوڑی کا نام ہے) کا قصہ مشہور ہے کہ اسکا مالک بھی اونٹنی کا سب دودھ پلادیا کرتا تھا

جب اُس کی بی بی نے شکایت کی تو اس کو مخاطب کرکے یہ شعر پڑھا۔

تلوم علی ان امنخ الورد لقحۃ وما تستوی والورد ساعۃ تفزع

میری بی بی مجھے ملامت کرتی ہے کہ میں اونٹنی کا سب دودھ ورد کو پلا دیتا ہوں حالانکہ وہ لڑائی کے وقت ورد کی برابری نہیں کر سکتی ہے۔

منذر شاہ حیرہ نے حمل بن زید سے نسل کشی کے لئے اس کا گھوڑا طلب کیا حمل نے انکار کر دیا، جب شاہ نے زیادہ مجبور کیا تو گھوڑے کو آختہ کر دیا۔ یہ واقعہ ہے کہ عرب اپنے گھوڑوں کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے

عرب میں گھوڑوں کی مختلف نسلیں ہیں لیکن سب سے زیادہ دو مشہور ہیں، ایک کدیشیہ جو عموماً تمام عرب میں ہیں، دوسری کحیلانیہ یہ اعلیٰ جنس ہے، ان کی مائیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصطبل میں تھیں، جن کی نسل کو آج تک عربوں نے باقی رکھا ہے

گھوڑے کی تعریف میں ہزاروں اشعار ہیں لیکن ہم صرف امراء القیس کا ایک شعر لکھتے ہیں:-

مِکَرٍّ مِفَرٍّ مُقبِلٍ مُدبِرٍ معًا کجُلمودِ صخرٍ حطّہ السیلُ من علِ

جب حملہ کرنا چاہو تو وہ بڑا حملہ آور ہے اور جب پیچھے ہٹنا چاہو تو تیزی سے ہٹتا ہے۔ اور تیزی سے آگے بڑھنے والا ہے، وہ بلندی سے اس طرح اترتا ہے جس طرح سیلاب سے پتھر ڈھلک آتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ گھوڑے میں یہ تمام وصف موجود ہیں، جس وقت جو کام لینا چاہو وہ کر سکتا ہے یہ وہ شعر ہے جس کا یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اونٹ کی طرح عرب کا گھوڑا بھی کم خوراک اور صابر ہوتا ہے دس دن تک وہ روزانہ بیس گھنٹہ چل سکتا ہے، اور کئی دن تک بے آب ودانہ سواری دیتا ہے، لوٹ کے موقع پر دشمن کو اپنے سُموں سے زخمی بھی کر دیتا ہے (اسکی تعلیم دیجاتی تھی) عرب کے تاریخی گھوڑوں کے کارنامے ایام العرب میں موجود ہیں۔

شکار میں جب گھوڑا ہرن پر غالب آتا اور ہرن ذبح کر لیا جاتا تو سوار جوش مسرت میں ہرن کا خون گھوڑے کے سینہ پر ملتا تھا، اس کو عربی میں خضاب النحر کہتے ہیں۔

گھوڑوں کے رنگ رنگ کے لحاظ سے عربی گھوڑوں کے حسب ذیل اقسام ہیں:-

۱- اشقر۔ مائل بہ سرخی، خصوصاً ایال اور دُم سرخ ہو، اسی کو سُرنگ کہتے ہیں، عربوں میں یہ رنگ منحوس سمجھا جاتا ہے کیونکہ شقراء شیطان بن لاطم کے گھوڑے کا نام تھا، جب وہ میدان جنگ میں مع سوار کے مارا گیا تو یہ رنگ نحس قرار پایا۔ اور یہ مثل ہوئی کہ "اشأم من الشقراء" یعنی شقراء سے زیادہ منحوس۔

۲- اصفر۔ (زرد رنگ)، اس کا دوسرا نام شرغا ہے

۳- اخضر- (سبز) جس کو سبزہ کہتے ہیں
۴- ادہم وغیہبی - (مشکی) جب سیاہی زیادہ غالب ہو۔
۵- ابرش- مذکورہ بالا رنگوں کے علاوہ۔
۶- مُدَنَّر- دینار سے ماخوذ ہے جس پر اشرفی جیسے سیاہ وسفید گل بوٹے ہوں۔
۷- اشہب - سیاہی میں کسی قدر سپیدی ہو۔
۸- کمیت- جب سُرخی میں کسی قدر سیاہی ہو (خصوصاً ایال اور دم سیاہ ہو)
۹- ورد- اشقر اور کمیت سے ملتا ہوا جس کو فارسی میں گلگون کہتے ہیں (عربی میں گلاب کے پھول کو وَرد کہتے ہیں)
۱۰- سمند- زردی میں سیاہی ہو۔
۱۱- سوسنی- زردی میں سفیدی ہو۔
۱۲- احوی- سبزی میں سیاہی ہو۔
۱۳- ابلق- دو رنگ سیاہ وسفید

اوصاف گھوڑے کے بال چھوٹے اور باریک ہوں، دُم گھنی ہو، (سبوغ الذنب) دونوں آنکھیں مستوی (برابر) ہوں، کان اور گردن لانبی ہو، سُم چھوٹے ہوں، چمڑہ نرم ہو، یہ اوصاف شرافت کی دلیل ہیں؛ ان کے علاوہ دوسری صفتیں حسب ذیل ہیں:-

۱- عُسَیب - جس کی دم زمین پر گرتی ہو (طویل الذنب)
۲- مجنب - سامنے کے ایک پانو میں خفیف سی کجی ہو، یہ بڑی صفت ہے۔
۳- صافن - جو تین پانو پر زور دیکر کھڑا ہو اور چوتھے پانو کا ایک سُم زمین سے ٹکا ہو۔
۴- مبرقعہ- جس کا تمام مونھ سفید ہو اور اطراف چشم سیاہ ہوں۔
۵- ارخم - سر سفید ہو، باقی تمام جسم سیاہ ہو۔
۶- مُحجل- پانوں سفید ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ یہ سفیدی سُموں سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے ہو۔
۷- مُجیب - سامنے کے پانوں پر سفیدی ہو۔
۸- یعبوب - لانبا اور تیز رفتار۔
۹- طوالات- قد و قامت کے اونچے۔

[1] انتخاب از مجمع البحرین مصنفہ فاضل ادیب شیخ ناصیف الیازجی مطبوعہ بیروت

۱۰- الاعوجیات - ایک قبیلہ میں ڈاکہ پڑا عرب کو ایک بچھیرا بہت عزیز تھا، جب وہ فرار ہوا تو اُس نے اس بچھیرے کو اونٹ کی پشت پر باندھکر ڈال دیا، منزل پر پہونچکر کھولا تو اُسکی پشت میں کجی آگئی تھی اس لئے اُس کا نام اعوج (خمیدہ پشت) قرار پایا، اور یہ کجی اسکی نسل میں باقی رہی اور اس نسل کے تمام گھوڑے اعوجیات کہلائے۔

عہد اسلام میں جہاد اور غزوات کی وجہ سے گھوڑا بہت عزیز تھا، اور اس کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں اسکی قسم کھائی تھی۔ اور احادیث نبوی بھی متعدد ہیں۔ گھوڑوں کی طرح اونٹوں کا پالنا اور اُن کی تعداد کا بڑھانا بھی فخر کی بات تھی چنانچہ لغت عرب میں اونٹ کے لئے دو ہزار لفظ ہیں، اور ایک ظریف کا قول ہے کہ "اگر تم سے کسی لفظ کے معنی دریافت کئے جائیں اور تم نہ جانتے ہو تو بلا تکلف کہہ دو کہ یہ لفظ اونٹ کے معنی میں ہے۔" یہ مضمون بھی طوالت میں اونٹ کے قدو قامت سے کم نہیں ہے لہذا تفصیل کی ضرورت نہیں قصائد سبعہ معلقہ میں طرفہ وغیرہ کے اشعار ملاحظہ ہوں جس میں اونٹ اور اونٹنیوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، ہم صرف ایک شعر لکھتے ہیں جو کسی عاشق مزاج شاعر کا ہے:۔

واحبّها و تحبّنی وتحبّ ناقتھا بعیری

اور میں اُسے چاہتا ہوں اور وہ مجھے چاہتی ہے اور اُسکی اونٹنی میرے اونٹ کو پیار کرتی ہے

اس جسمانی ساخت پر اونٹنی کی عشق بازی اور بقول شخصے اونٹ کا یہ شتر غمزہ بھی حیرت انگیز ہے۔

۵- قتل وغارت | شجاعت و بہادری کی بنیاد پر قتل وغارت کا بھی پیشہ میں شمار تھا اور قدیم عرب اسکو حلال کی کمائی سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اپنے عزیزوں کو لوٹنا اور قتل کر دینا بھی عیب میں داخل نہ سمجھتے تھے اور یہ وصف ان میں عہد عاد (تاریخی دور سے قبل) سے تھا، چنانچہ کسی شاعر کا قول ہے:۔

۱- من عھد عادٍ کان معروفا لنا اَسرُ الملوک وقتلھا وقتالھا

قدیم ترین زمانہ سے شاہوں کو قید و قتل کرنا اور اُن سے لڑنا ہماری عادت ہے۔

۲- واحیانا علی بکر اخینا اذا مالم نجد الّا اخانا

اور ہم (قتل وغارت کے ایسے خوگر ہیں کہ اگر مشق غارت گری کے لئے ہم کو کوئی اور نہیں ملتا) تو بسا اوقات ہم قبیلۂ بکر کو لوٹ لیتے ہیں جو ہمارے ہی بھائی ہیں۔

حماسہ میں ایسے پُر فخر اشعار بکثرت ہیں۔ لوٹ کے مال میں رہزنوں کو کمتر اونٹ اور اکثر بکریاں ملتی تھیں، اور عربی میں بکری کو غنم کہتے ہیں چنانچہ اسی لفظ سے غنیمت نکلا ہے جس کے معنی ہیں لوٹ کا مال

۶- اسیران جنگ کی تحقیر | عرب جب اپنے دشمن کو گرفتار کرتے تھے تو فوراً قتل کر دیتے تھے یا ناک اور کان

کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے، اور کبھی صرف دانت توڑ ڈالتے یا پیشانی کے بال تراش کر رکھ لیتے یا غلام بنا کر بیچ ڈالتے تھے۔ اگر کوئی بڑا آدمی گرفتار ہوتا تو اظہار احسان کے لئے رہا بھی کر دیتے تھے اور ان امور پر فخر کرتے تھے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں:-

۱۔ وفککنا غلّ امرءِ القیس عنہ　　بعد ما طال حبسہ والعناءُ

جب امرؤالقیس کی قید کی میعاد اور تکلیف بڑھ گئی تو ہم نے اس کی بیڑیاں کاٹ دیں۔

۲۔ فابوا بالنّھاب وبالسّبایا　　وابنا بالملوک مُصفّدِینا

عوام تو مال غنیمت اور قیدیوں کو لیکر پلٹے مگر ہم بادشاہوں کو ہتکڑیاں پہنا کر لائے۔ (سبعہ معلقہ)

اور جس قدر عورتیں گرفتار ہو کر آتی تھیں اُن کو لونڈیاں بنا لیتے تھے۔

۷۔ **قصاص و دیّت** قتل و غارت کی عادت نے عربوں کو سفاک بنا دیا تھا، اس لئے وہ انتقام کے بڑے شائق تھے۔ دادا کے خون کا بدلہ لینا پوتے پر فرض تھا، اور یہ ایسی پیاس تھی جو صرف خون سے بُجھتی تھی۔ قصاص کے بعد خاندانی جھگڑوں کا تصفیہ ہو جاتا تھا، اور کبھی قصاص کے بعد بھی نئے فتنے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور برسوں لڑائیاں جاری رہتی تھیں، جس طرح کُلیب کے قتل کے بعد قبیلہ بکر و تغلب میں پینتالیس[۴۵] سال تک جنگ ہوتی رہی۔ بنیاد اس لڑائی کی یہ تھی کہ سعد بن شمس کی اونٹنی ایک دن کلیب کی چراگاہ میں چر رہی تھی یہ امر کلیب کو ناگوار معلوم ہوا اور اُس نے اونٹنی کے تھنوں میں تیر مارا اونٹنی زخمی ہو کر بلبلاتی ہوئی سعد کے گھر پہونچی۔ جب سعد کی پڑوسن بسوس نے اونٹنی کی یہ حالت دیکھی تو وہ بے اختیار چلائی اور چند اشعار برجستہ پڑھے جس کے سنتے ہی لوگ کلیب کے قتل پر آمادہ ہو گئے اور دوسرے ہی دن کلیب قتل ہو گیا چنانچہ اس سبب سے قبیلہ بکر و تغلب میں یہ لڑائی شروع ہوئی اور ۴۹۰ء سے ۵۳۵ء تک جاری رہی جس میں ستر ہزار آدمی مارے گئے۔ ایام العرب میں یہ لڑائی حرب بسوس کے نام سے مشہور ہے۔ خواجہ حالی مسدس میں لکھتے ہیں:-

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی　　صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی　　تھی اِک آگ ہر سو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اِک اُن کی جہالت کا تھا وہ

قصاص کے عوض دیّت (خون بہا) لینا باعث ننگ و عار تھا، چنانچہ شعرائے جاہلیت کا یہ ایک معرکۃ الآرا مضمون ہے، مثلاً

لکن ابی قوم اصیب اخوهم رضا العار فاختاروا علی اللبن الدماء

ہم نے اس قوم کے پاس جن کا بھائی مارا گیا تھا خوں بہا بھیجا لیکن انھوں نے عار کے پسند سے انکار کیا اور دیت کے اونٹوں پر قصاص کو ترجیح دی۔

اس شعر میں لبن (دودھ) سے اونٹ مراد ہیں، عربوں میں اللبن اللبن کے نعرہ سے بھی دیت مراد ہوتی تھی۔

اِس صفت میں مردوں سے زیادہ عورتیں سخت تھیں۔ چنانچہ ایک عورت کا بھائی قتل ہوا جب اس کو معلوم ہوا کہ مقتول کا ایک بھائی (عمرو) دیت لیکر صلح پر آمادہ ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو قصاص پر مجبور کیا، کہتی ہے:۔

۱۔ ودع عنک عمروا، ان عمروا مسالم وهل بطن عمرو، غیر شبر لمطعم

عمرو کا ذکر نہ کرو، کیونکہ وہ تو صلح پر آمادہ ہے۔ عمرو کا پیٹ تو ایک بالشت کا ہے مگر پھر بھی نہیں بھرتا۔

۲۔ فان انتم لم تثاروا وتدیتم فمشّوا باذان النعام المصلم (حماسہ)

پس اگر تم خون کا بدلہ نہیں لیتے ہو، بلکہ خوں بہا لیتے ہو تو جاؤ اور گوش بریدہ شتر مرغ کی طرح ذلت وخواری سے مارے پھرو

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں

۱۔ قتلنا بقتلانا من القوم عُصبَۃً کِراماً ولم نأکل بهم حشفَ النخلِ

اپنے مقتولوں کے بدلے ہم نے فریق مخالف کے بہترین لوگ مار ڈالے، اور اُن کے عوض ہم نے ناقص کھجوریں نہیں کھائیں۔ (خوں بہا نہیں لیا بلکہ قصاص لیا)

۲۔ فلا تاخذ وا عقلا من القوم اننی اری العار یبقی والمعاقل تذهب

وصیت کرتا ہے کہ "اگر وہ مجھے مار ڈالیں تو دیت نہ لینا کیونکہ عار باقی رہتا ہے اور دیت کا مال صرف ہو جاتا ہے۔

یہ بھی دستور تھا کہ جب تک قصاص نہ لیتے شراب پینا، نہانا، عطر لگانا، اور عیش وعشرت کے کام حرام تھے، تابط شرا، اپنے بھانجہ کے مرثیہ میں کہتا ہے:۔

حلّتِ الخمرُ وکانت حراما وبلاءٍ ما المّت تحلُ (حماسہ باب المراثی)

جب ہزیل سے میں نے انتقام لے لیا تو شراب جو مجھ پر حرام تھی وہ حلال ہوگئی اور مدت دراز کے بعد وہ حلال ہو کر میرے پاس آئی ہے۔

یہ بھی دستور تھا کہ اگر قاتل کا پتہ نہ چلتا تو جس قبیلہ پر شبہ ہوتا اُس کے پاس جاکر اصحاب فرداً فرداً

اپنی بے گناہی پر قسم کھاتے تھے اور اسی پر فیصلہ ہو جاتا تھا۔ سرداروں کی دیت میں اکیسو اونٹ لئے جاتے تھے۔
قصاص اور دیت کے معاملہ میں ان کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ آسمان کی طرف ایک تیر چلاتے تھے، اگر وہ تیر خون آلودہ ہو کر گرتا (غالباً کسی پرندہ کے خون سے رنگین ہو جاتا ہوگا) تو پھر قود (قاتل کا قتل) کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ اور اگر تیر بے داغ ہوتا تو اس کو اپنی داڑھی سے صاف کر کے دیت پر صلح کر لیتے تھے، اور یہ صلح کی علامت تھی اور اس عمل کو عقیقہ کہتے تھے اور یہ تیر سہم الاعتذار کہلاتا تھا۔

کسی شاعر کا قول ہے:۔

عقوا لهم ثم قالوا صالحوا یا لیتنی فی القوم اذا مسحوا اللحی

تیر سے عقیقہ کرتے تھے، پھر کہتے تھے کہ آؤ صلح کر لیں، کاش! میں قوم میں اس وقت ہوتا جبکہ داڑھیوں سے تیر کو صاف کرتے تھے۔

جب تک مقتول کا خون بلا بدل رہتا اور صلح نہ ہو جاتی اس وقت تک مقتول کے گھوڑے کی پیشانی اور دُم کے بال امتیاز کے طور پر کترے رہتے تھے۔ اگر قاتل گمنام ہوتا اور قتل کا الزام کسی شخص پر لگایا جاتا تو یہ شخص لوہے کے گرم ٹکڑہ کو زبان سے چاٹتا، اگر زبان نہ جلتی تو جرم سے بری کر دیا جاتا اور مدعی اس کو ایک اونٹ نذر کرتا (یہ غلط الزام کا جرمانہ تھا) بعض اوقات اہل کرم اپنی فیاضی سے دیت کو واپس کر دیتے تھے، اس سے خاندان کی شہرت ہوتی تھی۔

اگر کسی معزز قبیلہ کا غلام قتل ہوتا تو اس کے عوض آزاد کو قتل کرتے تھے، اور عورت کے بدلہ میں مرد کو اور ایک مرد کے عوض دو مرد قتل کئے جاتے تھے۔ لیکن اسلام نے ان کے اس فخر کو مٹا کر مساوات قائم کی اور حکم دیا کہ "الحرُّ بالحرِّ والعبدُ بالعبدِ" یعنی آزاد کے عوض صرف آزاد اور غلام کے بدلے صرف غلام ہی قتل کیا جائیگا"۔ اور قصاص و دیت کے قواعد مقرر کر دیے جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

۸۔ دشمنی اور محبت عہد جاہلیت میں جس طرح عرب دوستی اور محبت میں راسخ الخیال تھے، اسی قدر دشمنی میں بھی سخت تھے۔ اور صدیوں تک عداوت نہیں جاتی تھی۔ ہر فرد دشمن سے بدلہ لینے میں دلیر تھا اور قصور کا معاف کرنا معیوب تھا۔ شعرا جب کسی بات پر ناراض ہو جاتے تھے تو اپنے ہی قبیلہ کی ہجو لکھ ڈالتے تھے۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ قبیلہ بنی ذہل میں ایک شخص کے تینس ۳۰ اونٹ بنی لقیط ہانک لے گئے، اس نے اپنے قبیلہ والوں سے مدد مانگی لیکن کسی نے اعانت نہ کی، مجبور ہو کر اس نے بنی مازن سے فریاد کی تو اُنھوں نے بجائے تینس ۳۰ اونٹوں کے سو اونٹ بنی لقیط کے گرفتار

کر کے دے دیے اس موقع پر وہ اپنے قبیلہ کی ہجو میں کہتا ہے:-

لو کنت من مازن لم تستبح ابلی بنو اللقیط من ذھل بن شیبانا

اگر میں بنی مازن سے ہوتا تو ذہل بن شیبان یعنی بنو لقیط کے ڈاکو میرے اونٹ لوٹ کر نہ لے جاتے۔

اور باوجود شقاوت کے دوستی کا جذبہ بھی زبردست تھا، سفر میں کسی دوست کی قبر پر پہنچتے تھے تو وہاں بیٹھکر شراب ضرور پیتے تھے تاکہ مرحوم کی یاد تازہ ہو جائے اور شراب کا ایک پیالہ اس کی قبر پر ڈالدیتے تھے۔

اصب علی قبر یکما من مدامۃ فان لا تنالا ھا تر و حثا کما

میں تم دونوں کی قبروں پر شراب کہنہ چھڑکتا ہوں پس اگر تم اس کو قبول نہیں کرتے ہو تو اس سے تمہاری قبر کی مٹی سیراب ہوتی ہے۔

۹- **صبح خیزی** ہر عرب صبح اُٹھنے کا عادی تھا، کیونکہ لوٹ مار کے لئے بڑے تڑکے گھروں سے نکل جاتے تھے اور دن چڑھے تک سونے کو بدفالی خیال کرتے تھے، اسی طرح عصر کے وقت بھی نہیں سوتے تھے۔ ایک شاعر کہتا ہے:-

الا ان نومات الضحی تورث الفتی عموماً ونومات العصیر جنون

ہوشیار ہو جاؤ کہ صبح کا سونا باعث غم اور عصر کے وقت سونا موجب جنون ہے

امرؤ القیس کا قول ہے۔

وقد اغتدی والطیر فی وکناتھا بمنجرد قید الاوابد ھیکل (سبعہ معلقہ)

میں صبح کو گھر سے اس وقت نکلتا ہوں جبکہ چڑیاں اپنے گھونسلوں میں محو راحت ہوتی ہیں۔ اس زبردست گھوڑے پر سوار ہو کر جس کے بال چھوٹے ہیں اور وہ وحشی جانوروں کے لئے بمنزلہ بیڑی کے ہے۔ (یعنی کوئی جانور بھاگ کر اس سے بچ نہیں سکتا ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ عرب اس قدر سوتے تھے جس سے صحت قائم رہے اور زیادہ سونے کو بُرا جانتے تھے اور زیادہ سونے والے کی نیند کو نومۃ عبود سے تشبیہ دیتے تھے۔ عبود[1] ایک غلام تھا جس کی نسبت مشہور ہے کہ وہ سات برس تک سوتا رہا۔

---

[1] سات برس تک سوتے رہنا تو مبالغہ ہے، ممکن ہے کہ یہ غلام سات مہینے مسلسل سویا ہو۔ حکیم عبدالحی مرحوم بھوپالی نے مجھ سے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا تھا کہ نواب نورالحسن خاں (فرزند نواب صدیق حسن خاں) کی شادی میں ایک باورچی کئی دن تک نہیں سویا تھا، جب کام سے فارغ ہو گیا تو وہ سو رہا اور آٹھ دن کے بعد اٹھا۔ طبیبوں نے مشورہ دیا تھا کہ یہ بیدار نہ کیا جائے، جب وہ خود بخود اُٹھا تو بالکل تندرست تھا۔

۱۰۔ صحرانوردی | لق و دق جنگلوں کو طے کرنا، سوار و پیادے، بڑی دلیری کا کام سمجھتے تھے اور صحرانوردی بھی مفاخر میں شمار کی جاتی تھی۔ اسکی تصدیق شعراء کے کلام سے ہوتی ہے:۔

۱۔ یبیتُ بمغزا الوحش حتی اَلِفتَہٗ ویصبح لا یحمی لھا الدھر مرتعا (تابط شرا)

وحشی جانوروں کے غول میں تنہا رہتا ہوں، یہانتک کہ وہ مجھ سے مانوس ہو گئے ہیں اور صبح کو انھیں چرائی پر جانے سے نہیں روکتا ہوں۔

۲۔ وَوادٍ کجوف العَیرِ قفرٍ قطعتہٗ بہ الذئب یعوی کالخلیع المعیّل (امرؤ القیس)

اکثر ویران وادیاں (جیسی کہ یمن کی وادی العیر ہے) میں نے طے کی ہیں، جس کے اندر بھوکا بھیڑیا مثل ہارے ہوئے کثیر العیال جواری کے چیختا پھرتا تھا۔

اور اس حالت میں بھی نہایت ہوشیار رہتے تھے، برائے نام سوتے تھے اور ایک کنکری کی آواز پر جاگ پڑتے تھے۔

۱۔ فاذا انبذت لہ الحصاۃ رایتہ ینزو لوقعتھا طمور الاخیل (ابو کبیر ہذلی)

اے مخاطب! جب تو اس کی طرف کنکری پھینکے تو وہ اس کے گرنے سے قبل شکرے کی طرح جست کرتا ہے

۱۱۔ شکار | عرب کا ملک زرخیز نہیں ہے کیونکہ نہ اس میں دریا ہیں نہ بڑی نہریں ہیں، اور قلت بارش کی وجہ سے زراعت بھی کم ہوتی ہے، اسی لئے شکار کا مشغلہ ضروری ہے۔ اُمرائے عرب اپنے مصاحبوں کے ہمراہ جنگل میں جا کر ڈیرے ڈالتے تھے، بزم مشاعرہ بھی منعقد ہوتی تھی اور رقص و سرود کے جلسے بھی ہوتے تھے۔ شکاری جانوروں میں بھیڑیے اور چیتے کا شکار کرنا بہادری کی علامت تھی۔ طرفہ کہتا ہے۔

وکرّی اذا نادی المضاف مُحنّباً کَسِیدِ الغضا نبّھتہ المتورّدِ

دشمنوں میں محصور ہو کر جب مجھے کوئی پکارتا ہے تو میں اس کی طرف اپنے تیز رو گھوڑے پر اس طرح سے پلٹ کر آتا ہوں جیسے درخت غضا کا بھیڑیا، جس کو میں نے اس وقت للکارا جبکہ وہ پانی پینے جاتا ہو

نیزے اور تیر سے شکار کیا کرتے تھے۔ اور شکار کے متعلق سیکڑوں اصطلاحات ہیں، الفاظ ذیل ملاحظہ ہوں

۱۔ سانح ۔ وہ جانور جو شکاری کے دائیں ہاتھ کی طرف سے بائیں جانب آئے، یہ مبارک شگون تھا۔

۲۔ بارح ۔ سانح کے خلاف۔

۳۔ ناطح و نطیح ۔ جو شکار سامنے سے آئے۔

۴۔ قعید ۔ جو پشت کی طرف سے آئے۔

۵۔ قترہ ۔ بارچہ (شکاری کے بیٹھنے کی مخفی جگہ)

۶۔ حفرۃ ۔ زمین دوز پارچہ ۔ یہ شیر کے واسطے مخصوص تھا۔

۷۔ تلید ۔ شکار کے لئے زمین پر لیٹ کر چلنا۔

۸۔ اخفاق ۔ شکار سے ناکام واپس آنا۔

حلال اور حرام جانوروں میں کوئی تفریق نہ تھی، باستثنائے حرم کعبہ ہر وادی اور جنگل میں شکار کھیلتے تھے۔ فارسی علم ادب میں بھی اشارات موجود ہیں۔

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی   تپیدن دل مرغان رشتہ بر پارا

عرب میں چیتے کا شکار سب سے پہلے کلیب بن وائل نے کیا۔ شکار میں گھوڑوں کے ساتھ کتے بھی دوڑائے جاتے تھے اور ان کو شکار کی تعلیم دیجاتی تھی۔ لبید بن ربیعہ کہتا ہے:

حتیٰ اذا یئس الرماۃ وارسلوا   غُضفاً دواجن قافلاً اعصامها

جب تیرانداز اس گائے کے شکار سے ناامید ہوگئے تو انھوں نے اس پر شکاری کتے دوڑائے جن کے کان لٹکے ہوئے تھے اور کمر پتلی تھی۔

۱۲۔ قمار بازی اخلاقاً جو افعال مذموم ہیں دولتمندی میں وہی مستحسن ہوجاتے ہیں جیسے میخواری اور قمار بازی، چنانچہ جاہلیت میں بھی یہ دونوں شغل باعث فخر تھے، کیونکہ مفلس نہ شراب پی سکتا ہے نہ جوا کھیل سکتا ہے۔ عرب کی شاعری ان امور کی طرف اشارہ کرتی ہے:

تحابی بها اکفائنا ونهینها   ونشرب فی اثمانها ونقامر

ہم اپنے ہم پلہ اصحاب اور مہمانوں کے لئے اونٹوں کی بخشش کرتے ہیں (ذبح کرتے ہیں) اور اُن کی قیمت سے شراب پیتے اور جُوا کھیلتے ہیں۔

عرب کے مختلف مقامات میں قمار بازی کے بھڑ قائم تھے جہاں مشہور جواری جمع ہوکر کھیلتے تھے، اور کھیل کے پانسوں کو ازلام (بے پر کے تیر) اور مغالق (شئے خطرناک) کہتے تھے۔ پانسے شمار میں دس تھے، ترتیب وار ان کے نام یہ ہیں:-

فذ، توأم، رقیب، نافس، حلس، مُسبل، معلّیٰ، فسیح، منیح، وغد۔

ایک نمبر سے سات تک حصے مقرر تھے جو ایک سے شروع ہوکر سات پر ختم ہوجاتے تھے، اور بقیہ تین کے حصے مقرر نہ تھے۔ ہر پانسہ پر اس کا نام لکھا ہوتا تھا، اور ایک تھیلی میں رکھے جاتے تھے اور اس کا ایک امین ہوتا تھا جو کھیل کے وقت پانسے دیتا تھا۔

قمار بازی وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی اور کھیل کے متعدد طریقے تھے جن کی تفصیل بیکار ہے۔ لقمان بن عاد

اور ابن مقبل عرب کے تاریخی جواری تھے۔ جوئے کے پانسوں سے فال بھی کھولتے تھے۔ اس وقت ان کا نام ازلام استخارہ تھا۔ فال کے لئے صرف تین تیر مخصوص تھے۔ ڈو پر یہ عبارت ہوتی تھی امرنی ربّی (میرے خدا نے مجھ کو حکم دیا) و نہانی ربّی (میرے خدا نے مجھ کو منع کیا) تیسرا تیر سادہ تھا۔ فال کے وقت یہ تیر ایک تھیلی میں ڈال دیے جاتے تھے، اور جو تیر نکلتا (امر یا نہی) اس کے مطابق کام کرتے تھے اور جب سادہ تیر نکلتا تو دوبارہ فال نکالی جاتی۔ خانۂ کعبہ میں جہاں سب سے بڑا دیوتا ہبل (بت) رکھا ہوا تھا اسی جگہ بیٹھکر فال کھولتے تھے۔

۱۲۔ مے نوشی شراب گویا عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی اور امراء کے لئے مے نوشی مایۂ فخر تھی، خود پیتے تھے اور عورتوں کو بھی پینے پر مجبور کرتے تھے۔ شراب کی سیکڑوں قسمیں تھیں اور ایک ہزار نام ہیں چنانچہ شعرائے جاہلیت کے کلام میں تقریباً ۱۲۵ شرابوں کے نام آئے ہیں۔

انگور، کشمش، چھوہارے، سرکہ، چاول، جو، شہد اور گیہوں سے بکثرت شراب تیار کی جاتی تھی اور شراب[1] میں شہد ملا کر پیا کرتے تھے۔

فنازعنی انه جاجته بعد وهن　　　مزجت لهم بها عسلاً وراحاً

اس نے کچھ وقفہ سے جام شراب پر چھین جھپٹ کی اور میں نے ان کے لئے شراب میں شہد ملا دیا تھا۔

امیروں کی بزم طرب میں ساقی کی خدمت کنیزیں انجام دیتی تھیں اور اُس وقت وہ رنگین لباس میں ملبوس ہوتی تھیں۔ یہ فخریہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ندامای بیضٌ کالنجوم وقینةٌ　　　تروح الینا بین بُردٍ ومُجسدِ

میرے ہم نشین ستاروں کی طرح روشن چہرہ ہیں اور ایک گانیوالی چھوکری دھاریدار اور زعفرانی لباس پہنکر سرشام ہمارے پاس حاضر ہوتی ہے۔

۲۔ وان تبلغنی فی حلقته القوم تلقنی　　　وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطد (سبعہ معلقہ)

اگر تو مجھے شرفا میں تلاش کریگا تو وہاں پائیگا اور اگر تو مجھے کلواروں کی دوکان پر شکار کرنا چاہے گا تو شکار کرلے گا۔

شراب کی دوکانوں پر جھنڈے لہرایا کرتے تھے، اور یہی امتیاز کسبیوں کو بھی حاصل تھا چنانچہ انکا لقب صاحب[2] الرایات تھا، اور شراب خانے غاتیہ کہلاتے تھے۔

---

[1] اسد اللہ خاں میرزا غالب دہلوی شراب میں گلاب ملایا کرتے تھے۔ شیفتہ نے ایک غزل میں یہی اشارہ کیا ہے۔
"آمیختن بادۂ صافی بگلاب" ...

[2] ملل ونحل شہرستانی تذکرہ صواحب الرایات۔

قد ابّتُ سامِرھا و غایتہ تاجر　　وافیتُ اذ رفعت وعزّ مدامُھا (لبید بن ربیعہ)

ایسی راتوں میں میں اپنے احباب کا قصہ گو رہا اور کلواروں کی دوکان پر پہنچا جبکہ جھنڈا بلند تھا اور کثرت خریداری سے شراب کا نرخ گراں ہو گیا تھا۔

اس عہد کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ کعبہ کے کلید بردار ابو غبشان نے ایک مشک شراب پر کنجیاں بیچ ڈالی تھیں، اور تمام عمر کے لئے اس حق سے محروم ہو گیا تھا۔ (عہد جاہلیت میں بھی کعبہ مقدس عبادت خانہ تھا لیکن طریقِ عبادت میں فرق تھا۔) شعرائے جاہلیت کے کلام میں شراب کی مدح میں ہزاروں اشعار ہیں اور ان کے جذبات جداگانہ ہیں۔

عہد رسالت میں شراب حرام ہو چکی تھی، لیکن عہد فاروقی (خلافت دوم) تک لوگ چوری چھپے سے شراب پیا کرتے تھے۔ ۱۶ھ کا واقعہ ہے کہ قادسیہ میں ایرانیوں سے جنگ ہو رہی ہے، اور مسلمانوں کا نامور سردار ابو محجن ثقفی یہ ترانہ گا رہا ہے۔ چنانچہ اسی جرم میں گرفتار ہوتا ہے اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں[1]۔ جذبات ملاحظہ ہوں

اذا مت فادفنی الی اصل کرمتہ　　تروی عظامی بعد موتی عروقھا

جب میرا دم نکل جائے تو مجھے انگوروں کے نیچے دفن کرنا، تاکہ انگور کی جڑیں میری ہڈیوں کو موت کے بعد تر و تازہ کرتی رہیں۔

۲- ولا تدفننی بالفلاۃ فاننی　　اخاف اذا مامت ان لا اذوقھا

مجھے کسی جنگل میں دفن نہ کرنا کیونکہ اس حالت میں مجھے خوف ہے کہ میں عرق انگور سے محروم رہونگا۔

عہد اسلام میں یزید بن معاویہ اور ابو نواس شراب کی مداحی میں ضرب المثل ہیں، اور فارسی علم ادب میں رضی دانش کا یہ شعر لاجواب ہے۔

تاک را سیراب دار اے ابر نیسال در بہار　　قطرہ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے ایک رند شرابی کی محویت بھی قابل دید ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

شراب نوشی کے لوازمات میں کانچ کی صراحیاں اور پیالے موجود تھے۔ عنترہ کہتا ہے:-

بزجاجۃٍ صفراء ذات اسرّۃٍ　　قُرنت بازھر فی الشمال مُفدّمِ

کانچ کی زرد دھاریدار پیالی میں میں نے شراب پی، یہ میرے داہنے ہاتھ میں تھی اور میرے بائیں ہاتھ میں

[1] تجارب الامم مسکویہ مطبوعہ یورپ

سفید چھاگل تھی جس کے مونھ پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔

ہر وقت کی شراب نوشی کے لئے جداگانہ الفاظ ہیں، مثلاً صبوح (صبح کی شراب) غبوق (شام کی شراب) اور قیل (دوپہر کی شراب) اسی طرح اس انگور کی جس کی کنیتیں بھی متعدد ہیں، مثلاً ام عنا، ام زنبق، ام لیلیٰ، ام الخبائث، ام الدھر، بنت العنب (دختِ رز) اخت المرۃ۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں نبیذ (کھجور کی تاڑی) جاری تھی جس کی حلت کا علماء نے فتویٰ دیدیا تھا، اس کے پینے سے ہلکا سا سرور ہوجاتا تھا۔

۱۴۔ وفاداری وصفت امانت | اگر یہ مقولہ سچا ہے کہ "وفاداری بشکلِ استواری عین ایمان ہے" تو عرب اقوام عالم میں سب سے زیادہ اس کے مصداق تھے۔ چھوٹے درجہ کے آدمی بڑے درجہ والوں سے وفاداری کا عہد کیا کرتے ہیں لیکن عربوں کی وفاداری اپنے سے کمزور اور برابر والوں سے ہوتی تھی۔ اعراب اپنے ہمسایہ قبائل سے جو معاہدہ کرتے تھے اس کا ایفا لازم تھا، اور وعدہ کا پورا نہ کرنا ایک قومی جرم تھا۔

سموال بن عادیہ یمنی ایک عربی النسل یہودی تھا جو تیما کے قلعہ ابلق میں رہا کرتا تھا، چنانچہ امرؤ القیس (مشہور شاعر) شاہ کندہ جب منذر شاہ حیرہ سے شکست کھا کر قیصر روم کے پاس جارہا تھا تو اس نے اپنے خاندان کی مشہور تاریخی زرہیں سموال کے پاس رکھدیں اور کہا کہ روم سے واپسی کے بعد ان کو لے لونگا، لیکن اتفاق سے امرؤ القیس کا روم میں انتقال ہوگیا۔ جب حارث بن ابی شمر شاہ غسان کو امرؤ القیس کی موت کا حال معلوم ہوا تو اس نے سموال سے زرہیں طلب کیں، سموال نے شاہ سے کہلا بھیجا کہ زرہیں امانت ہیں وہ واپس نہیں ہوسکتی ہیں۔ اس جواب پر شاہ نے حارث بن ظالم کی قیادت میں قلعہ ابلق پر فوج کشی کردی۔ غریب سموال ایک فرمانروا کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا لہٰذا قلعہ بند ہوگیا۔ اتفاق سے سموال کا بیٹا شکار کو گیا ہوا تھا جب شام کو وہ واپس آیا تو حارث نے اس کو گرفتار کرلیا اور سموال سے کہلا بھیجا کہ زرہیں دیدو ورنہ تمہارے بیٹے کو قتل کردونگا، سموال نے جواب دیا کہ زرہیں امرؤ القیس کے ورثاء کے سوا کسی کو نہیں دیجائیں گی اور میرے بیٹے کے حق میں تم کو اختیار ہے چنانچہ حارث نے اس نوجوان کو قتل کردیا اور محاصرہ چھوڑ کر چلا گیا۔ اس واقعہ پر سموال نے یہ اشعار لکھے

وفیت باذرع الکندی انی | اذا ما ذم اقوام وفیت

کندی کے زرہوں کے معاملہ میں میں نے اپنا عہد پورا کیا۔ میں وہ ہوں کہ جب کوئی قوم میرے ذمہ کوئی خدمت سپرد کرتی ہے تو میں ایفائے عہد کرتا ہوں۔

واوصٰی عادیًا یومًا بان لا تھدم یا سموال ما بنیت

ایک دن میرے باپ عادیہ نے مجھے وصیت کی کہ اے سموال جو عمارت میں نے قائم کی ہے اسکو منہدم نہ کرنا

سموال کے علاوہ عرب میں عوف بن معلم اور اس کی بیٹی جماعہ اور ام جمیل (از خاندان ابو ہریرہ) ابو حنبل طائی

حرث بن عباد وغیرہ ایفاے عہد میں مشہور ہیں۔

۱۵۔ مہمان نوازی عرب مہمان نوازی میں ضرب المثل ہیں، ایک غریب عرب بھی اپنے ہمعصر سے بڑھ جانے کی کوشش کرتا تھا۔ دولتمند اندھیری راتوں میں ٹیلوں اور پہاڑیوں پر آگ جلاتے تھے کہ بھولے بھٹکے مسافر اس روشنی پر آئیں اور میزبان کے خوان نعمت سے سیر ہوں، اس بنا پر آگ کا ایک نام نار القریٰ (مہمانی کی آگ) بھی ہے۔ سموال یہودی فخریہ کہتا ہے۔

وما اخمدت نارٌ لنا دون طارقٍ ولا ذمّنا فی النازلین نزیلُ

آنیوالے مہمان سے قبل کبھی ہماری آگ نہیں بجھائی گئی اور مہمانوں میں سے کبھی کسی نے ہمکو برا نہیں کہا

عربوں میں جو یہ رسم تھی کہ گھر سے نکل کر راستہ میں آگ جلاتے تھے۔ یہ بھی اسی فیاضی کی یادگار ہے اور مبارک فال تھی کہ سفر سے جلد آنا نصیب ہو بعض سردار اس قدر فیاض تھے کہ غلاموں کے آگ جلانے سے جب کوئی مہمان آجاتا تو اس خوشی میں غلام کو آزاد کردیتے تھے۔

حاتم طائی کا قول ہے۔

اوقد! فان اللیل، لیل قرٌّ عسی یری نارک من یمرٌّ

ان جبلبت ضیفاً فانت حر

او غلام! آگ جلا، کیونکہ جاڑے کی رات ہے، شاید کہ تیری آگ کو راستہ چلنے والے دیکھ سکیں۔ اس ذریعہ سے کسی مہمان کے بلانے میں اگر تو کامیاب ہوگیا تو آزاد ہے۔

اگر انتہائی سردی ہوتی اور آگ نہ سلگتی تو یہ فیاض عرب کتوں کو خیموں سے باندھ دیا کرتے تھے وہ جاڑے سے مجبور ہو کر چیختے تھے جن کی آواز پر مسافر آجاتے تھے۔ اسی بنا پر ادب عربی میں کتے کو داعی الضمیر (مسافر کو بلانے والا) بھی کہتے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ مسافر بھی کتوں کی آواز سنکر نقلی آواز میں کتوں کی بولیاں بولتے تھے۔ اس بھیانک آواز سے کتے اور زیادہ شور مچاتے تھے اور مسافر خیمہ تک آسانی سے پہونچ جاتے تھے چنانچہ لغت عربی میں استنباح کے یہی معنی ہیں، کسی جاہلی شاعر کا قول ہے،

ومستنبح بات الصدیٰ یستتیھہ الی کل صوتٍ فھو فی الرحل جانحٌ

اکثر کتوں کے بھونکنے والے مسافر نے رات بسر کی، اور کتوں کی بہری آوازوں نے اسکو حیران کردیا تھا

اور وہ میرے قیام گاہ کی جانب مائل تھا۔

ایک عرب اپنی بی بی کو مخاطب کرکے کہتا ہے

یا زبیۃ الدار قومی! غیر صاغرۃ ضمی الیک رحال القوم والقربا

اے میرے گھر کی مالکہ! اُٹھ اس حال میں کہ تو میرے مہمانوں کی عزت کرنیوالی ہے اور ان کے کجاوے اور اسلحہ حفاظت سے رکھ۔

کھانے کے وقت مہمان سے گپ شپ کرنے کا بھی دستور تھا کہ وہ اطمینان سے کھانا کھائے۔ مہمان سے پہلے میزبان خواب گاہ کے ڈیرے میں نہیں جاتا تھا۔ اور مہمان کے سامنے مصائب کا تذکرہ کرنا بھی معیوب تھا، مہمان کے سامان اسلحہ اور جوتہ کی حفاظت میزبان پر فرض تھی۔ مہانداری میں اعراب (بدوی) حضریوں (شہری) سے زیادہ فیاض تھے۔ جب کوئی مسافر اُن کے ڈیرے میں جا نکلتا تو اس کو لوٹتے نہیں تھے بلکہ بڑے احترام سے اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ ایک وقت بھی اگر مہمان نے کھانا کھالیا تو پھر وہ میزبان کی حمایت میں آجاتا تھا

۱۶۔ فیاضی | سخاوت اور فیاضی بڑی صفت تھی اور بخیل ہونا عیب تھا

فنحن کماء المزن مافی نصابنا کھامٌ ولا فینا یعدّ بخیل

آب باراں کی طرح ہم آمیزش سے پاک ہیں اور ہماری نسل میں کوئی کند ذہن اور بخیل نہیں ہے۔

امرائے عرب میں حاتم طائی کے افسانے آج تک مشہور ہیں، حاتم کی بچپن سے یہ عادت تھی کہ وہ کبھی تنہا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ حاتم کے باپ کو یہ معمولی فیاضی بھی ناگوار تھی اس لئے ایک لونڈی اور ایک گھوڑا دیکر حکم دیا کہ چراگاہ میں اونٹ چرایا کرے اور وہیں رہے۔ حاتم جنگل میں بھی مہمان تلاش کرلیتا تھا۔ ایک دن تین سوار نظر آئے اتفاق سے یہ تینوں عرب کے مشہور شاعر تھے اور شاہ نعمان (حیرہ) کے دربار میں جارہے تھے۔ حاتم اُن کو اپنے خیمہ میں لایا۔ اور رات کے کھانے کے لئے تین اونٹ ذبح کرڈالے۔ ایک مہمان نے کہا کہ ہم سب کے لئے ایک چھوٹی اونٹنی کافی تھی۔ حاتم نے کہا کہ یہ تو میں بھی جانتا تھا لیکن آپ کے لباس اور چہروں سے ظاہر ہے کہ آپ اعلیٰ طبقہ کے اصحاب ہیں، اس لئے تین اونٹ ذبح کئے گئے تاکہ آپ کو بھی یہ دعوت یاد رہے۔

مہمانوں نے اپنے معزز میزبان کا شکریہ ادا کیا اور تمام رات حاتم کے خیمہ میں آرام کیا، چونکہ یہ تینوں شاعر تھے اُنھوں نے حاتم کی مدح میں قصائد پڑھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حاتم کی شاعروں نے مداحی کی تھی۔ جب مہمان رخصت ہونے لگے تو حاتم نے ہر ایک کو ننانوے اونٹ انعام میں دیدیے اور چراگاہ

اونٹوں سے خالی ہو گئی، یہ حاتم کی پہلی فیاضی تھی، اور یہ مہمان نابغہ ذبیانی، بشیر بن ابی حازم اور عابد الابرص مشہور شاعر تھے۔ اس فیاضی کے بعد حاتم گھر آیا۔ لونڈی نے اس کے باپ سے یہ قصہ بیان کیا تو اس نے سر پیٹ لیا اور حاتم سے کہا کہ یہ تو نے کیا کیا؟ حاتم بولا، بابا جان! میں نے خاندان کی عزت کے لئے یہ کام کیا ہے، جو قمری کے طوق کی طرح ہمیشہ یادگار رہیگا، اور یہ شاعر آپ کی تعریف کے ہر جگہ گیت گاتے رہیں گے۔"

اس جرم پر حاتم کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا، جب حاتم معاش سے مجبور ہوا تو رہزنی اختیار کی اور کچھ ہی دنوں میں امیر بن گیا۔ جس قدر مال غنیمت میں آتا وہ سب لٹا دیا کرتا تھا۔ جب حاتم کی بی بی ماویہ کو اس کی فیاضیوں سے تکلیف ہوئی تو اس نے قطع تعلق کر لیا۔ حاتم کی سب سے بڑی فیاضی یہ ہے کہ قحط کے موقع پر اس نے اپنی سواری کا قیمتی گھوڑا ذبح کر کے مہمانوں کو کھلا دیا، حالانکہ یہ گھوڑا اسکی معاش کا ذریعہ تھا۔ اونٹ کا دینا سب سے بڑی فیاضی تھی۔ چنانچہ بنی اُمیہ کے ابتدائی زمانہ میں انعامات میں بجائے نقدی کے اونٹ ہی دیے جاتے تھے۔ اور اُن کے کوہان پر شتر مرغ کے پر لگا دیتے تھے، یہ اس امر کی دلیل تھی کہ اب اونٹوں پر سے شاہی قبضہ اُٹھ گیا اور وہ غیر کے ملک ہو گئے۔

حاتم کی مدح میں سیکڑوں اشعار ہیں۔

یعیش الندی ما عاش حاتم طی وان مات قامت للسخاء ماتم

حاتم کے دم سے سخاوت زندہ ہے اور جب وہ مرجائیگا تو سخاوت پر ماتم کئے جائیں گے۔

عربوں کا دستور تھا کہ جب ایسے فیاضوں کی قبر سے گزرتے تو احتراماً ان کی قبر پر اونٹ کی قربانی کرتے تھے جاہلیت کے مہمان نواز فیاض تین شخص ضرب المثل ہیں، حاتم طائی، کعب بن مامہ اور ہرم بن سنان۔

۱۷۔ اعانت مظلوم اہل عرب پڑوسیوں کی حمایت اور مظلوموں کی اعانت کو بھی فرض سمجھتے تھے طرفہ نے اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے۔

اذا القوم قالوا من فتی خلت انّنی عُنیتُ فلم اکسل ولم ابتلّد

جب قوم یہ نعرہ لگائے کہ کون جواں مرد ہے (جو دشمنوں سے بچلسنے) تو میں خیال کرتا ہوں کہ قوم کا روئے سخن میری جانب ہے اس وقت نہ میں کاہلی کرتا ہوں اور نہ انکی مصیبت دور کر نہیں حیران ہوتا ہوں۔

جن قبائل میں محالفہ (باہمی اعانت کا قول و قرار) ہوتا انکی مدد کرنا حلیف پر فرض تھی۔

۱۸۔ رقص و سرود عرب میں چاندنی راتوں میں یاران جلسہ جمع ہو کر قصے کہانیاں سُنا کرتے تھے اور کنیزیں ناچ گا کر لطفِ صحبت کو بڑھاتی تھیں اور شراب کا دور بھی چلتا تھا۔ یہ فخریہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

افذالک کما ذالت ولیدۃ مجلس تُری ربّھا اذیال سحل ممدّد (طرفہ)

وہ اونٹنی ایسے ناز و ادا سے چلی جیسے رقاصہ چھوکری بحالت رقص مجلس میں اپنے آقا کے سامنے لمبی سفید چادر کے دامن اُٹھا کر چلتی ہے۔

اُس عہد کی چادر کو زمانہ حال کی پیشواز سمجھنا چاہیئے۔

۲۰۱- اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا — علی رسلھا مطروفۃ لم تشدد

جب ہم نے اس سے گانے کی فرمایش کی تو وہ ایسی نزاکت اور شرمیلی ادا سے آئی کہ گویا اس کی آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے اور اس کے حرکات رقص میں کرختگی نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ شرمیلی اداؤں سے ناچتی گاتی ہے ہٹر دنگی نہیں ہے

۳- اذا رجعت فی صوتھا خلت صوتھا — تجاوب اظار علی ربع ردٍ

جب وہ گٹکری بھرتی ہے تو اُس کی آواز نرم اور غمناک ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند اونٹنیاں ہیں جو اپنے مرے ہوئے بچے پر رو رہی ہیں (جو فصل بہار میں پیدا ہوا تھا)

اونٹنی کا نوحہ کیسا ہی دلکش ہو ہندی مذاق کے خلاف ہے، لیکن عرب جاہلیت کی شاعری میں یہ خوبی ہے کہ شاعر اُن چیزوں سے تشبیہ دیتا ہے جو اُس کے سامنے موجود ہوں اور خیالی تشبیہات سے گریز کرتا ہے

۱۹- واد البنات یا دختر کشی لغت عرب میں ولد کے زندہ دفن کرنے کو واد کہتے ہیں بعض قبائل عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی اور وہ ایسا کیوں کرتے تھے اس کے متعدد اسباب ہیں:-

(۱) بیٹوں کی محبت عرب ایک جنگجو قوم تھی اس لئے خاندان میں بیٹوں کی کثرت باعث فخر تھی اور ان کے حق میں یہ بھی دعا کرتے تھے کہ وہ شاعر ہوں، کیونکہ شاعری کی بدولت قبیلہ اور خاندان کو بقائے دوام کی زندگی نصیب ہوتی تھی۔

(۲) قحط سالی عرب میں اکثر قحط پڑا کرتے تھے اس لئے غریب آدمی کی نظر میں لڑکیوں کی کوئی قیمت نہ تھی۔ علاوہ بریں روزمرہ کی تنگ دستی سے بھی مجبور ہو کر وہ لڑکیوں کو زندہ رکھنا نہیں چاہتے تھے جس کا اشارہ قرآن کی بھی ایک آیت میں موجود ہے۔

(۳) جنگ و جدال میدان کارزار میں عورتیں گرفتار ہو جاتی تھیں اور لونڈیاں بنائی جاتی تھیں، جو خاندان کی دائمی ذلت کا باعث ہوتی تھیں، یہ خیال بھی دختر کشی کا موید تھا۔ اور بعض جاہل خسر اور سالہ بننے سے شرماتے تھے۔ بہر حال بعض قبائل عرب میں دس فیصدی لڑکیاں پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دی جاتی تھیں۔ اس رسم کا موجد قیس بن عاصم تمیمی تھا، اس نے دس سے زائد بیٹیاں

دفن کیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ جب قبیلہ بنی تمیم نے نعمان بن منذر شاہ حیرہ کو خراج دینے سے انکار کیا تو شاہی عامل قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ لے گئے، اور جب قیدیوں کی واپسی ہوئی تو قیس کی ایک بیٹی نے گھر آنے سے انکار کر دیا، اور جو قید کرکے لے گیا تھا اس کے پاس رہ گئی۔ اس پر قیس نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ کسی لڑکی کو زندہ نہیں رکھے گا۔ زبرقان نے بھی سات بیٹیاں دفن کیں، لیکن بعض رحم دل دختر کشی کے مخالف بھی تھے۔ چنانچہ فرزدق شاعر کا دادا صعصعہ بن ناجیہ ایک لڑکی کے فدیہ میں ایک اونٹ اور دو اونٹنیاں دیکر جان بچاتا تھا۔ اور اس انسانی ہمدردی کے صلہ میں اسکو محی الموؤدات کا خطاب دیا گیا تھا۔ نبی کریم کے دادا عبد المطلب بھی اس رسم کے مخالف تھے، کیونکہ مکہ میں بھی لڑکیاں زندہ دفن ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ جب عرب میں اسلام پھیلا اور یہ آیت نازل ہوئی وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائیگا کہ وہ کس گناہ میں قتل کی گئی تھی) تو تمام عرب سے دختر کشی کی رسم مفقود ہوگئی۔ تفسیر زمخشری اور رازی میں آیت مذکور کی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض چھ سالہ لڑکیاں بھی دفن ہوئی ہیں، اور کبھی یہ لڑکیاں پہاڑ کی چوٹی سے گرا دی جاتی تھیں، کبھی پانی میں غرق ہوتی تھیں اور بعض اوقات ذبح کر ڈالی جاتی تھیں۔"

ہندوستان کے ٹھاکروں میں بھی یہ رسم جاری تھی، اور قریب ہی زمانہ میں قانون کے ماتحت بند ہوئی ہے۔ یونان و روم میں بھی حکماء نے دختر کشی کو معیوب نہیں سمجھا، اور اگر انسانی مردم شماری کی کمی منظور ہو تو ان کے نزدیک اسقاط حمل جائز تھا۔

۲۔ خطابت و شاعری مجمع عام میں تقریر کرنا، اور برجستہ شعر کہنا یہ دونوں وصف تمام اوصاف پر غالب تھے۔ دور تمدن ہیں علوم منطقیہ کے تحت میں جو علوم ایجاد ہوئے ہیں اُن میں خطابت بڑے فخر کی چیز ہے۔ لیکن عرب جاہلیت منطق سے واقف نہ تھے باوجود اس کے فنِ خطابت میں ان کا درجہ یونانیوں سے بڑھکر تھا۔ عہد جاہلیت کا سب سے نامور خطیب (لکچرار) قس بن ساعدہ تھا۔ جس نے سب سے پہلے بلند مقام پر کھڑے ہوکر اور ہاتھ میں تلوار لیکر خطبہ دیا اور اما بعد کا استعمال کیا۔ قُس کے بعد سحبان وائل کا درجہ ہے۔ اس کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ دوران تقریر میں جو لفظ ایک مرتبہ کہہ جاتا تھا پھر اس کا اعادہ نہیں کرتا تھا، اسی بناء پر عربی میں یہ مثل ہے کہ "اخطب من سحبان" یعنی سحبان سے زیادہ خطیب۔ مردوں کے علاوہ عرب میں عورتیں بھی بڑی فصیح البیان گزری ہیں جس کی تفصیل تاریخ اور ادب کی کتابوں میں ہے۔

شاعری جاہلیت یا عبا لعہ ہر شخص برجستہ شعر کہنے پر قادر تھا اور مصنف اس غرور کی وجہ سے اپنے

مقابلہ میں وہ ساری دنیا کو عجم (یعنی گونگا) کہتے تھے۔ اس عہد تک وہ علم عروض وقافیہ سے محض ناواقف تھے۔ اور یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عہد اسلام میں جب علم عروض کی بنیاد پڑی تو شعرائے جاہلیت کے کلام سے مشہور بحریں اخذ کی گئیں۔ عرب میں سب سے اول قبیلہ قیس میں شاعری کا آغاز ہوا۔

عرب کی شاعری چار طبقات پر تقسیم ہے۔

۱۔ **جاہلی**۔ اس طبقہ میں وہ تمام شاعر داخل ہیں جو اسلام سے پہلے ہوئے اور اسلام سے قبل فوت ہو گئے۔ اور وہ شاعر بھی جاہلی کہلاتے ہیں جو عہد اسلام تک زندہ رہے لیکن انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔

۲۔ **مخضرمی**۔ یہ وہ شاعر ہیں جو عہد اسلام میں تھے اور جنھوں نے اسلام کو قبول کیا، چنانچہ دولت اُمیہ اور عباسیہ میں جو شاعر تھے وہ مخضر الدولتین کہلاتے تھے۔ جس اونٹنی کا آدھا کان کٹا ہو وہ مخضرمہ کہلاتی تھی چنانچہ اسی سے یہ اصطلاح قائم ہوئی۔

۳۔ **مولدین**۔ دوسری صدی ہجری کے خاتمہ تک جس قدر شعرا ہوئے وہ مولدین کہلاتے تھے۔

۴۔ **محدثین**۔ تیسری صدی ہجری (مطابق نویں صدی عیسوی) کے آغاز سے جس قدر نئے شاعر پیدا ہوئے وہ سب محدثین ہیں۔

شعرائے مولدین سے اخیر زمانہ تک جس قدر شاعر ہوئے یہ وہ ہیں جن میں شعر گوئی کا اصلی جوہر نہ تھا بلکہ آلہ صناعت یعنی عروض وقافیہ وبیان وبلاغت کی مدد سے شعر کہتے تھے، لہذا شعرائے جاہلیت سے یہ کم درجہ پر تھے (کیونکہ وہ مادرزاد شاعر تھے)

عہد خلافت عباسیہ میں جب کلام شعرا کی تدوین ہوئی تو طبقہ اول، دوم اور سوم کے شعرا کا کلام سات حصوں پر تقسیم کیا گیا اور ہر صنف کلام کا ایک جداگانہ مجموعہ مرتب کیا گیا جو حسب ذیل ناموں سے موسوم ہیں:

۱۔ معلقات ۲۔ مجمہرات ۳۔ منتقیات ۴۔ مذہبات ۵۔ مراثی

۶۔ مثنویات ۷۔ ملحمات

ان کے علاوہ مختلف شعرا کے دیوان جداگانہ ترتیب دیئے گئے ہیں جن کا بڑا حصہ یورپ، مصر، بیروت اور قسطنطنیہ میں طبع ہو چکا ہے۔ ہر مجموعہ میں کثیر تعداد شاعروں کی ہے جس کی تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

سورداس

(از پنڈت ہردے نراین پانڈے ہردیش)

ہندی کے زندہ جاوید شاعر سورداس دلی کے قریب سیہی نامی گاؤں میں ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ذات کے برہمن تھے اور کم سنی ہی سے اُنھوں نے بنارس کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، اس زمانہ میں وہاں بلبھ آچاریہ مشہور ہندو فلاسفر موجود تھے اور سورداس انھیں کے شاگرد ہو گئے۔ بلبھ آچاریہ بھگوان کرشن کے پرستار تھے چنانچہ سورداس جی کو بھی کرشن جی کی بھگتی ہو گئی، اور یہی ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ کمال فن کے اعتبار سے اُن کی شاعری ہندی لٹریچر میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ شعرائے ہندی میں سورداس کو خدائے سخن کا درجہ حاصل ہے۔ ہندی ادب کی جس شاہراہ پر وہ گامزن ہوئے اسکی پیروی کرنا آج بھی ہندی زبان کے تمام شعرا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ سورداس جی گو آنکھوں سے معذور تھے مگر اُن کا دل انوار الٰہی سے منور ہو چکا تھا، جس کی بدولت آدمی بظاہر کور چشم ہونے کے باوجود سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ۱۵۶۳ء میں اسّی برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

سورداس جی کی تصانیف میں سورساگر، ساہت لہری، سورساراولی، نل دمینتی اور بیاہلو بہت مشہور ہیں۔ ان میں سورساگر بہت ضخیم ہے جس میں ایک لاکھ پچیس ہزار اشعار ہیں۔ سورداس کو شاعری کے علاوہ علم موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا چنانچہ کوئی راگ راگنی ایسی نہیں ہے جو سورساگر میں موجود نہ ہو۔ اس کی نظموں میں جادو کا سا اثر ہے۔ دربار اکبری کے نورتن اور ہندوستان کے سب سے بڑے گویّے تان سین نے ان کے پدوں (نظموں) کے متعلق ایک بار کہا تھا کہ

दो० किधों सूर को सर लग्यो-किधों सूर की पीर
किधों सूर को पद लग्यो तन मन धुनत सरीर ॥

اس دوہے میں لفظ سور تین معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ سور معنی بہادر اور ایک قسم کا درد شکم، اور سورداس۔ دوہے کا مطلب یہ ہے کہ سورداس کہتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے جو انسان اتنا بیتاب ہو رہا ہے کیا کسی سورما کا تیر اسکے جگر کے پار ہو گیا ہے یا اس کے سول کا درد تو نہیں اُٹھا ہے۔ اگر ان دونوں میں

سے کوئی بات نہیں ہے تو ضرور اُس نے سورداس کی نظم سُنی ہوگی جس کے اثر کی وجہ سے وہ اتنا بیتاب ہورہا ہے۔" تن من دُھنت سیر" کے الفاظ میں جو لطافت اور دلآویزی ہے اُس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

ان کی شاعری میں غضب کا سوز و گداز ہے۔ ان کی تمام نظمیں جذبۂ درد سے جو شاعری کی روح ہے لبریز ہیں۔ حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں اور ان کی باریکیوں پر جتنے پہلوؤں سے انھوں نے نظر کی ہے، اتنی کسی دوسرے شاعر نے شاید ہی کی ہو۔ ان کے کلام میں جذبات نگاری اور وسعت تخیل کے ساتھ ہی ساتھ نُدرت، ظرافت اور شوخی بیان کی خوبیاں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں حسن و عشق کی چاشنی کے ساتھ ظرافت و شوخی کا چٹخارہ بھی موجود ہے جو ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی سورداس کی شاعری کیا ہے مصوری ہے۔ انھوں نے مناظر قدرت اور جذبات انسانی کی تصویریں کھینچ دی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں مصوری کا لطف آتا ہے۔ زبان میں وہ فصاحت و بلاغت اور سلاست ہے۔ گویا ایک نور کا دریا ہے کہ آہستہ آہستہ بہہ رہا ہے۔ ان کے کلام میں غیر فصیح الفاظ تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتے۔ بندش کی چستی، الفاظ کی دلآویز ترکیب، عبارت آرائی، اور زبان کی سلاست اور شیرینی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ درحقیقت اس وقت تک برج بھاشا کا ان سے زیادہ شیریں زبان اور فصیح بیان شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ ذیل میں ہم ان کی شاعری کے چند نمونے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ جن سے اُردو داں سخن شناس بھی اُن کے کمالِ فن کی داد دے سکیں گے۔

یہ سبھی جانتے ہیں کہ آنکھیں بڑی نعمت ہیں اور دنیائے حُسن میں تو ان کا درجہ بہت ہی بلند ہے ہر ایک زبان کے شعرا نے آنکھوں کی تعریف میں اپنا زورِ قلم دکھایا ہے۔ سورداس جی نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے چنانچہ اس موضوع پر ان کی ایک نظم بہت مشہور ہے جو درج ذیل ہے:-

पद- उपमा एकन नैन गही ।
कवि जन कहत २ चलि आस सुधिकर नाहिं कही ॥
कहि चकोर, बिधु मुख बिन जीवत, भंवरनहीं उडि जाता
हरि मुखकमल-कोषते बिछुर-ठाले कत ठहरात ॥
खंजन पंख पसारि उड़तनहिं क्यों पिय दिंग नहि जात ।
जो मृगतौ कत सघन श्याम बनबिच काहे न दुरिजात
ब्रज लोचन बिनु लोचन कैसे-प्रति छन ऐसे बाढ़त ।
सूरदास मीनता कछू इक जल भरि संग न छांड़त ॥

(ترجمہ) آنکھوں کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ شاعروں نے جن چیزوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے اس میں عقل اور خرد سے کام نہیں لیا، انھوں نے آنکھوں کو چکور کہا مگر یہ تشبیہ غلط ہے کیونکہ اگر آنکھیں چکور ہوتیں تو محبوب کے ماہتاب جیسے چہرہ کو دیکھے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکتیں حالانکہ یہ اس کے بغیر بھی زندہ ہیں۔ اور بھونرے سے ان کو تشبیہ دی جائے تب بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ وہ بھی روے گل کے دیکھے بغیر چین نہیں پاتا، اگر یہ بھونرا ہوتیں تو روئے گل کے گرد ضرور گھومتیں۔ یہ کھنجن بھی نہیں ہیں ورنہ ادھر اُدھر ضرور پھدکتیں اور اڑ کر اپنے محبوب کے پاس جا پہونچتیں۔ یہ آہو بھی نہیں ہیں ورنہ فراق دلربا میں صحرا میں دشت نوردی کرتیں اور چوکڑیاں بھرتیں۔ مندرجہ بالا مثالوں میں سے ایک بھی ان کے لئے موزوں نہیں۔ ہاں ان کے متعلق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ مچھلیاں ہیں جو اپنے محبوب کے عشق میں ہر وقت پر آب رہتی ہیں۔ جس طرح مچھلی پانی سے علیحدہ نہیں رہ سکتی اُسی طرح آنکھیں بھی کسی وقت پانی سے جدا نہیں رہتیں، پانی ہی پر ان کی زندگی کا دارومدار ہے ورنہ یہ آتش ہجراں سے جلکر ضرور خاک سیاہ ہوگئی ہوتیں۔

بیان میں غضب کا سوز و گداز ہے، کلام میں درد اور بانکپن دونوں شیر و شکر کے مانند گھلے ملے ہیں وسعت تخیل قابل داد ہے۔ کسی انگریز شاعر کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ (Imagination is Joy) تخیل مسرت ہے۔

ہجراں نصیب عاشق کو قدرتی مناظر کا حُسن دل خوش ہونے کے بجائے تکلیف دہ ہوتا ہے چنانچہ سورداس نے بھی چاندنی رات میں فرقت نصیب عاشق کی حالت کس خوبی سے بیان کی ہے، فرماتے ہیں:-

पद - पिया बिनु साँपिनि कारी रात ।

कबहुँ बामिनी होति जुन्हैया - डसि उलटी है जात

(ترجمہ) محبوب کے بغیر رات کالی ناگن ہو رہی ہے۔ کالی ناگن کی پیٹی سفید ہوتی ہے اور اس کا یہ دستور ہوتا ہے کہ کاٹنے کے بعد وہ اُلٹ جایا کرتی ہے چنانچہ اُلٹنے پر اس کی سفید پیٹی نمودار ہوتی ہے۔

اسی طرح چاندنی رات میں جب چاندنی بادلوں کے اندھیرے میں ڈھک جاتی ہے تو عاشق کو وہ کالی ناگن کی طرح ڈسنے لگتی ہے، پھر تھوڑی دیر بعد وہ چاندنی اپنا روئے تاباں بادلوں کے گھونگھٹ میں سے باہر نکالتی ہے۔ عاشق سمجھتا ہے کہ ناگن ڈس کر الٹ گئی ہے اور اس کی پیٹی کی سفیدی نمودار ہو رہی ہے۔

تشبیہ اور وجہ تشبیہ دونوں نہایت لاجواب ہیں

عاشق کو ہر وقت معشوق ہی کا تصور رہتا ہے، اس وجہ سے اسے اپنے محبوب کی جدائی محسوس نہیں

ہوتی۔ شاعروں نے اس خیال کو مختلف طریقوں پر بیان کیا ہے۔ مثلاً :-

(مومن) تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مصحفی) بھیجدیا ہے خیال اپنا عوض لینے سدام اس قدر یار کو غم ہے میری تنہائی کا

(میر حسن) دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

(لااعلم) تصور سے تمہارے دل کو تسکیں دے ہی لیتے ہیں تم آؤ یا نہ آؤ کام اپنا ہو ہی جاتا ہے

اسی طرح سورداس نے بھی اس خیال کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

दोहा· बांह छुड़ाए जात हो निबल जानिकै मोहिं ।

हिरदे सों जब जाइहौ· सबल बदूंगो तोहिं ॥

(مطلب) اے میرے محبوب تو خواہ مجھ سے ہاتھ چھوڑا کر بھاگ جائے لیکن اگر میرے دل سے بھاگ کر کہیں اور جا سکے تو میں تجھے بہادر سمجھوں۔ اگر تجھے ہمت ہو تو اس کی کوشش کرکے دیکھ لے۔

آنکھوں پر سورداس جی کا ایک اور خیال سنیئے :-

पद- मेरे नैना बिरहा की बेलि बई

सींचत नीर नैन के सजनी मूल पताल गई ।

बिकसति लता सुभाय आपने छाया सघन भई ॥

अब कैसे निरबारौं सजनी सब तन पसरि छई ॥

یعنی میری آنکھوں نے ہجر کی ایک بیل لگائی ہے، یہ خود مالی کا کام کرتی ہیں، اور دن رات آنسوؤں سے شاداب رکھتی ہیں۔ اس بیل کی جڑیں بہت گہرائی تک نیچے پھیلتی جاتی ہیں۔ اپنی عادت کے بموجب یہ بیل چاروں طرف چھا گئی ہے اور اب مجھے ہر طرف سے ڈھک لیا ہے۔

برسات کی اندھیری راتوں میں ساری دنیا چین سے سو رہی ہے، مگر عاشق کی آنکھوں میں نیند کہاں! آدھی رات کے سناٹے میں پپیہا بول اٹھا پی کہاں پی کہاں! اس آواز کو سنتے ہی عاشق کے زخمی دل کے ٹانکے ٹوٹ گئے اور زخم ہرا ہو گیا۔ اس پر سورداس جی کیا کہتے ہیں ذرا اُن ہی کی زبان سے سنیئے :-

पदः- बहुत दिन जीवौ पपिहा प्यारे ।

बासर रैनि नाव लै बोलत-भयो बिरह जुर कारो ।

आपु दुखित पर दुखित जानि जिय चातक नाम तिहारो ॥

देखौ सब बिचारि हाय जिय बिछुरन को दुख न्यारो ।

जाहि लगै सोई पै जानै प्रेम बान अनियारो ॥
सूरदास प्रभु स्वाति बूंद लगी तज्यो सिन्धु करि खारो ॥

(مطلب) پیارے پپیہے تو دنیا میں بہت دن تک زندہ رہے کیونکہ تو شب و روز اپنے پیارے کا نام لیا کرتا ہے (پی کہاں، پی کہاں، کہتا ہے) تیرا جسم آتش ہجر سے جلکر سیاہ ہو گیا ہے (پپیہے کا رنگ کالا ہوتا ہے) تو اپنے علاوہ دوسروں کے لئے بھی غمگین رہتا ہے، اسی لئے تیرا نام چاتک یعنی دوسروں کا شریک رنج پڑ گیا ہے۔ اس دنیا میں درد فرقت سے بڑھکر دوسری مصیبت نہیں ہے۔ اس درد کی تلخی کو وہی محسوس کر سکتا ہے جس کے سینہ میں کبھی عشق کا تیر پار ہوا ہو۔ پپیہے تو نے سوانت کے بادلوں کے دو بوند پانی کے لئے سمندر کے پانی سے بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔

بادلوں کو گرجتے ہوئے دیکھکر سورداس جی کہتے ہیں:-

पद:- बहुरे बदरा बरसन आये ।
अपनी अवधि जानि नद नन्दन गरजि गगन घन छाये ।
सुनियत है सुरलोक बसत है सेवक सदा पराये ॥
चातक कुलकी पीर जानिकै जहं तहं से उढि धाये ॥
पद:- किधौं घन गरजत नहिं उन देसन ।
किधौं वहि देस मोर चातक पिक बधिकन बधे बिसेसनि
किधौं वहि देस बाल नहिं झूलत गावत गीत सहे सनि ॥

(ترجمہ) دیکھئے برسات شروع ہوتے ہی اپنے محب موروں اور پپیہوں کو آرام دینے کے لئے بادل بھی آ گئے۔ مگر افسوس میرے محبوب نے میری خبر نہ لی۔ یہ بادل بیچارے دوسرے کے نوکر ہیں اور دوسرے ملک یعنی آسمان پر رہتے ہیں مگر تکلیف برداشت کر کے کسی نہ کسی طرح موقعہ پر آ ہی گئے۔ کیا میرے محبوب کے دیار میں بادل نہیں گرجتے، کوئلیں نہیں کوکتیں، ساون کی رم جھم پھوہاریں نہیں پڑتیں، کیا وہاں شکاریوں نے سبھی موروں اور کوئلوں کو ہلاک کر دیا۔ کیا اس دیار کی حورو ش نازنین جھولے کی رسیوں کو اپنے نرم نرم گورے گورے ہاتھوں سے پکڑ کر خوشی سے اُچھلتی ہوئی میٹھی میٹھی آواز میں ساون نہیں گاتیں۔

؎ غالب نے بھی کہا ہے:-
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو ۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا۔

انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کی طرح سورداس بھی نیچر کے عاشق صادق ہیں اور نیچر ہی کے ساتھ رنج وراحت کا احساس و اظہار کرتے ہیں۔ اگر ان کا دل درد و غم سے بھرا ہوا ہے تو وہ اپنے ساتھ بادل کو بھی روتا ہوا پاتے ہیں۔ بجلی کی کڑک میں ان کو اپنے دل دردمند میں بھی ٹیس معلوم ہوتی ہے۔ مور کی آواز ان کو اپنے محبوب کی صدا سنائی دیتی ہے۔ غرض نیچر میں جس طرف بھی اُن کا دھیان جاتا ہے اُن کو اپنی دلی کیفیت و واردات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ شاعر دراصل ایک مصوّر ہے جو انسانی زندگی کے اُن پوشیدہ رازوں کی تصویر کھینچتا ہے جن پر عوام الناس کی نظر نہیں جاتی۔ ورڈسورتھ کا قول ہے کہ نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں انسانی جذبات کی صحیح تصویر کھینچی جائے[1]۔ یہ بات سورداس کی شاعری پر بھی چسپاں ہوتی ہے۔

اخیر میں محبت کے متعلق سورداس کی ایک مشہور نظم درج کرکے اب ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

पदः- प्रीति करि काहू सुख न लह्यो ।
प्रीति पतंग करी दीपक सों आपे प्राण दह्यो ॥
अलिसुत प्रीति करी जलसुतसों सम्पति हाथ गह्यो ॥
सारंग प्रीति करी जो नादसों सन मुख बान सह्यो ।
सूरदास पिय बिन दुख दूनो नैनन नीर बह्यो ॥

(ترجمہ) اس دنیا میں محبت کرکے کسی نے آرام نہیں پایا۔ پروانہ نے شمع سے محبت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ راہِ الفت میں جلکر خاک ہوگیا۔ بھونرے نے کنول کے پھول سے محبت کی، جب رات کو کنول کی کلی بند ہوگئی تو اُس نے سوچا کہ شبِ وصال کے لطف کو ہاتھ سے کیوں جانے دوں اُسی میں بند پڑا رہا، صبح کے وقت ایک ہاتھی تالاب میں پانی پینے آیا اور کنول کے پھول اور پتوں کے ساتھ ہی اُس بھونرے کو بھی کھا گیا۔ بھونرے کی محبت کا انجام یہ ہوا۔ اور ہرن شکاری کی بین سے محبت کرتا ہے اسی بین کے ذریعہ جس پر ہرن قربان ہے شکاری اُسے قید کرتا ہے یعنی ہرن کو بھی محبت میں جان کھونی پڑتی ہے۔ ان باتوں سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ دنیا میں عشق و محبت کا دم بھرنے والوں کو کبھی آرام نہیں نصیب ہوتا۔

---

[1] The beauty of poetry is to paint the human life truly.

دھرماتما مالوی جی

(از اقبال ورما سحر ہتگامی)

بزرگ قوم پنڈت مدن موہن صاحب مالوی کے نام نامی کے ساتھ جو لقب زیب عنوان ہے وہ موجودہ زمانہ کے عظیم ترین شخص مہاتما گاندھی کی جانب سے عطا ہوا ہے اور واقعی پنڈت جی کی نیکی و نیک نفسی صلح جوئی و اولوالعزمی، علم دوستی و حق پرستی کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے لئے اس سے بہتر لقب ہو نہیں سکتا ہے۔ دھرم میں بہت بڑی جامعیت ہے، اور کسی شخص کا دھرماتما ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی ذات مجموعۂ صفات میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی بدولت انسان دیوتا کہلانے کا اہل ہو سکتا ہے

پنڈت جی کے والد پنڈت برجناتھ صاحب قدیم وضع کے پنڈت تھے اور سنسکرت کے عالم و فاضل ہونے کے علاوہ مذہبی واعظ بھی تھے۔ چنانچہ سریمد بھاگوت اور پرانوں کی کتھائیں اس انداز اور صفائی کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ سبھی لوگ اُن کی قابلیت سے یکساں مستفید ہوتے تھے

مالوی جی ۲۵۔ دسمبر ۱۸۶۱ء کو بمقام الہ آباد پیدا ہوئے، اوائل عمر میں وہ عام دستور کے مطابق پاٹھ شالاؤں میں پڑھتے رہے۔ رفتہ رفتہ انگریزی تعلیم کی نوبت آئی، یہاں تک کہ ۱۸۷۹ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے میور سنٹرل کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۸۴ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی، جس کے بعد اُنھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول الہ آباد میں بعہدہ اسسٹنٹ ماسٹری ملازمت اختیار کرلی۔ مگر ۱۸۸۷ء میں راجہ رامپال سنگھ مرحوم والی ریاست کالا کانکرہ مالک اخبار ہندوستان کے اصرار سے اُنھوں نے دو سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر اخبار مذکور کی اڈیٹری منظور کرلی۔ پنڈت جی کی قابلیت اور قومی خدمت کی لگن نے اُس شعبہ میں بھی اپنا رنگ دکھایا۔ دو سال کے بعد آپ ہندوستان کی اڈیٹری سے کنارہ کش ہو کر "انڈین یونین" نامی انگریزی اخبار کے ایڈیٹر ہوگئے جو بالآخر ایڈوکیٹ (لکھنؤ) سے ملحق ہو گیا تھا۔ آپ نے پبلک خدمات کے تعلق سے اخبار کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے "ابھیودے" نامی ہندی ہفتہ وار کا اجرا کیا جو ہنوز جاری ہے ۱۹۰۹ء میں آپ نے صوبہ کے مشہور و معروف روزنامہ لیڈر کے اجرا کے لئے بھی انتہائی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ غرضیکہ اخبار تک ہر اہم کی خدمت انجام دی ہیں

اور جنکی بدولت وہ رعایا و سرکار ہر دو کی نگاہوں میں مقبول ہو چکا ہے اُن کا اعتراف نہ کرنا کفران نعمت ہوگا
پنڈت جی نے اپنے اخباری مشاغل کو جاری رکھتے ہوئے بھی ۱۸۹۱ء میں ایل ایل۔ بی کا امتحان پاس کر لیا اور ۱۸۹۳ء سے ہائی کورٹ الہ آباد میں وکالت کرنے لگے۔ مگر پنڈت جی کو نہ اس پیشہ میں کسی غیر معمولی فروغ کے حاصل کرنے کی تمنا تھی اور نہ انھوں نے کوئی غیر معمولی فروغ حاصل کیا، اُن کا فطرتی رجحان رفاہ عام کے کاموں کی جانب تھا اس لئے اُن کا قدم پھر اُسی راستہ پر آ جاتا تھا جو اُسی منزل مقصود کی طرف لیجانیوالا تھا
تعلیمی ترتیبوں کے متعلق سوچتے ہوئے پنڈت جی نے اُس دقت کو محسوس کیا جو طلبا کو الہ آباد میں قیام کے متعلق ہوتی تھی، چنانچہ اُسے رفع کرنے کی غرض سے انھوں نے سر سندر لال آنجہانی سے ملکر بڑی تندہی سے ہندو بورڈنگ ہوس قایم کیا اور انھوں نے چندہ کی فراہمی کے لئے اپنے صرفہ سے دور دراز کے سفر کی زحمت گوارا کی۔ مگر پنڈت جی کے تعلیمی کارناموں میں سب سے بڑی چیز بنارس ہندو یونیورسٹی ہے جس پر انھوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ وار دیا ہے۔ اس عظیم الشان تعلیم گاہ کی قائمی کے لئے پنڈت جی نے برسوں تک جس سرگرمی اور مستعدی سے کام کیا وہ واقعی انھیں کا حصہ تھی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آپ کو اس جانفشانی کا جو ثمرہ ملا وہ آپ کے علمی نصب العین کے سراپا حسب حال اور علو ہمتی و اولوالعزمی کے ہر طرح سے شایان ہے۔

پنڈت جی کو تقریر میں وہ ملکہ حاصل ہے کہ باید و شاید، اُن کی جادو بیانی سامعین کے دلوں کو مسخر کر لیتی ہے، فن تقریر میں بنگال کے مشہور مقرر سر سریندر ناتھ بنرجی مرحوم کے بعد مالوی جی ہی کا نمبر ہے۔ مالوی جی کو انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ ابتدا ہی سے گہری عقیدت تھی۔ وہ اس کے دوسرے ہی اجلاس میں جو ۱۸۸۶ء میں بمقام کلکتہ منعقد ہوا تھا ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے، وہیں انھوں نے اپنی پہلی تقریر فرمائی تھی جس کی مسٹر ہیوم مرحوم نے اپنی کانگریس کی رپورٹ میں بڑی تعریف کی ہے۔ دوسرے سال مدراس کانگریس کے موقع پر انھوں نے جو تقریر کی وہ بھی مقبول عام ہوئی، مسٹر ہیوم، مسٹر نارٹن، سر مادھو راؤ وغیرہ نے اسکی داد دی۔ تیسرے سال مالوی جی کی کوشش سے کانگریس کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں ہوا ان سرگرمیوں اور کارگزاریوں ہی کی وجہ سے پنڈت جی کا شمار مقتدر کارکنان کانگریس میں ہونے لگا اور اُن کی شہرت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، شدہ شدہ ۱۹۰۸ء میں آپ صوبجاتی کانفرنس واقع لکھنؤ کی صدارت کے لئے منتخب کئے گئے اور اُس کے دوسرے ہی سال آپ کو لاہور کانگریس کی صدارت کا اعزاز عطا ہوا ۱۹۱۸ء میں وہ دوبارہ دہلی کانگریس کے صدر منتخب ہوئے جس میں اول مرتبہ تقریباً سات سو کسان ڈیلیگیٹوں نے بھی شرکت کی۔ پنڈت جی نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد کی بھی تلقین کی تھی۔ اس کے متعلق

آپ کی بے تعصبی اور فراخدلی کا اظہار اُس خط سے ہوتا ہے جو آپ نے سنہ ۱۹۲۴ء میں موپلا ریلیف کے سلسلے میں مہاتما گاندھی کو لکھا تھا جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ :-

"عقلمند لوگ صرف اُسی شخص کو بھلا کہتے ہیں جو بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی کرتا ہے، صرف وہی لوگ نیک ہیں جو اپنے ساتھ بدی کرنے والوں سے بھی نیکی کرتے ہیں، ایسی نیک ارواح سے دنیا کی زینت ہوتی ہے جو اُن کے وجود کی بدولت بہتر بن جاتی ہے۔"

جب سنہ ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے قدیم رویہ سے منحرف ہو کر سرکار سے ترک موالات کی ٹھانی تو مالوی جی نے اس سے اپنے اختلاف رائے کا اظہار کیا مگر تحریک سودیشی سے پنڈت جی کو اس زمانہ سے پریم ہے جب اُس کے نام سے ملک میں بہت کم لوگ واقف تھے۔ چنانچہ آپ ہی کی کوشش سے "دیسی تجارت کمپنی" کے نام سے الہ آباد میں ایک کمپنی سنہ ۱۸۸۱ء میں قائم ہوئی۔ بہرحال پنڈت جی اُس وقت کانگریس سے علیحدہ رہتے ہوئے بھی ملک و قوم کی جانب سے بے پروا نہیں رہے اور پیروانِ کانگریس کے نشانۂ ملامت ہونے کے باوجود وہ اپنی صلح جویانہ روش کے مطابق مصالحتی کوششوں میں مصروف رہے یہاں تک کہ سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں کانگریسی تحریک کے وسعت پذیر ہونے پر انھوں نے اس امر کی بار بار کوشش کی کہ کانگریس اور سرکار میں کسی طرح مفاہمت ہو جائے مگر جب چوری چورا کے افسوسناک حادثہ کے بعد تحریک نان کوآپریشن از خود بند کر دی گئی تو پھر کسی مفاہمت کی ضرورت ہی باقی نہ رہی اور ملک میں امن و سکون کا تسلط ہو گیا۔

پنڈت جی کی ہمہ گیر طبیعت کسی ایسے کام سے بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکتی ہے جس کا کرنا آپ کے نزدیک ملکی بہبود کا باعث ہو۔ چنانچہ آپ نے کونسل اور اسمبلی کے کاموں سے بھی خاص دلچسپی لی جہاں انھوں نے سالہا سال تک مسلسل کام کیا۔ وہ سنہ ۱۹۰۲ء میں آنریبل پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب کی جگہ ممبر منتخب ہو کر لیجسلیٹو کونسل میں داخل ہوئے تھے اور بالآخر ۲۱- اپریل سنہ ۳۰ء کو "ٹیرف بل" کی مخالفت میں لیجسلیٹو اسمبلی کی ممبری سے مستعفی ہو گئے۔ اُسی بل کی مخالفت میں اُنھوں نے سودیشی کی اشاعت شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کی تحریک ملک میں پھر زور پکڑ رہی تھی اور سرکاری تشدد کا دور بھی شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اسی تشدد کی مخالفت میں کانگریس کی مجلس عاملہ کے ممبر ہوئے اور ۲- اگست سنہ ۳۰ء کو بمبئی کے ایک کانگریسی جلسہ میں شامل ہو کر گرفتار ہو گئے، اُس وقت آپ پر عدالت سے سو روپیہ جرمانہ ہوا اس رقم کو کسی نامعلوم شخص نے ۱۰ اگست کو ادا کر دیا اور پنڈت جی رہا ہو گئے۔ مگر ۲۷ اگست کو دہلی میں مجلس عاملہ کے دیگر ممبروں کے ساتھ وہ پھر گرفتار کئے گئے اور انھیں چھ ماہ قید محض کی سزا ہوئی۔ ۱۹ جنوری سنہ ۳۱ء کو وزیر اعظم

برطانیہ کا مشہور و معروف سرکاری اعلان ہوجانے پر جب مجلس عاملہ کے جملہ ممبران رہا ہوئے تو آپ کی رہائی بھی عمل میں آئی۔

اس کے بعد ۵۔مارچ ۱۹۳۱ء کا مشہور تاریخی سمجھوتہ ہونا، کانگریسی قیدیوں کا رہائی پانا، کانگریس کا دوسری گول میز کانفرنس میں مدعو کیا جانا وغیرہ جملہ واقعات ابھی بالکل تازہ ہیں اور یہاں پر اُن کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مختصر یہ کہ ۲۹۔اگست ۱۹۳۱ء کو پنڈت مالوی جی بھی مہاتما گاندھی کے ساتھ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے راجپوتانہ نامی جہاز پر بمبئی سے لندن کے لئے روانہ ہوگئے۔ کانفرنس مذکور میں شامل ہوکر آپ نے اپنی مؤثر تقاریر کے ذریعہ اپنے ملک کا حق نیابت ادا کیا۔ اب آپ ۱۳ جنوری ۱۹۳۲ء کو بمبئی واپس آگئے ہیں اور آجکل ملک کے بڑے بڑے لبرل لیڈروں کے ساتھ موجودہ سیاسی صورت حال پر غور کر رہے ہیں۔

پنڈت جی کے مزاج میں فقر و غنا کا انتہائی دخل ہے۔ مذہب کی پرستش کو تو اُن کی فطرت ثانوی کہدینا بیجا نہ ہوگا۔ موصوف ہی نے ۱۹۰۶ء میں سناتن دھرم مہاسبھا الہ آباد کی بنیاد ڈالی تھی، مگر پنڈت جی سناتن دھرمی اور قدامت پرست ہوتے ہوئے بھی اصلاح و ترقی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اس کا پتہ اُن کے حال کے سفر یورپ سے لگتا ہے "چھوت چھات" کے متعلق بھی آپ کے خیالات میں تغیر عظیم ہوگیا ہے فی الجملہ ہم اُن کی مذہب پرستی کو حق پرستی سے موسوم کرسکتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال عین الیقین کے درجہ پر پہونچ جاتا ہے جب ہم آپ کے اُس پیغام پر غور کرتے ہیں جسے ممدوح نے ابھی گذشتہ سفر یورپ میں "کولمبیا گراموفون کمپنی" کے رکارڈوں کے ذریعہ دنیا کو دیا ہے۔ پیغام مذکور کے دوران میں آپ فرماتے ہیں:۔

"..... کثیر التعداد انسان ایشور کے بارہ میں باتیں کرتے ہیں، اُس کے پاک نام کا ورد کرتے ہیں، اور اُس کی ہستی پر اعتقاد رکھتے ہیں، مگر چند ہی لوگوں میں یہ اعتقاد کام کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ واقعی ایشور کا وجود ہے، اس سے بھی کم لوگوں کو اس کے وجود کا تصور ہوتا ہے۔ انسانی تہذیب کو زیادہ بلند درجہ پر پہونچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن تمام معلومات کو یکجا کرنے کی بین الاقوامی حیثیت سے کوشش کیجائے جنھیں مذہبی عالموں، فلاسفروں اور سائینس دانوں نے حاصل کیا ہے اور ایشور کے وجود کے متعلق کوتاہ سے کوتاہ فہم والوں کو بھی سمجھایا جائے۔ ایشور کے وجود اور اس کے انسانوں کے ساتھ والے تعلق کو تمام و کمال ہر مرد و زن کے ذہن نشین کرادیا جائے اور ساتھ ہی اُن کو مذہب کے وہ بنیادی اصول بتلادئے جائیں جن پر انسانی اخلاق کا دار و مدار ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے"۔

"..... تمامی خلقت میں ایک ہی ذی روح طاقت ہے جو ہر کہیں ہر شکل میں پائے جانے والے جاندار میں

موجود رہتی ہے، یہ معلوم کرنے پر نہ صرف انسانوں ہی کے مابین مساواتی تعلق قائم ہو جاتا ہے بلکہ انسانوں اور جملہ دیگر جانداروں کے مابین بھی۔ اسی قسم کے سلسلہ خیالات سے دو بنیادی اصول اخذ کئے گئے ہیں:۔ چونکہ ایک ہی ایشور سبھی جانداروں میں موجود ہے اسلئے مجھے دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرنا چاہیئے جیسے میں دوسروں کی جانب سے اپنے متعلق ہونا پسند نہیں کرتا، اور مجھے وہی کرنا چاہیئے جیسے میں چاہتا ہوں کہ دوسرے میرے ساتھ کریں۔ ہزاروں برس پہلے ہندوستان کے رشیوں نے اوامر و نواہی کی صورتوں میں ان ہر دو اصولوں کا اعلان کیا تھا جنھیں مذہب و اخلاق کا خلاصہ کہنا چاہیئے......"

پنڈت جی کی مذہب فہمی اور وسیع الخیالی کی اس سے روشن تر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

ابھی ۲۵۔ دسمبر ۳۱ء کو پنڈت مالوی جی کی عمر کا سترواں سال پورا ہوا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند کریم اس فنافی القوم بزرگ کو عرصہ تک سلامت با کرامت رکھے اور قوم کو اُس کی سالگرہ منانے کے متعدد موقعے عطا کرے۔ آمین۔

آداب معاشرت

خوش خلقی، تحمل اور انکسار انسانیت کا زیور ہیں اس لئے اُن کو کبھی مت چھوڑو۔

جس طرح حد سے زیادہ درشتی و سختی بُری ہے اسی طرح حد سے زیادہ نرم مزاجی بھی اچھی نہیں۔

مجلس میں بغیر پوچھے اپنی رائے نہ دو، خواہ مخواہ دخل نہ دیا کرو۔ اگر کوئی شخص بات کر رہا ہو تو درمیان میں مت بولو

محفل میں لمبی بات نہ کرو جس سے لوگ اکتا جائیں اور ایسی بات نہ کرو جس سے اہل محفل کو دلچسپی نہ ہو۔

اگر کسی سے ملنے جاؤ تو اس کے وقت کا خیال رکھو۔ اگر وہ زیادہ مصروف ہو تو مطلب کی بات جلدی ختم کر کے چلے آؤ۔

کسی کے گھر جاؤ تو اس کے سامان لباس اور دیگر اشیا پر نکتہ چینی مت کرو۔

کسی کے عیب کو مجمع میں ظاہر کر کے اسکو شرمندہ مت کرو۔

مہمان کو کھانے پینے کی چیز دیتے وقت اسکی قیمت یا لاگت کا ذکر مت کرو۔

کسی سے کوئی چیز مانگ کر لاؤ تو عین وعدے پر یا اُس سے کچھ پہلے ہی واپس کر دو۔

وعدہ بہت کم کیا کرو لیکن جو وعدہ کرو اُسے ضرور پورا کرو۔

کسی سے ملنے جاؤ تو اس کے مذہبی عقائد یا رسم ورواج پر نکتہ چینی مت کرو۔

(ماخوذ)

چین اور دیگر ممالک کے گداگر

(از سید اظہر حیدر سہارنپوری)

دنیا کے کسی حصے میں اس قدر گداگر دیکھنے میں نہیں آتے جتنے چین میں ہیں۔ ملک چین میں ایک طرح پر گداگروں کی حکومت ہے اور وہ سب کے سب ایک گداگر بادشاہ کے زیر حکومت رہتے ہیں۔ ہر ایک علاقہ میں ایک حاکم ہوتا ہے جس کا فیصلہ سب معاملات میں آخری سمجھا جاتا ہے۔ ان اعلیٰ افسروں کی اجازت کے بغیر کوئی غیر شخص ان کی جماعت میں داخل نہیں کیا جاتا۔ ان بھکاریوں کا انتظام ایسا اعلیٰ ہے کہ ہر شخص عام طور پر ان کے سوال کو پورا کرتا ہے۔ اور کبھی کچھ دینے سے انکار نہیں کرتا۔ اگر کبھی کوئی شخص ایسا کرے تو اس علاقہ کے سارے فقیروں کو اس امر کی اطلاع کر دی جاتی ہے جو اسے ہر ممکن طریقہ سے تکلیف دیتے اور اُس کے کام میں خلل انداز ہوتے ہیں اور بالآخر وہ شخص مجبوراً بہت جلد اپنی ضد سے باز آجاتا اور فقیروں کے سوال کو رد کرنا ترک کر دیتا ہے

چین میں ان فقیروں کا اس قدر زور ہے کہ اکثر دکاندار ان کے متواتر تقاضوں سے بچنے کے لئے یہ انتظام کرتے ہیں کہ اس علاقہ کے گداگروں کے حاکم کو کوئی مقررہ رقم ماہوار دیکر اُتنے عرصہ کے لئے ان سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ رقم کرایہ دوکان کے کرایہ کے لحاظ سے قائم کی جاتی ہے اور اس طرح ہر دکاندار اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس قدر رقم ماہوار ادا کر کے فقیروں سے پیچھا چھوڑانا مفید ہے یا اس میں کسی قسم کا خسارہ ہوتا ہے۔ رقم مقررہ کی ادائیگی پر دکاندار کو ایک یادداشت ملجاتی ہے جس کی رو سے گداگروں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ میعاد مقررہ تک اُسے دق نہ کریں۔ دکاندار اسکو عام طور پر باہر دروازہ پر چسپاں کر دیتے ہیں جس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ گداگر باہر ہی سے اُسے دیکھکر آگے چلا جاتا ہے اور سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ جن دکانداروں کے پاس یہ قیمتی یادداشت موجود ہو وہ ہمیشہ اسکی احتیاط رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ گم ہو جائے تو بیشمار گداگر آکر اُسے تنگ کرنا شروع کر دینگے اور بدقسمت دوکاندار کا یہ کہنا کہ وہ مقررہ رقم ادا کر چکا ہے کچھ مفید نہ ہوگا۔ اس صورت میں بیچارے دکاندار کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ گداگر حاکم کے پاس اس امر کی قسم کی رسید کے لئے درخواست کرے مگر

اسکا حافظہ ایسا تیز نہیں ہوتا کہ گزشتہ ادائیگی کو یاد رکھے، پس دکاندار اگر ان موذیوں سے نجات حاصل کرنا چاہے تو اُسے مجبوراً دوبارہ رقم ادا کرکے دوسری رسید حاصل کرنا پڑتی ہے۔

خوش قسمتی سے چین میں خیرات کی رقم کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ اگرچہ ہر شخص کو ایک دن میں کئی مرتبہ خیرات دینی پڑتی ہے مگر اس کا اندازہ عام طور پر ایک کیش مقرر ہے اور چونکہ ایک سو کیش ساڑھے تین آنہ کے برابر ہوتے ہیں اس لئے خیرات پر کچھ زیادہ رقم صرف نہیں ہوتی

چونکہ چین میں ہر چیز سستی ہے اس لئے بہت ہی تھوڑی رقم میں لوگوں کا گذر ہو جاتا ہے مثلاً پیکن میں ایک شخص نصف کیش صرف کرکے رات بسر کر سکتا ہے۔

یہاں ایک کمپنی نے ایک انسٹی ٹیوشن قائم کر رکھا ہے جس کا نام "کی مس خان" یا مرغی کے پروں کا مکان ہے۔ اس مکان میں ایک وسیع احاطہ ہے جس کے فرش پر پروں کی ایک تہہ بچھی ہوئی ہے۔ رات کے وقت گداگر اس میں داخل ہونے شروع ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک فقیر ملازم کو دروازے پر نصف کیش دیدیتا ہے اور اندر جا کر پروں پر لیٹ جاتا ہے جس وقت کافی آدمی اندر داخل ہو چکتے ہیں تو ملازم دروازہ بند کرکے زور سے گھنٹہ بجاتا ہے اور پھر ایک طرف سے چرخی کو گھمانا شروع کرتا ہے، یکایک ایک بہت بڑا کمبل ان گداگروں پر آگرتا ہے۔ اس کمبل میں متعدد سوراخ بنے ہوئے ہوتے ہیں، ہر گداگر ایک سوراخ تلاش کرکے اس میں سے اپنا سر باہر نکال لیتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ باہر والا ملازم غلطی سے اس قدر آدمی اندر داخل کر لیتا ہے جن کی تعداد کمبل کے سوراخوں سے زیادہ ہوتی ہے مگر یہ بات بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے، کیونکہ سوراخوں کی کشمکش ختم ہو جانے کے بعد اگر اس بدقسمت کی چیخیں سنائی دیتی ہیں جس کا سوراخ نہ ملنے کی وجہ سے دم گھٹا جاتا ہو تو ملازم مذکور اس مشکل کو بڑی آسانی سے رفع کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کمبل کے نزدیک ہو کر اس گداگر کو جو اس کے قریب ہو ٹانگوں سے پکڑ کر کمبل کے نیچے سے کھینچ لیتا ہے اور اُسے احاطہ سے باہر نکال کر اُس کا نصف کیش اس کے پیچھے بازار میں پھینک دیتا ہے اس کے بعد وہ ایک لمبے بانس کے ذریعہ سے ہر شخص کو اس کے سوراخ کا پتہ بتاتا ہے اور اس طرح پر یہ مشکل رفع ہو جاتی ہے۔

صبح کے وقت پھر گھنٹہ بجتا ہے، جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ گداگر اپنے اپنے سر سوراخوں میں سے نکال لیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان میں سے بعض کمبل کے ساتھ چھت تک اُٹھ جائیں۔ اس کے بعد ان سب کو باہر نکال دیا جاتا ہے۔ چینی اس آرام گاہ کو بہت پسند کرتے ہیں اور شاذ و نادر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کمبل کے نیچے اُترنے کے بعد اس میں کوئی سوراخ خالی رہ جائے

اطالیہ میں بھی گداگروں کی کثرت ہے، جس کی بعض وجوہ غالباً لوگوں کی کاہلی، افلاس اور شہر میں دولتمند اجنبیوں کا بکثرت وارد ہونا ہے۔ اٹلی میں گداگروں کو پارسائی کا جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ تھوڑا عرصہ ہوا وہاں بہت سے اس قسم کے مذہبی فرقے موجود تھے جو صرف سخی لوگوں کی خیرات پر بسر اوقات کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ آجکل یہ فرقے موجود نہیں ہیں تاہم ان کا اثر کچھ نہ کچھ باقی ہے۔

ہسپانیہ کے گداگر اپنی بدصورتی کے ذریعہ راہروؤں کے دلوں میں رحم کا خیال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ملک میں بہت سے کارخانے اچھے بھلے آدمیوں کو لنگڑا لولا بنانے کے لئے قائم ہیں۔ ان کارخانوں میں حد درجہ کے فرومایہ لوگ بچوں کے اعضاء کو موڑتے اور ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچاتے ہیں، اور جب وہ اس طرح بدنما ہو جاتے ہیں تو انھیں بازاروں میں لیئے پھرتے ہیں اور لوگ ان پر ترس کھا کر خیرات دیدیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لنگڑے بچوں کو لکڑی کی گاڑیوں میں بٹھا کر باہر بھیجا جاتا ہے، ان کے مالک ان بچوں کی سخت نگرانی کرتے ہیں، اور اگر کافی روپیہ نہ کما سکیں تو انھیں بھوکا مارتے اور بہت سی تکلیفیں دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ یقین نہیں کرسکتے کہ مہذب ملکوں میں بھی ایسی شیطانی حرکات ہوتی ہیں مگر یہ واقعہ ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کی تصدیق کی ہے۔

برازیل کے گداگر غالباً ساری دنیا میں زیادہ بے شرم ہوتے ہیں، وہ کافی آمدنی پیدا کر لیتے ہیں اور اس بات کو چھپانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ یہاں کسی فقیر کو خچر یا گھوڑے پر سوار دیکھنا معمولی بات ہے۔ ایک سیاح بیان کرتا ہے کہ ایک دن ایک شخص نے جو ایک بانس سے لٹکے ہوئے ہنگورے میں لیٹا ہوا تھا (اس بانس کو دو حبشی اُٹھائے ہوئے تھے) مجھ سے سوال کیا۔ ایک ایسے شخص کو جو ہنگورے میں لیٹ کر ادھر ادھر جانے کی توفیق رکھتا تھا خیرات مانگتے دیکھکر مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے اُسے ملامت کرنی شروع کی، مگر اُس نے بڑی نخوت سے میری طرف دیکھکر جواب دیا "جناب میں آپ سے روپیہ مانگتا ہوں، نصیحت نہیں مانگتا۔"

پیرس میں گداگروں کی کثرت زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ فرانس کے مختلف دیہاتی علاقوں میں بھیک مانگنا ممنوع ہے، اور اس لئے وہ لوگ جو کاہل الوجود ہیں اور کام کرنے سے گھبراتے ہیں وہ اس خیال سے دارالخلافہ میں آجاتے ہیں کہ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی آمدنی کا ذریعہ نکل آئیگا۔ پیرس میں ایک دفتر ہے جہاں سے گداگر لوگ کچھ فیس ادا کرکے ان لوگوں کا نام اور پتہ معلوم کرسکتے ہیں جو عام طور پر خیرات دیتے ہوں۔ اس دفتر کا مالک مختلف ذریعوں سے اس واقفیت کو حاصل کرتا رہتا ہے اور پھر

اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ گداگروں کو اس شخص سے حاصل کی ہوئی واقفیت پر بھروسہ رہتا ہے اور وہ چند سخی شخصوں کا نام اور پتہ معلوم کرنے کے لئے آٹھ دس روپئے دینے کو تیار ہوجاتے ہیں۔

آسٹریا کے بھکاری ساری دنیا میں اپنی شائستگی کے لئے مشہور ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اس قسم کی مناسب تعلیم دیجاتی ہے۔ چنانچہ آسٹریا اور ہنگری کے بڑے بڑے شہروں میں ایک آدھ آدمی ایسا ہوتا ہے جو گداگروں کو اس قسم کے دل میں چبھتے ہوئے فقرے سکھادیتا ہے جن سے وہ راہروؤں سے معقول خیرات حاصل کرسکتے ہیں۔ مختلف شخصوں سے مختلف طریقوں پر امداد طلب کرنیکی ہدایت کی جاتی ہے اور وہ اس نصیحت پر عمل کرکے معقول فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

ہندوستان کے بعض صوبوں میں بھیک مانگنا ایک پیشہ ہے، اور پنجاب میں بعض ذاتیں ایسی ہیں جو بھیک مانگ کر زندگی بسر کرنا باعث افتخار سمجھتی ہیں۔ یہاں بعض فقیر اور سادھو ایسے بھی ہیں جو جبراً خیرات مانگتے ہیں اور جب تک ان کا سوال پورا نہ کیا جائے طرح طرح کے ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اس قسم کے فقیر بازاری زبان میں "مرچڑے" کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر پیشہ ور فقیر ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو مصنوعی طور پر لنگڑے، لولے یا اندھے بنکر اپنا مطلب نکالتے ہیں اور افیون کھانا یا چرس پینا ان کا دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے۔

(ماخوذ)

کتب خانے اور اُن کی حفاظت

(از رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم، ایڈوکیٹ لاہور)

دنیا میں بڑے بڑے کتب خانے موجود ہیں، برٹش میوزیم کی لائبریری میں بتیس لاکھ کتابیں ہیں، اگر وہ الماریاں جن میں کتابیں رکھی ہوئی ہیں ایک قطار میں لگائی جائیں تو بارہ میل لمبائی ہوگی، اُن کی صفائی اور آراستگی میں پورے تین برس لگتے ہیں۔ اس کتب خانے کی بنیاد سر ہنس سلون ایک سائینس داں نے اٹھارھویں صدی میں رکھی تھی، شاہان وقت بھی اپنے ذاتی کتب خانے اس کی نذر کرتے رہے ہیں اور آج کل قریب تین ہزار رسالے اور اخباروں کی ہر سال جلدیں بندھوائی جاتی ہیں۔ علاوہ برٹش میوزیم لائبریری کے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں لاکھوں کتابیں ہیں۔ انکو یہ خاص حق حاصل ہے کہ از روئے کاپی رائٹ ایکٹ جو کتاب چھپے اس کی ایک ایک جلد ان کو مفت ملتی ہے۔

جرمن کے مختلف سرکاری کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد چار کروڑ کے قریب ہے، یہی حال اٹلی کا ہے، اٹلی میں علاوہ سرکاری لائبریریوں کے میلان میں ایک مشہور و معروف امیبروزین کتب خانہ ہے جو سرکاری انتظام کے ماتحت نہیں۔ اس کی بنیا کارڈینل بورومیو نے ۱۶۰۹ء میں رکھی تھی۔ اس کے علاوہ پوپ کی لائبریری بھی بہت بڑی ہے جس میں نایاب قلمی اور چھپے ہوئے نسخے بیشمار ہیں۔

فرانس کی لائبریریوں میں بہ لحاظ ذخیرہ معلومات نیشنل لائبریری دنیا کے سب کتب خانوں سے فضیلت رکھتی ہے۔ شاہ فرانس جان نے اس کو قائم کیا تھا جس کو بلیک پرنس (انگریز قوم) نے گرفتار کیا تھا۔ صدیوں تک یہی لائبریری رائیل لائبریری رہی۔ انقلاب عظیم کے بعد چیدہ چیدہ کتابیں جمہوری حکومت نے علیحدہ کر لیں جنمیں بہت سے قلمی نسخے بھی تھے

مندرجہ بالا کتب خانوں کے علاوہ ایک نئی لائبریری امریکہ میں قائم ہو رہی ہے جو غالبًا دنیا بھر میں سب سے بڑی ہوگی۔ ایک امریکن امیر کبیر نے اتنے ڈالر کولمبیا یونیورسٹی کو دئیے ہیں جن سے ایک عظیم الشان عمارت بنوائی جائیگی جس میں چالیس لاکھ جلدیں رکھی جائیں گی۔ کولمبیا یونیورسٹی بمقابلہ ہارورڈ اور ییل نامی یونیورسٹیوں کے نئی اور زیادہ عام پسند ہے شہر نیویارک کے قرب میں واقع ہے گویا کیمبرج یونیورسٹی

سے جو پندرھویں صدی سے کتابیں جمع کر رہی ہے کولمبیا یونیورسٹی میں جو گنی کتابیں ہونگی۔ لطف یہ ہے کہ امریکہ میں پہلے ہی کتابوں کی کیا کمی تھی، آزادی کے عہد سے پہلے ہی بیشمار کتابیں اس قوم کے پاس تھیں جب کانگریس کی تنظیم ہوئی تو اُس کی تحویل میں پینتیس ۲۵ لاکھ کتابیں تھیں۔

ہمارے ملک ہندوستان کے مختلف حصوں کی آب و ہوا مختلف ہے، سندھ کے بعض حصّے اور راجپوتانہ کے صحرا کو چھوڑ کر ہندوستان میں برساتی برودت اور نمی اتنی ہوتی ہے کہ معمولی کاغذ کی کتابوں کو کیڑا کھا جاتا ہے، اورق آپس میں جڑ جاتے ہیں، کشمیری کاغذ بھی اس برودت کی یورش کو نہیں روک سکتا۔ ہندوؤں کے زمانہ کی کتابوں کے قلمی نسخے بھوج پتر پر لکھے جاتے تھے اور روشنائی ایسے اجزا سے بنائی جاتی تھی جو دیرپا ہوتی تھی۔ اسلامی زمانہ میں بھوج پتر کا رواج کم ہو گیا اور اُس کے بجائے کاغذ کا استعمال شروع ہو گیا جو نمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا اسی لئے جو قلمی نسخے دریافت ہوئے وہ کرم خوردہ نکلے۔ جہاں ریگستان زیادہ ہے یا بارش برائے نام ہوتی ہے مثلاً وسط ایشیا کے بعض مقامات اور مصر کا ملک جہاں بارش برائے نام ہوتی ہے پیپارس (Paparis) پر لکھی ہوئی کتابوں کو نقصان نہیں پہونچتا۔ ہندوستان میں انگریزی زمانہ میں کتابوں کا شمار بڑھتا جاتا ہے، چنانچہ کالجوں، یونیورسٹیوں، پبلک لائبریریوں اور نج کے کتب خانوں میں کتابوں کی کثرت ہو رہی ہے لیکن جب تک احتیاط سے ان کی خبرگیری نہ کی جائے اُن کے خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اب غالباً وہ غارت گر تباہ کن لوگ دنیا میں موجود نہیں جن سے کتب خانوں کی بربادی کا اندیشہ ہو۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ یورپ اور ہندوستان میں ایسا کاغذ بنایا جائے جو نمی سے اثر پذیر نہو اور کیڑوں کی خوراک نہ بن سکے، کاغذ میں دافع برودت قوت پیدا کرنی چاہیئے اور ایسے کیمیاوی اجزا کاغذ کی ساخت میں شامل کئے جائیں جو کیڑوں کو نزدیک نہ آنے دیں۔ علاوہ بریں روشنائی بھی ایسی بنانی چاہیئے جو دیرپا ہو۔ شہنشاہ جہانگیر نے کشمیر میں ایسی روشنائی دیکھی تھی جو پانی سے پھیلتی نہ تھی، یہ ترکیب اب کسی کو یاد نہیں رہی اس کا فن ساخت مفقود ہو گیا۔ غالباً بھوج پتر کی زرد روشنائی کی ترکیب بھی اب کسی کو معلوم نہیں۔ کتابوں کی افراط اور قلمی تحریروں کی کثرت اس امر کی متقاضی ہے کہ کوئی تجویز ایسی نکالی جائے جس سے مدت مدید تک کتب خانے محفوظ ہو جائیں، سنا گیا ہے کہ اب اس طرف ماہرین علم کیمیا توجہ کر رہے ہیں اور کتابوں کے تحفظ کی تجویزیں سوچ رہے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں جب تک روشنائی اور کاغذ ایسے نہیں بنائے جائیں گے جو خود بخود اپنی حفاظت کر سکیں اس وقت تک محض جھاڑنے اور صاف کرنے سے کام نہیں چل سکتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کشمیری کاغذ کی ساخت میں سنکھیا ملایا جاتا تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ لیئی میں جس سے جلد سازی ہوتی تھی توتیا ملایا جاتا تھا جواب

بھی ملایا جاتا ہے لیکن یہ کافی کرم کش نہیں، جن لوگوں کے بجی کتب خانے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر ایک سال بھی کتابوں کو دھوپ میں نہ رکھا جائے اور گرد و غبار صاف نہ کیا جائے تو کتابوں کو پھپھوندی لگ جاتی ہے۔ دراصل اس ملک میں برسات کی نمی اس قدر ہے کہ فوٹوگراف تک کیڑوں کے حملے سے نہیں بچتے۔ ہمارے کالجوں کی لیبوریٹریز (معمل) بجائے عامیانہ تجربات کے اگر اس اہم معاملہ کی جانب توجہ فرمائیں تو کیا عجب ہے کہ وہ اس ملک کی آب و ہوا کو مدنظر رکھکر ایسی ترکیبیں معلوم کرلیں جن سے کتابوں کی حفاظت ہوسکے۔

ڈائٹ آف دی انڈینس

(انگریزی) کراؤن سائز۔ ۹۰ صفحات۔ مجلد قیمت ۸؍
ملنے کا پتہ: مسٹر جے۔ سی۔ باسک نمبر ۳۶۳-۱ پر چیت پور روڈ۔ کلکتہ

جیسا نام سے ظاہر ہے اس مختصر کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستانیوں کو غذا میں کس قسم کی احتیاط رکھنی چاہیئے اور کون کون چیزیں مفید ہیں اور کن کن چیزوں میں کس قدر وٹامن (مایۂ حیات) ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض بیماریوں میں صرف پانی کے باقاعدہ استعمال سے فائدہ ہوسکتا ہے۔ آخر میں فاقہ کے فوائد دکھائے ہیں۔ غرض صحت جسمانی قائم رکھنے کے لئے، غذا کے باقاعدہ استعمال پر زور دیا گیا ہے اور اس کے طریقے بھی سمجھائے ہیں۔

اردو ہندی مالا

مولفۂ پنڈت ہری ہر شاستری پروفیسر انچارج عثمانیہ یونیورسٹی کالج حیدرآباد دکن۔ قیمت حصۂ اول ۸؍ حصہ دوم ۸؍

یہ کتاب اُردو داں حضرات کو ہندی زبان آسانی کے ساتھ سیکھنے کی غرض سے مرتب کی گئی ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ہندی کے حروف تہجی، ماترا (اعراب) وغیرہ سمجھائے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں مختصر مفید سبق درج ہیں۔ دونوں حصوں میں ہندی الفاظ و عبارت کے مقابل اردو حروف میں وہی الفاظ اور مشکل الفاظ کے معنی بھی لکھدیئے ہیں۔ غرض ان دونوں حصوں کو بغور پڑھ لینے کے بعد ایک اُردو داں آسانی کے ساتھ ابتدائی ہندی سے واقف ہوسکتا ہے۔ مؤلف صاحب اعلیٰ ہندی سیکھنے کے لئے اس سلسلہ کی اور کتابیں بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کی کوشش کی پوری قدر کی جائیگی اور یہ تالیف مقبول عام ہوگی۔

تنقید کتب

کھیتی

از پروفیسر محمد مجیب بی۔اے۔ (آکسن) کراؤن سائز ۸۰ صفحات۔ قیمت ۶؍
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی۔

جناب محمد مجیب صاحب بی۔اے۔ آکسن کا لکھا ہوا چار ایکٹ کا ایک مختصر ڈرامہ ہے۔ پلاٹ یہ ہے کہ بھگوان داس ملس کے سامنے افتادہ زمین پر کچھ اہل اسلام نماز پڑھا کرتے تھے بعدہٗ اس زمین کو مالک مل نے خرید کر نماز کی ممانعت کر دی۔ اس پر عبدالغفور صاحب ایک خود ساختہ لیڈر نے جو قومی مفاد کی آڑ میں اپنے فائدہ کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اپنے ہمقوموں میں جوش پھیلا کر جہاد کا اعلان کر دیا جس سے چند جاہل مزدور موثر ہو کر مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ لیکن کچھ سمجھدار لوگوں کی وجہ سے معاملہ رفت و گذشت ہو جاتا ہے اور انجام بخیر ہوتا ہے، ڈراما جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی سبق آموز ہے۔ درحقیقت حال کے افسانوں یا "ادب لطیف" میں اتنے مختصر حجم کی اس سے بہتر کتاب مشکل سے ملیگی۔ آجکل جب ملکی فضا فرقہ وارانہ کشمکش سے مکدر ہو رہی ہے اور ہر شئے پر تعصب کا رنگ غالب آ رہا ہے۔ ایسی سبق آموز اور اثر انداز کتابیں جتنی بھی لکھی جائیں کم ہیں۔ درحقیقت حال کے مایوس کن حالات میں ایسی کتابوں کی اشاعت تاریکی میں روشنی کی شعاع کے بمنزلہ ہے۔ اس چھوٹے سے ڈرامے کی زبان نہایت شستہ اور سادہ ہے۔ اس کے جملہ افراد ناظرین کے روبرو اس خوبی سے پیش کئے گئے ہیں جیسے کوئی سچا واقعہ سامنے پیش ہو رہا یا بیان کیا جا رہا ہو۔ درحقیقت قابل مصنف نے موجودہ فرقہ وارانہ ذہنیت کا بغور مطالعہ کر کے نہایت کامیابی سے اُسکا خاکہ کھینچا ہے

گناہ کی دیوار

از مسٹر اشتیاق حسین قریشی ایم۔اے۔ کراؤن سائز۔　　قیمت ۸؍
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

یہ مختصر ڈرامہ بھی جامعہ ملیہ پریس کا مطبوعہ ہے۔ جامعہ موصوف اُن چند اعلےٰ گنے اداروں میں

سے ہے جو اُردو زبان میں نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے صحیح خیالات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے ڈراموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ ان کو آدھ گھنٹے کی فرصت میں تمام و کمال پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ڈراموں میں محض دلچسپی کی خاطر عامیانہ عشق کی داستانیں بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ یہ ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھکر لکھے گئے ہیں۔ تقریباً ہر ڈرامہ میں کسی نہ کسی معاشرتی نقص کی جانب پڑھنے والے کی توجہ راغب کی گئی ہے۔ گناہ کی دیوار میں قابل مصنف نے یہ دکھلایا ہے کہ گناہ خود بُری چیز ہے لیکن انسان گر کر پھر اُٹھ سکتا ہے۔ نیز بعض اوقات انسان اپنے حالات کا شکار ہو جاتا ہے اور واقعات سے مجبور ہو کر گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کو اگر سوسائٹی کی طرف سے موقعہ دیا جائے تو وہ پھر اُبھر سکتے ہیں، لیکن ہماری سوسائٹی عام طور پر اور خصوصاً عورتوں کے معاملہ میں اس قدر سخت گیر واقع ہوئی ہے کہ وہ اتفاقیہ غلطی پر بھی بد قسمت گمراہوں پر اپنے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیتی ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک نہایت دلچسپ و نتیجہ خیز ہے اور اس کا دیباچہ نہایت مفید و قابل غور ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک نوجوان اپنی حسین و خوبصورت بیوی سے صرف اس وجہ سے محبت نہیں کرتا کہ وہ اُس کی فرمانبرداری و پرستش کرتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کو ایک شوخ و شنگ رفیق زندگی ملے۔ اس نوجوان کا ایک عیار دوست ان حالات سے واقف ہونے کے بعد کسی حیلہ سے اس کی بیوی کو بھگا لیجاتا ہے اور بمبئی میں ایک پیشہ ور عورت کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ عورت جو عفت و عصمت کی دیوی تھی بے شرمی و بے حیائی کی زندگی پر مجبور کی جاتی ہے۔ آخر ایک ہمدرد قوم اس عورت کو اس مصیبت سے نکالتا ہے، اور اس کو بھگا کر لانے والا اپنے اس مذموم فعل کی سزا پاتا ہے۔ ان واقعات کا علم اس عورت کے شوہر کو ہوتا ہے اور وہ اس کے پاس آ کر اس کو ہمراہ لیجانا چاہتا ہے مگر عورت انکار کر دیتی ہے کہ اب میرے اور تمہارے درمیان گناہ کی دیوار حائل ہو گئی ہے۔

ہمزاد از مسٹر اشتیاق حسین قریشی۔ ایم۔ اے، کراؤن سائز۔ ۴۸ صفحات۔ قیمت ۶ر

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

ایک مختصر ڈراما ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک مالدار ضعیف العمر تاجر کی نوجوان بیوی کس طرح اسکو اپنی محبت کے فریب میں مبتلا رکھتی اور ایک غیر شخص سے تعلق پیدا کر لیتی ہے مگر تاجر کا قدیم نمک خوار ملازم تمام واقعات سے اس کو آگاہ کرتا اور آخر میں اپنے حسن تدبیر سے اس کو اس خوبصورت بلا سے نجات دلاتا ہے

اس ڈرامے میں تاجر کے ملازم کا کیرکٹر ہی اس کی جان ہے ڈراما دلچسپ و سبق آموز ہے۔

الحمرا کے افسانے

از مسٹر غلام عباس۔ ڈبل کراؤن سائز۔ ۱۵۰ صفحات، مجلد، قیمت عہ
ملنے کا پتہ: دار الاشاعت پنجاب۔ لاہور

الحمرا سلاطین غرناطہ کا وہ مشہور و معروف قصر ہے جو آجکل بالکل تباہ و برباد ہوجانے کے باوجود اہل نظر واہل دل حضرات کی توجہ کا مرکز ہے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں تو یہ محل یقیناً فردوس بریں کے ہمپایہ تھا اور اس کے متعلق اکثر مضامین اردو زبان میں لکھے جا چکے ہیں۔

امریکہ کا مشہور اہل قلم واشنگٹن ارونگ نے جب الحمرا کو دیکھا ہے تو اس کے نظارہ سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ اس نے اس کے متعلق متعدد افسانے لکھے جن میں الف لیلہ کی طرح طلسم وسحر کا اثر دکھایا۔ ارونگ کے ان افسانوں میں سے پانچ دلچسپ افسانے انتخاب کر کے مسٹر غلام عباس نے مناسب تغیر و تبدل کے بعد اردو میں لکھا ہے۔

یہ افسانے دلچسپ ہیں، زبان بالکل سادہ اور اکثر جگہ عامیانہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بوڑھی عورت بچوں کا دل بہلانے کے لئے کہانیاں کہہ رہی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے زبان کا اندازہ ہوسکے گا۔

"جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ وہ جگہ جہاں پہلے چاروں طرف ریت کا سمندر موجیں مار رہا تھا اب وہاں ایک عالی شان شہر کھڑا ہے۔ میں بھونچکا سا رہ گیا، بار بار اپنی انگلیاں کاٹتا تھا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں نے اس شہر کی سیر کرنے کی ٹھان لی اور اس کے عالی شان دروازے سے گزرتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔"

"مدتیں گزر گئیں، الحمرا سے لوپ کے ایکا ایکی غائب ہوجانے کے بعد اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ لوگ اس کے گیت اور لطیفوں کو یاد کر کر کے افسوس کیا کرتے۔ ان کا یہی خیال تھا کہ آخری وقت میں بچارے کو غریبی نے ایسا کچل ڈالا تھا کہ آخر غریب اپنا منہ کالا کر کے جدھر راہ ملی بھاگ نکلا۔"

افسانوں کے متعلق متعدد سادہ و رنگین بلاک کی تصویریں اور دستی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

حشیشین

مترجمہ اہلیہ مرزا محمد سعید ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ کراؤن سائز۔ حجم ۴۳۲ صفحات مجلد۔ قیمت ۶ؔ؍ ملنے کا پتہ: دار الاشاعت پنجاب، لاہور

یہ سرہنری شارپ کے ایک افسانہ "دی اساسنز" کا اُردو ترجمہ ہے جس کو قابل مترجم نے مصنف اور پبلشر کی اجازت سے صاف وسلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس افسانہ کے موضوع کے متعلق مولوی محمد عنایت اللہ (ناظم شعبۂ تالیف و تراجم، جامعہ عثمانیہ) مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس موضوع پر ہماری قوم کے مشہور ومعروف فسانہ نگار شررمرحوم کے بھی دو ناول ایسے ہیں جن میں اس کہنہ مشق ناولسٹ نے حقیقت میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ ان کی شان بیان سے بالاتر ہے۔ مگر سادگی اور نظری اثر میں یہ انگریزی قصہ ان سے بھی بڑھا ہوا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ شررمرحوم کے "حسن بن صباح" اور "فردوس بریں" کے بعد سرہنری شارپ کے اس ناول نے اُردو شکل اختیار کرکے ہمارے افسانوں کے دفتر میں ایک بیش قدر اضافہ کیا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس اس ناول کے موضوع کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ ترجمہ سادہ اور دلچسپ ہے۔ مولوی عنایت اللہ صاحب نے اس پر نظرثانی کی ہے۔ جن حضرات نے مولانا شررمرحوم کے مذکورہ بالا ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اُن کے لئے خصوصیت سے اس قصہ کو پڑھنا تفریح طبع کا موجب ہوگا۔ ناول پڑھنے کے عام شائقین بھی اس سے کافی طور پر محظوظ ہوسکتے ہیں، لکھائی چھپائی وغیرہ نہایت پسندیدہ ہے

میلاد النبی پروجکٹ

از محمد عبدالغفار صاحب مدہولی۔ کراؤن سائز ۴۴ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ قیمت ۴ر

اس کتاب کے دیکھنے سے جامعہ کے ابتدائی مراتب کے طرز تعلیم پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اس معاملہ میں جامعہ ملک کے دیگر مدارس سے بہت آگے ہے۔ تعلیم کا مقصد خود بچوں کی قدرتی ذہانت کی نشو ونما کرنا ہے نہ کہ کتابوں کا غلاف سی کر اُن کے گرد لپیٹ دینا ہے۔ یوم میلاد النبی کے متعلق خود بچے اپنا پروگرام بناتے ہیں، عرب کے متعلق معلومات بہم پہونچاتے ہیں اور حضرت محمد کی سوانح عمری پر نظم ونثر کے مضامین لکھتے ہیں۔

انقلاب دہلی

مرتبہ مولوی نظامی بدایونی، کراؤن سائز ۱۲۰ صفحات، قیمت عہ

ملنے کا پتہ: نظامی پریس بدایوں،

یہ ان نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم کے بعد مستند شعرائے اُردو نے دہلی کی تباہی وبربادی پر لکھی ہیں۔ اس زمانہ کے شعرا نے اس واقعہ کے متعلق اپنے اپنے جذبات دلی کا جو اظہار کیا

تھا، وہ ابتک منتشر حالت میں تھا۔جناب نظامی بدایونی نے ان دردانگیز نظموں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے۔ترتیب حروف تہجی کے قاعدہ سے کی ہے، اور ہر شاعر کی نظم سے پہلے اسکا نام اور سال پیدائش وغیرہ بھی جہاں تک معلوم ہوسکا لکھدیا ہے۔شروع میں خواجہ حسن نظامی دہلوی کا لکھا ہوا ایک مختصر مقدمہ ہے اور اس کے بعد مرتب صاحب کی مختصر تمہید۔منظومات کے آخر میں مرزا سودا کا وہ شہر آشوب اور دو اور نظمیں بھی شامل کردی ہیں جو انھوں نے نادر شاہ کے حملہ کی تباہی کے بعد لکھی تھیں۔غرض وہ تمام نظمیں جو دہلی کی بربادی کے متعلق لکھی گئی تھیں قریب قریب سب اس مجموعہ میں موجود ہیں۔

مرتبہ ڈاکٹر راس مسعود المخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر، رائل سائز ۲۶۲ صفحات

خطوط سرسید

قیمت ۳؎ ملنے کا پتہ: نظامی پریس بدایوں

سرسید مرحوم نے ملک و ملت کی بہبودی اور خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان سے دنیا واقف ہے۔یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو سرسید مرحوم نے اپنے احباب و دوسرے حضرات کو لکھے تھے۔ان کی تعداد تقریباً دو سو پچاس ہے۔سرسید مرحوم ایک مصلح قوم تھے ادیب و شاعر نہ تھے۔اس لحاظ سے ان کے خطوط میں کوئی ادیبانہ و شاعرانہ نکتہ تلاش کرنا بیسود ہوگا البتہ ان کے دل میں قومی خدمت کا جو جوش تھا وہ ہر ایک خط سے عیاں ہے۔شروع میں سرسید مرحوم کی تصویر اور عکس تحریر کے علاوہ مولوی عبداللہ جان وکیل سہارنپور کا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی ہے جس میں سرسید مرحوم کے مختصر حالات، خدمات اور ان کی متعدد تصانیف پر تبصرہ کیا ہے۔یہ مجموعہ اب دوسری بار طبع ہوا ہے جس سے اسکی قبولیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

از مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب سابق مدیر الخلیل بجنور، کراؤن سائز ۲۱۶ صفحات مجلد

اُردو گلستاں

قیمت ۲؎۔ ملنے کا پتہ: دفتر اُردو گلستاں، بجنور، یو۔پی۔

حضرت شیخ سعدی شیرازی کی گلستاں فارسی زبان کی وہ مشہور کتاب ہے جو سیکڑوں برس گزرجانے کے بعد آج بھی مفید مانی جاتی ہے۔چونکہ موجودہ زمانہ میں فارسی زبان سے دلچسپی کم ہوگئی ہے اور اس طرح گلستاں کے پند و نصائح کا اثر محدود ہوگیا ہے لہذا صرف اُردو داں حضرات کے مطالعہ کے لیئے اس کا اُردو ترجمہ کیا گیا ہے۔نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا نظم میں ہے۔بعض حکایات یا ایسے فقرے جو طلبار کے لئے مفید نہیں سمجھے گئے اس میں سے نکال دیے ہیں اور اب بچہ سے لیکر بوڑھے تک ہر شخص اس کی اخلاقی تعلیم سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے، اور یہی مترجم کی غرض ہے۔ہمکو امید ہے کہ سرشتہ تعلیم اس ترجمے کو اسکولوں کی انعامی کتاب میں شامل کریگا۔

شاعر سے خطاب

(از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، بی۔ اے)

چاہتا ہے آج جی میرا کہ دل کو چیر کر
تیرے آگے ڈال دوں اے نکتہ پرور ذی ہنر
دل میں جو ہے صاف کہدوں بے تکلف بے خطر
کیونکہ میں سمجھا ہوں تجھکو اہل دل صاحب نظر
ہے یہی تو قول تیرا بے بدل شاعر ہے تو
رمز حسن و عشق کا واقف ہے اور ماہر ہے تو

آئینہ تھا اور کوئی دیکھنے والا نہ تھا
دل تھا دل میں خون تھا لیکن کوئی چھالا نہ تھا
لب تو تھے لب پر مگر آہوں کا پرکالا نہ تھا
تھا قمر دنیا میں گرد اُس کے مگر ہالا نہ تھا
تو نے بخشے حسن کو عشوہ ادا انداز و ناز
تو نے بخشا عشق کو بے آگ جلنا اور نیاز

عرش فرسا تیری آہ آتشیں کا ہے دھواں
کانپتا ہے تیرے نالوں کی دھمک سے آسماں
درد کی تیرے کھٹک سے زلزلے میں ہے جہاں
عرش و کرسی تک ہے لرزے میں وہ ہے تیری فغاں
آگ دنیا بھر کی تو کہتا ہے تیرے دل میں ہے
سوز عشق و جاں نثاری تیرے آب و گل میں ہے

آسماں کو اپنے نالوں سے ہلا دیتا ہے تو
جوشش گریہ سے پہاڑوں کو بہا دیتا ہے تو
آہِ سوزاں سے زمانے کو جلا دیتا ہے تو
دھجیاں دامانِ محشر کی اُڑا دیتا ہے تو
ایک اعجوبہ زمانے کی ہے یہ ہستی تری
کیوں نہو، کشافِ رازِ دہر ہے مستی تری

ہیں ترے کیا کیا نہ احساں عالمِ ایجاد پر
لاکھ ایماں صدقے تیرے کفر اور الحاد پر
تیری گردن سے جلا ہے خنجرِ جلاد پر
خون جم جاتا ہے تیرا نشترِ فصاد پر
ہے مداوا سے ترے معذور جالینوس کا

چپ ہے طراری سے تیری صاحب قاموس تک

زندگانی ہے تری بے موت مرنے کے لئے ماسوائے عشق ہرگز کچھ نہ کرنے کے لئے
دل کے پرزے پرزے کرنے آہیں بھرنے کیلئے غوطہ زن گرداب میں ہے پار اترنے کے لئے

اپنی کشتی کو نہیں لاتا کبھی ساحل کے پاس
لیکے خود تیغ و کفن جاتا ہے تو قاتل کے پاس

زخم پر اپنے بدن کے خود چھڑکتا ہے نمک تیری ایذا طلبیوں سے چرخ کو بھی ہے جھجک
تیر جب آ کر لگے تو اُس کو دیتا ہے تھپک تجھ سا زحمت آشنا پیدا ہوا کب آج تک

رقصِ بسمل ہے تجھے رقصِ پری سے خوشگوار
تو ہے جانبازی کے فن میں انتخابِ روزگار

ہے جگر چور نگ تیرا اور دل تیرا دونیم کالے کوسوں دُور تجھ سے ہو گئے امید و بیم
ہے یہ تیرے دم قدم کا دہر میں فیضِ عمیم جو قلوب انبساط آگیں بھی ہوتے ہیں اثیم

دم میں ہنستے کو رلا دینا ترا اعجاز ہے
دردمندی سے سخن کو تیرے سوز و ساز ہے

گو رہی تجھ سے ہمیشہ دُور یہ خانہ خراب تو مگر آٹھوں پہر رہتا ہے بدمست شراب
گلستانِ عمر کا تو نے پڑھا پنجم نہ باب پھر بھی تو تھکتا نہیں کرتے ہوئے ذکرِ شباب

کیوں نہ ہو حیران عقل اس قوتِ احساس پر
حسِ نامحسوس۔ جذباتِ عمل نشناس پر

دل نہیں کھینچا کبھی تیرا درم اور دام نے بے حقیقت دولتِ دنیا ہے تیرے سامنے
عمر بھر تجھ کو ستایا چرخِ دشمن کام نے دل ترا افسردہ رکھا گردشِ ایام نے

جب نہ تب عیش و طرب کا نغمہ گا جاتا ہے تو
نقش کو تصویر کے بھی وجد میں لاتا ہے تو

اک غزل میں بارہا جیتا ہے اور مرتا ہے تو جیتے جی تو کیا خطابت مر کے بھی کرتا ہے تو
معصیت کارہ کے خود معصوم دم بھرتا ہے تو فتنے اُٹھتے ہیں جہاں شاعر! قدم دھرتا ہے تو

جھوٹ کو سچ کر دکھانا ایک تیرا کھیل ہے
ہو کے خاکی ناریوں سے ربط ہے اور میل ہے

بے حقیقت آپ کو سمجھا ہے یہ تیری ہے بھول   تو نہ ہے ساون کا اندھا اور نہ ہے اپریل فول
روضۂ رضواں کو شرمائیں ترے کاغذ کے پھول   شاہِ عاد و ترکِ تخشب تیرے آگے ہیں جہول

چاہے جب سرسوں ہتھیلی پر جما دیتا ہے تو
اور ریگستان میں کشتی چلا دیتا ہے تو

جاگتے جیتے دلوں کو آنجہانی کر دیا   غازۂ روئے بقا کو تو نے پانی کر دیا
تو نے اس تمثیلِ یزدانی کو فانی کر دیا   کام کی باتوں کو بس قصہ کہانی کر دیا

اِن طلسم آرائیوں سے وہ غضب ڈھائے گئے
جو رہے ابلیس سے مصئوں وہ بہکائے گئے

چارہ گر، ناصح کہ شیخ و زاہدِ لعنت نصیب   سب سے تو نافر ہے، پھر کیا محتسب کیسا رقیب
یہ تو یہ، آجائے درماں کو اگر تیرے طبیب   تو وہ لتّے لے کہ بھٹکے پھر نہ وہ تیرے قریب

اے سڑی سودائی وہ تجھ سے اماں پائے کہاں
بس خدا دے بندہ لے، آئے تو اب جائے کہاں

روح فرسا ہے جہاں کو خامہ فرسائی تری   دشمنِ تسکینِ دل ہنگامہ آرائی تری
ہے سمومِ جاں گزا یہ بادپیمائی تری   ہو نہ کیوں ننگِ شرافت ہے شناسائی تری

پیشتر اس کے کہ پہنچائے زمانہ تجھ کو رنج
تو سنبھل جا چھوڑ دے یہ بدعتیں اے نکتہ سنج

یہ نہیں میں نے کہا تخریبِ عالم تجھ سے ہے   عافیت کا قتل ہے اور نیکی کا ماتم تجھ سے ہے
یہ نہیں الزام جو دنیا میں ہے غم تجھ سے ہے   ناک میں خُلقِ حمیدہ کا مگر دم تجھ سے ہے

تیری کلکِ فتنہ زا سے ہیں اہرمن سیکڑوں
تر گئے ہیں رہ کے خود بے لوث دامن سیکڑوں

سامعین پر ہے جو تیری یاوہ گوئی کا اثر   قارئین پر ہے جو یہ سحر آفرینی کارگر
تیری بڑ جو کام کر جاتی ہے قلبِ سادہ پر   اے مکرّم خاک بھی تجھ کو نہیں اس کی خبر

بیٹھے بیٹھے تو نے ساحل پر ڈبو دیں کشتیاں
خود امر رہ کر فنا کر دیں ہزاروں ہستیاں

یہ ظریفانہ ستم تیرا غضب ہے بے پناہ   غمزۂ معصوم نے تیرے کئے لاکھوں تباہ

سحر بے پروا کی تیرے پڑ گئی جس پر نگاہ — مرتے دم تک پھر ملی اس کو رہائی کی نہ راہ
تو نے جب جادو جگایا قسمتیں تک سو گئیں
قوتیں افعالِ حسنہ کی معطّل ہو گئیں

واہمہ ہے برق دم تیرا تخیل تیز ہے — تیری سیدھی بات بھی گویا قیامت خیز ہے
بلبلِ تصویر کو نغموں سے تیرے ریز ہے — تو عمل میں خاک، گویائی میں حشر انگیز ہے
بالقوی سب کچھ ہے تو بالفعل لیکن کچھ نہیں
تیرے آگے غیر ممکن اور ممکن کچھ نہیں

تیرے منظومات کو کہنا غلط ہے واہیات — تو جو چاہے کر دکھائے رات کو دن، دن کو رات
عالمِ تکوین سے باہر ہے تیری کائنات — مانند دنیائے تخیل سے ہیں تیرے عادیات
ہونی اَن ہونی ہے یکساں تجھکو اے شعری شعار
تیرے آگے ہے معاذ اللہ معطّل کردگار

تیرے ملفوظات میں یہ سب زبانی چٹکلے — دلنشیں تیرے تصوف کے ہوئے کیونکر مسئلے
معرفت کی یہ ترنگیں یہ خیالی ولولے — ہو گئے گمراہ جو اس تیرے مسلک پر چلے
ہاں مگر تلقین میں رندی کی تو اُستاد ہے
کیونکہ نسیاں اور خطا انسان کی بنیاد ہے

اِک نگاہِ غیر و غائر ڈال ان ابیات پر — فخر ہے جن کی بدولت تجھکو اپنی ذات پر
تو کبھی تو غور کر اے سحرکار اس بات پر — کیا اثر ہوتا ہے ان کا قوم کے جذبات پر
شعر تیرا انفسیاتی زندگی کو زہر ہے
کشتیِ اخلاق کے حق میں فنا کی لہر ہے

چونکہ ہستی ہے تری مافوقِ عادت سر بسر — تجھ پہ ہو سکتی نہیں تعزیرِ رسمی کارگر
دیکھکر یہ اور قدرت نے بہت کچھ سوچکر — ایک فرمانِ خصوصی وضع پر ڈالی نظر
پیشتر اس سے کہ وہ فرمان ہو زیبِ نفاذ
تو بدل دے بلیغ کلکی کا اے شاعر محاذ

درد تیرے دل میں ہے تیری زباں میں ہے اثر — پھونک دیتا ہے زمانے کو ترا سوزِ جگر
شادی و غم کو ترے یکساں ہے دوری و حضر — خرقِ عادت گر تجھے کہدے تو کہدے بے خبر

میں تو سمجھا ہوں تجھے مافوق علم نفسیات
ہے یہی باعث کہ کہنا چاہتا ہوں ایکبات

(۲)

حسنِ عالمگیر کا ہو گر ترے دل میں شرار ۔۔۔ گل سے بڑھکر نوک کی لینے لگے پھر تجھسے خار
ہو خزاں میں بھی تجھے محسوس اک شانِ بہار ۔۔۔ ہو تجھے دستِ حنائی سے سوا برگِ چنار
حسن کا چسکا ہے تو آ حسنِ عالمگیر دیکھ
حسنِ معنی حسنِ فطرت دیکھ۔ مت تصویر دیکھ

دل کی گہرائی میں تو غوطہ لگائے گا اگر ۔۔۔ حسن و رعنائی کا ایسا منظر آئیگا نظر
اک نیا پائے گی تیری ہستی ذہنی ڈھچر ۔۔۔ دووھ پانی سا الگ ہو جائیگا عیب و ہنر
وہ فریب چشم تھا یہ سرمۂ تحقیق ہے
وہ جنون کی لکیریں تھیں یہ نستعلیق ہے

بے پیئے سرشار جامِ بادۂ و صہبا نہ بن ۔۔۔ سب کہیں ناکارہ اے مشفق جسے ایسا نہ بن
ہو کے انساں تو غزال وحشیِ صحرا نہ بن ۔۔۔ محفل علم و عمل کی شمع کا پروانہ بن
وہ ضرورت کونسی ہے تجھ پہ جو ظاہر نہیں
علم اپنی قوتوں کا تجھ کو اے شاعر نہیں

تو تو ہے مالک تصور کا تخیّل کا ولی ۔۔۔ کونسی شے ہے یہاں کی تیری نظروں سے چھپی
ایک اچٹتی سی نظر تو نے جب ان پر ڈالدی ۔۔۔ واقعاتِ دہر کی تجھ پر حقیقت کھل گئی
ہو کے عامل بالیقیں بزم دلا سائی میں آ
اس ہوا منزل سے دارِ خاکی و مائی میں آ

کونسے منصف کو اس کے ماننے میں ہے کلام ۔۔۔ تجھ سے پاتی ہے فصاحت اور بلاغت الضرام
ناطقہ کو ہے تری شیوا زبانی سے قیام ۔۔۔ ہے اثر اور جذب کا دم سے ترے دنیا میں نام
تجھ سے بس کہنا یہی ہے اب خدا کا نام لے
اور اس جادو بیانی سے حقیقی کام لے

کبتک اس گلشن کو خارستاں کہے جائے گا تو ۔۔۔ اور ادائے ناز کو پیکاں کہے جائے گا تو
بوالہوس کو بندۂ جاناں کہے جائے گا تو ۔۔۔ اور نقلی کفر کو ایماں کہے جائے گا تو

کہہ تو کس مصرف کی ہے یہ فتنہ سامانی تری
ہے کفن کس لاش کا پوشاک عریانی تری

جب تری گندم نمائی ایسی پُر تاثیر ہے — جب تری یہ صبح خیزی داعیٔ توقیر ہے
تیری فرضی بات میں جب یہ شکر اور شیر ہے — تیرے مفروضاتِ ذہنی میں جو یہ تسخیر ہے
کیا قیامت تو نہ کر دکھلائے لے معجز بیاں
گر حقائق کی پرستش کو بنالے حرزِ جاں

آ کمر باندھ اور میدانِ عمل میں کود پڑ — تو نہ جھگڑا کر فلک سے اور قسمت سے نہ لڑ
ہے ترا پندار ہی تیرا رقیب اس سے جھگڑ — ہے عدو تیرا یہ تیرا واہمہ اِس سے بگڑ
دل میں تیرے واقعی احساس کا گر نور ہے
کل جو سنگِ راہ تھا تجھ کو وہ کوہِ طور ہے

ہے زباں میں تیری اے شاعر بھرا ایسا فسوں — تو اگر چاہے نکالے قیس کے سر سے جنوں
دیکھنے میں آئے دنیا میں بہت سے ذو فنوں — تجھ میں اعجازِ زباں جو ہے بیاں کیونکر کروں
غور سے سن تجھ کو پہنچاتا ہوں پیغامِ عمل
کاش دے توفیق تجھ کو ایزدِ عزّ و جل

اپنے ان جذباتِ مزمن کی ذرا کر روک تھام — کر مؤکد اُن پہ یہ آئینِ فطرت کا پیام
قلب کے احساسِ اصلی کا زباں کو کر غلام — دے نہ اس دُنیا کو تو بازیچۂ اطفال نام
زندگی کو عارضی اور چند روزہ مان کر
ہو عوارض سے نہ بے پروا موانع سے نہ ڈر

کھول کر آنکھیں ذرا اپنے وطن کا حال دیکھ — حال دیکھ اہلِ وطن کا اُنکے تو اعمال دیکھ
زندگانی کے کشاکش اور اضمحلال دیکھ — تو زمانے کی ہوا دیکھ اور اس کی چال دیکھ
یہ نہیں کہتا ہوں میں تجھ سے یہ کر تو وہ نہ کر
خود سمجھتا ہے تُو جو کرنا ہے اے صاحب نظر

تجھ میں ہمدردی کا جو ہے کر اب اسیرِ عمل — تو اخوّت کی اسے صورت میں کر دے منتقل
ہے جو یہ ہر لونگ ہم آہنگی اس کا ہو بدل — خلق کی خدمت میں ہی خلاق کی طاعت کا پھل
راز یہ عشقِ الٰہی کا بتانا تھا تجھے

مست خوابِ لاآبالی بس جگانا تھا تجھے

دیکھتا ہے جانگزا کتنا ہے دردِ بغض وکیں — ہے یہ وہ سم جس نے بس قوموں کی قومیں مار دیں
یہ سمجھ دوناکسوں میں جب کبھی چوٹیں چلیں — موردِ الزام یا دونوں ہیں یا کوئی نہیں

جو شدائد واقعاتِ عہدِ حاضر کے ہیں دیکھ
جو نتائج اور عواقب اس کے ہو سکتے ہیں دیکھ

میں نے مانا تو کوئی قاضی نہیں مفتی نہیں — قول لوگوں کو ترا آیت نہیں شرتی نہیں
ہاتھ میں تیرے رفاہِ خلق کی کنجی نہیں — ذات پر تیری فلاحِ انس و جاں مبنی نہیں

لیکن اے شاعر تجھے وہ قوتیں قدرت نے دیں
چاہے تو کر دے وطن کو رشکِ خلدِ بریں

ہو جہاں لعنت کا موقع اور نہ استغفار کا — ہو نہ اک کو دوسرے سے دغدغہ آزار کا
کام میں ہو ہاتھ ہر دم اور دل ہو یار کا — نام رکھا جائے عاصی جس جگہ بیکار کا

وہ مقامِ پاک ہے اے دوست دنیا میں بہشت
شہر یا جنگل ہو وہ کعبہ ہو یا دیر و کنشت

تو کرشمہ اپنی اس جادو بیانی کا دکھا — گمرہوں کو سیدھے رستے پر پلٹ کر پھیر لا
جس سے بہبودی خلائق کی ہو وہ راہیں بتا — باندھ یہ نیت مدد پر ہے تری فضلِ خدا

تیرے قبضے میں ہے فن جسکو کہیں سحرِ حلال
انقلابِ قلب میں شاعر دکھا اپنا کمال

ایک ہے تیری نظر میں تو خدائی اور خودی — تجھکو یکساں ہے زمانے کی بھلائی اور بدی
تو نے جزو و کل میں کب تمیز اور تفریق کی — فرقِ شخص و عکس اے شاعر نہ تو مانا کبھی

بحرِ جمعیت میں کر دے جذبِ موجِ فرد کو
تا کہ یکرنگی وحدت جلوہ گر کثرت میں ہو

ہاں وطن کو یہ نویدِ ارتباطِ آہنگ دے — افتراق و ضدیت کو پھر پیامِ جنگ دے
پھونک وہ منتر کہ اک سُر بین، بربط، چنگ دے — انفرادی زندگی کو اجتماعی رنگ دے

فرد بے مصرف ہے گر شامل جماعت میں نہیں
لفظ ہے ٹکسال باہر گر عبارت میں نہیں

مسکراتی ہے ستی سنکر مدھر بانی تری | گل کھلاتی دشت و صحرا میں حدی خوانی تری
کشورِ دل پر مسلّم تھی قلمرانی تری | اب بھی ہے دل کی قلمرو میں جہانبانی تری
کیوں بھلایا ہے وہ تو نے نغمۂ ہند و حجاز
دے رہا ہے آس ابھی تک یہ ترا خاموش ساز

درد تیرے دل میں ہے ایثار گھٹی میں تری | اشکِ حسرت خاکِ ارماں جذب مٹی میں تری
ہے کلید بابِ نصرت بند مٹھی میں تری | ہے ابھی تک بادۂ شیراز بھٹی میں تری
کر دے اک چھینٹے سے ان مردہ دلوں کو شور پور
عشق کے جھنڈے کے نیچے ان بھٹکتوں کو بٹور

بجلیاں بھر دے دلوں میں ہیں جو حسرت انتما | سرد مہری کے جگر میں آگ الفت کی لگا
بھر دے ہر اک سر میں خودداری و غیرت کی ہوا | پھونک دے وہ آگ تن من میں جو ہے طور آشنا
اس طرح کا یا زمانے کی تو اے شاعر پلٹ
اور تاریخ قدیمہ کے ورق کو دے الٹ

ورنہ پھر کس کام کی ہے یہ شرر باری تری | کام کس دن آئیگی یہ حسِ غمخواری تری
آخر اے شاعر ہے کس مصرف کی طرّاری تری | سب وسائل رہ گئے اب آ بنی ہے باری تری
وقت ہے اب شاعرِ شیوا بیاں لب کھول تو
راست اور ناراست میزانِ عمل میں تول تو

چھوڑ کر ماضی کی رٹ۔ رکھ حال کو مدّ نظر | کیونکہ اس کا ہی اثر پڑتا ہے استقبال پر
ترجمانی واقعی احساس کی عالم میں کر | یہ صداقت کر لے اپنے دل پہ کالنقش الحجر
خلق کی خدمت میں ہے خالق کی طاعت اے عزیز
سروری اک قوم کی ہے اسکی خدمت اے عزیز

سن لیا تو نے جو کچھ ہے عہدِ حاضر کا پیام | ہو چکی ہیں تجھ پہ واضح اس کی تفصیلیں تمام
صاف نیت اور ہمت سے یہ سر ہونا ہے کام | غیر ممکن واپسی ہے تیری بے نیل مرام
یاد رکھ تو ہے یہاں حب اور احساں کے لئے
فرضِ اولیٰ خدمتِ انساں ہے انساں کیلئے

کلام اثر

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی)

قاتل کا ہاتھ کانپا، آیا عرق جبیں پر
یوں ایک ناتواں نے سر رکھ دیا زمیں پر

نازاں جبیں ہے مجھ پر، نازاں ہوں میں جبیں پر
سجدے ہیں یا ستارے بکھرے ہوئے زمیں پر

مہتاب کی ہیں کرنیں غرقِ شراب گویا
ساغر نہیں ہے ساقی کے دستِ نازنیں پر

میں کیا بتاؤں کیونکر عہدِ فراق گزرا
نقش و نگارِ گریہ کچھ ہیں تو آستیں پر

منظور اُن کو اپنے بسمل کا امتحاں ہے
اے اضطراب رکھدے اک اور دل یہیں پر

اُس نے خموش رہ کر بے موت اُن کو مارا
حسرت جنھیں تھی دینگے جاں نذرِ اک نہیں پر

شرمندہ ہیں اجل سے، محتاج زندگی کے
وقتِ اخیر ورنہ کیسا عرق جبیں پر

سرمایۂ جراحت ہے منتِ جراحت
قربان عیش و راحت اس دردِ دلنشیں پر

اِک بیگنہ کے خوں کی اللہ رے سرایت
تڑپی ہے وہ زمیں بھی ٹپکا ہے جس زمیں پر

کہتے ہیں، دل نہیں ہے، ویرانہ ہے کبھی کا
کیونکر کہوں کہ زینت موقوف ہے مکیں پر

ہم اضطراب کشتہ، اب ہیں حجاب کشتہ
یا دیکھتے تھے ان کو، یا ہے نظر زمیں پر

جب ہم سے بات کرنا، غصے سے بات کرنا
دل بھی یوہیں لیا تھا، انصاف ہے تمہیں پر

یہ میرے بعد شاید آوارۂ چمن ہوں
پرواز کے تو شایاں صیاد اب نہیں پر

لبیک کہہ رہا ہے ایک اک لہو کا قطرہ
جاری ہے رقصِ بسمل، قاتل کی آفریں پر

چھینٹیں کہیں لہو کی، سرخی کہیں شفق کی
گلکاریاں ہیں کیا کیا، مقتل کی سرزمیں پر

حیران تم ابھی تھے، بیتاب تم ابھی ہو
سچ سچ اثر بتاؤ مائل ہو کس حسیں پر

نوائے محوی

از مولانا محوی صدیقی لکھنوی (از مدراس)

کشاکش ہے امید و یاس کی میں ہوں مرا دل ہے
اجل آتی نہیں حد سے سوا بیتابیِ دل ہے

اُسی کو زندگی میں کچھ سکونِ قلب حاصل ہے
مرادیں بیکسوں کی بھی کبھی بر آتی ہیں یارب!

مجھے بھی کاش کچھ ملجائے حصہ اُس مسرت کا
کسی کا جلوۂ رعنا، کسی کا چہرۂ زیبا

یہ ہے غارت گرِ دل، ہوشیار اے انجمن والو!
تمہاری کم نگاہی کا گلہ مجھ کو نہیں لیکن،

پڑے یارب نہ اُس پر صبر کچھ میری تباہی کا
محبت میں مصائب سے کبھی اے دل نہ گھبرانا

تجھے کیا علم رہنے دے، عنایت چارہ گر اپنی
معاذ اللہ مصیبت اور وہ بھی شامِ ہجراں کی

جو پیمانِ وفا باندھا تھا اُس کی لاج ہے ورنہ
کبھی جس نے نہیں دیکھا تماشا رقصِ بسمل کا

یہ تنہائی کی راتیں اور یہ بیتابیاں دل کی

کبھی جینا ہی تھا دشوار اب مرنا بھی مشکل ہے
سفینہ درخورِ طوفانِ غم ہے دُور ساحل ہے

خیالِ یار میں فکرِ دو عالم سے جو غافل ہے
یہ ممکن ہے تو ناکام تمنا کیوں مرا دل ہے

کسی کا دل دُکھانے سے جو ظالم تجھکو حاصل ہے
نویدِ راحتِ جاں ہے، پیامِ عشرتِ دل ہے

جو اس اندازِ تمکیں سے بساط آرائے محفل ہے
تمنا مر کے پھر زندہ نہیں ہوتی یہ مشکل ہے

جو سب کچھ جانتا ہے پھر بھی حالِ دل سے غافل ہے
دیا ہے جس نے یہ غم وہ کب اپنے غم سے غافل ہے

کہ ہر اک زخمِ دل اک سرخیِ افسانۂ دل ہے
نہ دکھلائے خدا دشمن کو بھی وہ حالتِ دل ہے

محبت میں کسی کو جان دینا کوئی مشکل ہے
خدا کی شان دنیا بھر میں وہ مشہور قاتل ہے

یہی وہ زندگی ہے جسمیں جینا سب کو مشکل ہے

کیا ہے قتل محوی اک نگاہِ ناز نے جس کی
خدا کی شان میرے سوگواروں میں وہ شامل ہے

علمی خبریں اور نوٹ

پچھلے مہینہ ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹگور کی سترھویں سالگرہ کے جشن کے سلسلے میں نادرو نایاب تاریخی کتابوں اور قدیم تصویروں کی ایک نمائش ٹاؤن ہال کلکتہ میں ہوئی تھی جس میں منجملہ دیگر علمی نادرات کے فارسی زبان کے نامور شاعر فردوسی کے مشہور و معروف شاہنامہ کا ایک قیمتی و مطلا قلمی نسخہ بھی رکھا گیا تھا، یہ نسخہ چار جلدوں میں ہے اور اس کو مولانا امیر علی الکاتب نے شاہزادہ عبداللہ خاں ازبک کے دربار میں ۱۵۶۱ء میں بخارا میں لکھا تھا۔ میر علی الکاتب اپنے زمانہ میں فن نستعلیق کے استاد کامل سمجھے جاتے تھے۔ اس نسخے کے ہر صفحے کے چار کالم ہیں، حاشیہ مطلا ہے، اس میں قدیم ایرانی وضع کی تیس تصاویر بھی ہیں جن کے حاشیہ پر سنہرے نقش و نگار ہیں۔ بخارا سے یہ نسخہ جہانگیر بادشاہ کے کتب خانہ میں پہونچا جسمیں چوبیس ہزار نادر و مطلا کتابیں تھیں، چنانچہ اسکے سرورق پر جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک یادداشت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہنشاہ موصوف کو یہ نسخہ اپنے چچا سلطان دانیال کی لائبریری سے ملا تھا۔

اس نسخے میں منجملہ دیگر حضرات کے شاہ صفوی (غالباً سلطان طہماسپ اول) کے لائبریرین سلطان دانیال، شاہنشاہ اکبر کے لائبریرین ملا حبیب اللہ، جہانگیر کے مصور خاص و لائبریرین ملا صالح کے قلم کے لکھے ہوئے نوٹ موجود ہیں، اور خود جہانگیر کی شاہی مہر ہے جس میں عبدالباری مراد جہانگیر بادشاہ لکھا ہوا ہے۔ اس پر شاہ بدلغ خاں ابن سلطان عبدالمطلب، ملکہ زمانیہ بیگم، لطف اللہ اور نواب مرشد آباد کی مہریں بھی ہیں۔ مرشد آباد کی لائبریری سے یہ نسخہ اس کے موجودہ مالک مسٹر بہادر سنگھ سنگھی کے ہاتھ آیا جو کلکتہ کے مشہور قلمی کتب جمع کرنیوالے ہیں اور جنھوں نے یہ نسخہ اس موقعہ پر پیش کیا تھا۔

امتداد زمانہ کے باعث اس کتاب کی بعض تصاویر خراب ہوگئی ہیں البتہ تصاویر اچھی حالت میں ہیں، مگر کتاب کا اصل متن نہایت عمدہ حالت میں ہے۔

منشی رام دیال صاحب سکسینہ فنانشیل سکریٹری ریاست جاورہ کے انتقال پر ملال پر ہم اظہار افسوس کر چکے ہیں۔ مرحوم نے اپنی وفات سے پہلے ہمارے پاس ایک مختصر مطبوعہ رسالہ موسومہ "قصیدہ مادھومغل" زمانہ میں شائع کرنے کی غرض سے بھیجا تھا۔ یہ رسالہ آپ کے فرزند منشی جے دیال مرحوم کو مثنوی کاشی استت مصنفہ منشی متن لال (ملاحظہ ہو زمانہ بابت جولائی سنہ ۱۹۳۱ء) کی تلاش کے سلسلہ میں دستیاب ہوا تھا یہ قصیدہ جو بار دوم سنہ ۱۹۱۳ء میں نولکشور پریس میں شائع ہوا تھا آجکل کمیاب ہے۔ اس کے شائع کرانیوالے منشی بھیم سین صاحب سکسینہ ساکن اتراولی ہیں، انھوں نے اس کے شروع میں قصیدہ کی شان نزول کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ مادھومغل ایران یا افغانستان کا باشندہ ایک مسلمان شخص تھا جو مندر ناتھ دوارہ (واقع ریاست اودے پور) کی پرتمان کے درشن کرنے کے بعد سری کرشن مہاراج کے درشنوں کا طالب ہوا اور وہاں سے متھرا گیا۔ اس کی بھگتی کو دیکھکر اس کو سری کرشن جی کے مندر کے دروازہ پر کھڑے ہو کر درشن کرنے کی اجازت دیگئی، مگر مادھومغل نے اس کو قبول نہیں کیا اور ایک مندر کے سامنے تین روز تک بے آب و دانہ پڑا رہا، تیسرے روز کہا جاتا ہے کہ سری کرشن جی نے مندر کے پوجاریوں کو خواب میں یہ نصیحت کی کہ ہمارا ایک مسلمان بھگت مندر کے دروازہ کے سامنے بھوکا پیاسا پڑا ہوا ہے اُس کو کھانا کھلاؤ۔ پوجاریوں نے مادھومغل کو کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کی مگر اُس نے انکار کر دیا اور یہی کہا کہ جب تک سری کرشن جی کے درشن نہ ہو جائیں گے اُس وقت تک میں کچھ نہ کھاؤنگا۔ چنانچہ پانچ روز اور وہ اسی طرح پڑا رہا۔ آٹھویں دن سری کرشن جی نے اس کو خواب میں درشن دیئے۔ درشن کر لینے کے بعد اُس نے بیساختہ یہ قصیدہ موزوں کیا جس کے چند اشعار بطور نمونہ ہدیہ ناظرین ہیں

تا کے زخود رانی سخن سٹی کشن گوسی کشن گو — بگذر زبیا از ما و من سی کشن گوسی کشن گو

دل را باو کن مبتلا جاں ساز در راہش فدا — از غیر رو گرداں جدا سی کشن گوسی کشن گو

آں پوتنا را از جزا بنگر چیاں واد شش سزا — کاندر فنا لیش شد بقا سی کشن گوسی کشن گو

مادھو منوہر مرلی دھر پیرا ہنش پیتامبر — مہرش بدلہا جلوہ گر سی کشن گوسی کشن گو

مادھومغل محو شا اے کشن جی مشکل کشا
الطاف تو شد رہنما سی کشن گوسی کشن گو

ناظرین زمانہ میں سے اگر کوئی صاحب مادھومغل کے حالات اور اس نظم کی تاریخی حیثیت پر اظہار خیال فرمائیں تو عین نوازش ہو۔

سلا سری کرشن کا مخفف

ہمارے محترم دوست مولانا عزیز لکھنوی کے پاس ایک بیاض حکیم محمد شریف خاں صاحب کی ہے جس میں اُن کے مجربات اور فوائد علمیہ اور نکات ادبیہ درج ہیں اور ایک صفحہ پر شیخ ناسخ مرحوم کی دستخطی عبارت بھی لکھی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ تحریر قدیم آثار ادبیہ میں سے ہے لہذا زمانہ میں شائع کرنے کی غرض سے مولانا موصوف نے عنایت فرمائی ہے جو شکریہ کے ساتھ درج کی جاتی ہے:۔

استفسار:۔ لفظ تئیں خلاف محاورۂ حال است و متروک؟ مترقب کہ صحت و سقم دستخط شود، قائلے میگوید

تیرے تئیں سنگ دل کس لئے نہ جانا صنم
شیشۂ دل پر عبث سنگ لگانا صنم

جواب شیخ امام بخش ناسخ:۔ ایں چنیں الفاظ البتہ متروک بندہ است والّا کسے ترک نکرد الی یومنا ہذا اساتذہ لفظ مذکور را یا دیگر الفاظ متروکہ جائز داشتہ اند مطلقاً عیب نیست بندہ ہم معیوب نمی دارد و سوائے ایں قباحت در شعر مرقوم بنظرنمی آید و جناب قبلہ اگر غزلے بعد مدت دریں زمین موزوں فرمایند البتہ انشراح خاطر بندہ گردد۔ (دستخط) امام بخش ناسخ

---

۱۰ جنوری کو اعلیٰ حضرت خسرو دکن نے ریاست حیدر آباد کی سرکاری لائبریری کی نئی عمارت کا جو موسیٰ ندی کے شمالی کنارے پر تعمیر ہوئی ہے باضابطہ افتتاح فرمایا۔ یہ کتب خانہ نواب عماد الملک بہادر کی کوشش سے قائم ہوا تھا اور پیشتر ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک عمارت میں تھا۔ جدید عمارت میں اس سے کثیر التعداد علم دوست اصحاب فائدہ اُٹھا سکیں گے۔

مشہور انگریزی عالم سر ڈینسن راس کا خیال ہے کہ تصاویر و نقوش و اشارات کے ذریعہ تمام دنیا کے لئے ایک آسان عالمگیر زبان اختراع کی جاسکتی ہے۔ اسی اصول پر جس پر سر ڈینسن کی تجویز کا دارومدار ہے چینی زبان کے حروف بھی مبنی ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ مختلف قوموں کے باہمی تبادلۂ خیال کے لئے ایک ہزار سے زائد الفاظ کی ضرورت نہیں ہے، اور ان میں سے ہر ایک لفظ یا خیال کے لئے تمام دنیا کے استعمال کے واسطے ایک خاص نشان تجویز کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس تجویز کی تکمیل کے راستے میں کافی مشکلات ہیں اسلئے ہم اس کو قابل عمل نہیں سمجھتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ دنیا کی سب سے ضخیم کتاب تبتی زبان کی "گنجر" نامی کتاب ہے جس میں مذہب کے موضوع

پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب دو سو جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اس کو تبت سے پیکنگ لے جانے کی ضرورت ہوئی تھی تو اس کو اُٹھانے کے لئے سو قلیوں کی ضرورت پڑی تھی۔

فخرِ قوم لالہ لاجپت رائے آنجہانی کی یادگار میں میرٹھ کالج نے مضمون نگاری کے مقابلہ کی بنیاد قائم کی ہے جس میں آگرہ یونیورسٹی سے ملحق تمام کالجوں کے طلبا شریک ہو سکتے ہیں۔ اس مقابلہ کا مضمون "ہندو مسلم مسئلہ اور اس کا حل" تھا، اس موضوع پر بہترین مضمون مسٹر محمد ضیاء الاسلام متعلم مہاراجہ کالج جے پور کا قرار پایا، چنانچہ انھیں کو تمغہ موسومہ "لالہ لاجپت رائے گولڈ میموریل میڈل" دیا گیا۔

دنیا کی زندہ و ترقی یافتہ قومیں اپنے علمی ادبی سرمایہ کی توسیع کے لئے کس قدر کاوش اور صرفِ زر کرتی رہتی ہیں اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تیاری میں چھپن سال اور تین لاکھ پاؤنڈ صرف ہوئے ہیں۔ اس لغت میں انگریزی کے اُنچاس ہزار الفاظ ہیں۔

حیدر آباد دکن ایک مدت سے مشرقی علوم کی سرپرستی کر رہا ہے اور وہاں کے اہلِ علم و اہلِ قلم بھی علوم مشرقی کی توسیع و ترقی میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بزمِ تاریخ بھی قائم ہے جس کے مقاصد میں مشہور قدیم تاریخی کتب کی تلاش، دکن کی اسلامی تاریخ کی ترتیب اور اردو میں ایسے لٹریچر کی اشاعت ہے جن کی وجہ سے مطالعۂ تاریخ میں آسانی پیدا ہو سکے۔ اس انجمن کے صدر نواب سر امین جنگ بہادر اور سکریٹری حکیم سید شمس اللہ قادری ہیں۔ اراکین میں حیدر آباد کے سربرآوردہ حضرات کے علاوہ الہ آباد، پنجاب، کلکتہ، مدراس وغیرہ یونیورسٹیوں کے ہندو و مسلمان قابل پروفیسر اور لندن اور لیڈن یونیورسٹیوں کے علما شامل ہیں۔ اس انجمن کی سرپرستی میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل تین کتابیں تبصرہ کی غرض سے ہمیں وصول ہوئی ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ہمارے مکرم دوست حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے مرتب کی ہیں۔ ہر کتاب پر تنقیدی مقدمہ لکھا ہے اور دوسری ضروری باتیں بھی اضافہ کی ہیں۔

(۱) نظام التواریخ (فارسی) اس کو قاضی ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ نے ۶۷۴ھ میں تالیف کیا تھا، اس میں ملوکِ عجم کی تاریخ و انساب ابتدائے آفرینش سے مؤلف کے عہد تک درج ہے۔

(۲) تذکرہ مصنفین دہلی (فارسی) حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی تالیف ہے۔ اسمیں ابتدائے

فتح اسلام سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک دہلی میں جو مصنفین گزرے ہیں ان کے حالات ہیں۔

(۳) تحفۃ المجاہدین (عربی) شیخ زین الدین بن عبدالعزیز کی تالیف ہے جس میں پرتگال کے بعض حالات ہیں۔

دارالمورخین کے پیش نظر مقاصد بجائے خود بہت اہم و مفید ہیں، لیکن موجودہ زمانہ کے لحاظ سے اگر ان کتابوں کو اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا جاتا تو یقیناً زیادہ مفید ہوتا۔ موجودہ صورت میں صرف خاص خاص حضرات ہی ان کے مطالعہ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ بہرحال مرتب صاحب کی محنت و کاوش مستحق ستایش ہے۔

تینوں کتابیں رائل سائز پر طبع کی گئی ہیں۔ کتابت و طباعت صاف اور کاغذ سفید دبیز ہے قیمت کسی کتاب پر درج نہیں۔ اہل ذوق حکیم سید شمس اللہ قادری ایڈیٹر رسالہ "تاریخ" کوٹلہ اکبر جاہ حیدر آباد دکن سے خط و کتابت کریں۔

جامعہ ملیہ دہلی نے "اردو اکاڈمی" کے نام سے تصنیف و تالیف کا ایک خاص شعبہ قائم کیا ہے۔ جس کا مقصد اردو زبان میں مختلف علوم و فنون پر مستند کتابیں لکھوا کے یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کرا کے شائع کرنا ہے۔ چنانچہ اب تک متعدد قابل قدر کتابیں طبع ہو چکی ہیں جن میں سے اکثر کا ریویو بھی زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اکاڈمی کی طرف سے ایک علمی رسالہ "جامعہ" اور ایک تعلیمی رسالہ "پیام تعلیم" بھی جاری ہے۔ اور جو حضرات چاہیں چوبیس روپیہ سالانہ ادا کر کے اس کے رکن ہو سکتے ہیں، مزید سہولت کے لئے یہ رقم چار قسطوں میں سہ ماہی بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کے عوض میں ہر سال اسی قیمت کی کتابیں ارکان اکاڈمی کو پیش کی جائیں گی، اور رسالہ "جامعہ" اور "پیام تعلیم" جن کا مجموعی چندہ ساڑھے سات روپیہ ہے بلاقیمت نذر کئے جائیں گے۔ اکاڈمی میں اردو کی تمام مستند کتابیں، اور دوسری انجمنوں کی مطبوعات بھی فروخت کے لئے موجود رہتی ہیں اور اس کے ارکان کو اپنے چندہ کی مقدار تک ان کتابوں سے بھی انتخاب کرنیکا اختیار ہے۔ ہم تمام شائقین ادب سے اس اکاڈمی کی امداد و اعانت کی اپیل کرتے ہیں۔ جو صاحب اس کے رکن بننا پسند فرمائیں وہ ناظم صاحب اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ دہلی کو اپنے نام اور پتے سے مطلع فرمائیں۔

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس طرف اردو ہندی کی کئی قابل قدر تصانیف شائع کی ہیں

تازہ اُردو مطبوعات کے نام یہ ہیں:-

ترقی زراعت (حجم ۳۲۱ صفحات) از خانصاحب مولوی محمد عبدالقیوم صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت صوبہ متحدہ - قیمت للعہ

قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب (حجم ۲۳۴ صفحات) از رائے بہادر مہامہوپادھیائے گوری شنکر ہیراچند اوجھا، مترجمہ منشی پریم چند - قیمت للعہ

ہندی شاعری (حجم ۲۰۲ صفحات) از ڈاکٹر اعظم کریوی قیمت ۶ؔ؍

کبیر صاحب (حجم ۱۵۲ صفحات) از پنڈت منوہر لال زتشی قیمت ۶ؔ؍

پچھلے نمبر میں جب ہم نے رائے بہادر بابو آنند سروپ صاحب پر مکرم و محترم منشی جوالا پرشاد صاحب بی۔ اے، ایل ایل۔ بی، وکیل کانپور کا قابل قدر مضمون شائع کیا تھا تو کس کو معلوم تھا کہ خود صاحب موصوف بھی ہمارے درمیان چند ہی روز کے مہمان ہیں۔ کچھ دنوں سے آپ کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی اور دوسری آنکھ میں بھی کچھ شکایت پیدا ہو گئی تھی جس سے وہ بہت نڈھال رہنے لگے تھے۔ خانگی تردوات بھی تھے اور بعض اعزا میں ناچاقی تھی، غرض ان وجوہ سے وہ کچھ اس درجہ دل برداشتہ ہو گئے کہ ۴ فروری کے سہ پہر کو اپنے مکان سے چل دیے اور اب تک باوجود تلاش ان کا کوئی پتہ نہیں ملا جس سے خوف ہوتا ہے کہ شاید کسی خاص دماغی ہیجان کی حالت میں اُنھوں نے اپنی زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔ زمانہ کے مضمون میں آن کے یہ الفاظ کہ "بابو آنند سروپ صاحب تو دنیا سے کوچ کر گئے مگر ان کے بعض دوست بھی "کمر باندھے ہوئے چلنے کو اب تیار بیٹھے ہیں"۔ اس وقت ہم کو خاص طور پر الہام معلوم ہو رہے ہیں۔ بہر حال جو منظور الٰہی تھا ہوا۔ آپ کی مفارقت کانپور کی پبلک لائف کے لئے ایک حادثہ عظیم ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ اہل کانپور کے لیے آپ کی ذات بابرکات ہر طرح سے باعث فخر تھی۔ ابتدائے عمر سے لیکر آخر تک ان کی زندگی پبلک خدمات ہی کے لئے وقف رہی۔ چنانچہ پچھلے تیس سال کے اندر شہر میں رفاہ عام کا شاید ہی کوئی کام ایسا ہوا ہو جس میں اُنھوں نے صدق دل اور خلوص نیت سے سرگرم حصہ نہ لیا ہو۔ آریہ سماج اور دیانند کالج اور شہر کے متعدد ٹرسٹوں کے وہ ممتاز رکن اور معزز عہدہ دار تھے۔ کالج میں پروفیسر قانون اور شہر کی آنریری مجسٹریٹی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے۔ آپ طبعاً حد درجہ منکسر مزاج واقع ہوئے تھے، صبر و تحمل ان کی فطرت کے خاص جزو تھے۔ نیک نفسی اور فطری شرافت کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہر طبقے میں ہر دلعزیز رہے،

انکی طبیعت سادگی پسند تھی - چنانچہ اپنے آرام و آسایش کا کبھی کوئی خاص خیال نہ رکھتے تھے۔
غرض قدیم تہذیب اور اگلی وضعداری کے وہ ایک بہترین نمونہ تھے۔ اُردو ادب سے بھی اُنھیں
خاص شغف تھا، اخبار و رسائل کے مطالعہ اور کتب بینی سے ان کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوتی تھی انکی
تحریر و تقریر دونوں دلپذیر ہوتی تھی، زمانہ سے اُنھیں ہمیشہ خاص دلچسپی رہی، تقریباً دس سال تک
اس کا دفتر بھی ان کے دولت خانہ سے ملحق انہیں کے ایک دوسرے مکان میں رہا۔ اس دوران میں کارکنان
زمانہ کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے پایا کہ وہ اپنے ذاتی مکان میں نہیں بلکہ کرایہ کی عمارت میں ہیں
افسوس! آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

ہم کو افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ دسمبر گذشتہ کے پرچے میں زمانہ کی توسیع اشاعت کے
متعلق ہم نے اپنے معزز ناظرین سے جو اپیل کی تھی اس پر ہمارے احباب نے کوئی خاص توجہ نہیں
فرمائی۔ نئے سال کے آغاز ہی سے عام کساد بازاری کا اثر رسالہ کی آمدنی پر محسوس ہو رہا ہے۔ در حقیقت
اس وقت تک اس کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں ہوسکی ہے، ادھر کئی سال سے اس کے آمد
وخرچ کا فرق اخبار آزاد کے منافع سے پورا ہو رہا ہے، یہ بھی واضح رہے کہ زمانہ پر بہت ہی جچے تُلے ہوئے
اخراجات کیے جاتے ہیں اور ذاتی محنت و جفاکشی سے جس قدر کفایت ممکن ہے کیجاتی ہے۔ ایسا
نہ ہوتا تو شاید ابتک زمانہ کی زندگی ہی قائم نہ رہ سکتی۔ ہمارا خیال ہے کہ زمانہ اُردو ادب کی ایک
خاص خدمت انجام دے رہا ہے۔ اور اگر قدر دانان رسالہ بھی ہمارے ہم خیال ہیں
تو ان کو اس کی امداد سے بے فکر نہ رہنا چاہیئے۔ امداد و اعانت کا آسان ترین طریقہ توسیع اشاعت
ہے، پانچ روپیہ سالانہ معزز ناظرین کے اکثر احباب کے لئے کوئی بڑی رقم نہیں ہے جسے وہ اُردو ادب
کی ترقی کے لئے آسانی سے نہ دے سکیں۔ بہر حال ہم ایک مرتبہ پھر اپنے علم دوست احباب سے
اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں زمانہ کے سر پرستی کی سفارش فرما کر ہماری امداد فرمائیں، ہمکو
بھروسہ ہے کہ ہماری اپیل بیکار نہ ہوگی اور ہمارے قدر شناس اس پر جلد ہی توجہ فرما کر ہم کو
شکریہ کا موقع دیں گے۔

سر محمد شفیع آنجہانی

آنریبل محمد شفیع آنجہانی مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر اور ملک کی قابل ترین ہستیوں میں تھے

پنجاب ہائیکورٹ کے بیرسٹروں میں آپ کا درجہ بہت ممتاز تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ سے بھی آپ کا دیرینہ تعلق تھا اور آپ اس کے مشہور رہنما تھے۔ تمام عمر آپ ملک و قوم کی بہتری کے کوشاں رہے۔ پانچ سال سے زائد یعنی سنہ ۱۹۱۹ء لغایتہ سنہ ۱۹۲۴ء آپ وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے گول میز کانفرنس کے دونوں اجلاسوں میں بھی بطور ڈیلی گیٹ شریک ہوئے تھے اور اس حیثیت سے بھی آپ نے اپنی اعتدال پسندی اور ملکی بہی خواہی کا پورا ثبوت دیا، لندن سے واپسی پر ہز ایکسیلنسی لارڈ ولینگڈن نے آپ کو سر فضل حسین صاحب کے جگہ اپنی انتظامیہ کونسل کا قائم مقام ممبر مقرر فرمایا تھا مگر افسوس کہ آپ اس جلیل القدر عہدے کا بار سنبھالنے نہ پائے تھے کہ ایک مختصر علالت کے بعد، ۷ جنوری سنہ ۳۲ء کو ۶۳ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

طلسم خیال

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

چمن میں آئے فقط موسم خزاں کے لئے
جہاں میں ہم ہوئے پیدا غم جہاں کیلئے

عدم سے لائی تو ہستی میں تیری بیتابی
اب اضطراب ہے جان حزیں کہاں کیلئے

ہوا پدید جو سودا تو میرے سر کی غرض
بنا جو سر تو ترے سنگ آستاں کیلئے

ہے اپنی گردش بخت سیاہ ہم پیشہ
مباح ہے یہ ستم مجھ پہ آسماں کیلئے

نہ سازگار زمانہ ہے اور نہ تو اپنا
اثر کہاں سے ہو فریاد بیکساں کیلئے

اسیر ہو کے ہوں ممنون شفقت صیاد
جگہ ملی تو مجھ آوارہ خانماں کیلئے

ملا جو مر کے تو پھر لطف کیا رہا زاہد
جو بے قرار رہے عیش جاوداں کیلئے

پکے ہوئے پیر
پھوڑے پھنسی اور
پرانے زخم
زمبک سے جلد شفا اور تسکین پاتے ہیں
پھوڑوں۔ پرانے زخموں اور گوشت خور زخموں کی حالتیں جنمیں سخت جلن۔ درد اور سوزش ہوتی ہو زمبک اپنی حیرت انگیز شفا بخش خاصیت کا اظہار کرتا ہے۔
اوسط پیمانہ کے زخموں یا پھوڑوں پر زمبک کو براہ راست ڈبیہ سے لیکر لگا دینا چاہئے۔ جب زخم کا دائرہ وسیع ہو تو روئی کے پھائے یا صاف کپڑے پر زمبک کا موٹا پرت پھیلا کر لگانا چاہئے۔ اس خالص جڑی بوٹی کے مرہم کے زیر اثر گرمی۔ درد۔ سوزش میں جلد افاقہ ہو جاتا ہے اور امراض مکمل طور سے دفع ہو جاتے ہیں۔
زمبک کی تسکین بخش اور تریاق صفت خاصیت کیساتھ ساتھ شفا دینے کی قوت بھی حیرت انگیز ہے بیمار اعضاء پھر سے مستقل طور پر قوی اور تندرست ہو جاتے ہیں کیونکہ زمبک جلد کے اندرونی ریشوں اور مسامات کی از سر نو تعمیر کرتا ہے
چھاجن۔ خارش۔ کھجلی۔ داد۔ زہریلے زخم۔ بواسیر۔ شگاف۔ چیچک۔ جلنا۔ جھلسنا۔ درد اور موچ وغیرہ کے لئے بھی زمبک کو استعمال کیجئے۔ تمام انگریزی دوا فروش زمبک فروخت کرتے ہیں قیمت ایک روپیہ۔
بڑی ڈبیہ کی قیمت دو روپیہ ۱۲ ۔ ایجنٹ :- مسرز کے۔ بی محمد سعید اینڈ کمپنی مٹسن روڈ۔ کانپور
جڑی بوٹیوں کا حیرت انگیز مرہم
زمبک
Zam-Buk

گھر اور دفتر کی زینت

ہاف ٹون عکسی تصاویر

یہ تصاویر ہاف ٹون بلاک سے عمدہ آرٹ پیپر پر شائع ہوئی ہیں اور ان کو عام پسندیدگی کا فخر حاصل ہے

تصاویر رنگین

- نی تصویر ۲ر
- مسیح ابن مریم
- نغمہ محبت
- موسم سرما
- باد وبہاری
- انتظار
- ہدایت
- خواب راحت
- گل تیج روز
- رفیق طفلی
- شکنتلا و دشینت
- مشعل ہدایت
- تار شکستہ
- صبح نوروزی

رنگین تصویر کے نمونے

- کثرت میں وحدت ۲ر
- رقت ترع ۲ر
- رام بن باس ۲ر
- کرشن اجودھیا جی ۲ر
- نظریہ کا اتار
- راجہ اج کا بلاپا ار

- بھکارنی ۲ر
- گنگا اور بھیشم ۲ر
- سمندر رسا شن ۲ر
- امید وفاداری ۲ر
- شیواجی اور رام داس ۲ر
- قدیم زمانہ کا طریق جنگ
- یورپ کا ایک معرکہ ۲ر
- ایک قدیم مشرقی مدرسہ ۲ر
- مصطفےٰ کمال پاشا کی ترکی کونسل ۲ر
- غسل کی تیاری ۲ر
- سیلتہ وان اور ساوتری ۲ر
- راجہ کمانڈ کے بیٹے کا قتل ۲ر
- باسدیو اور دیوکی قید ۲ر
- زوجہ گنیش متعلق میگ
- زوت کا لباس ار
- گوتم بدھ ار
- اکبر اعظم ار
- راجہ مان سنگھ ار
- اکبر اور چیتے کا شکار ار
- دربار شاہجہان ار
- عہد مغلیہ میں شاہی سواری کا جلوس

- محاصرہ چتوڑ
- پیدائش شاہزادہ سلیم
- دربار جہانگیر میں سفیر فارس
- داراشکوہ کا سر اورنگزیب کے سامنے پیش ہوتا ہے
- میرن صاحب خلیفہ جعفر
- ٹیپو سلطان
- دربار مادھو راؤ پیشوا
- دربار شاہ عباس

موسمی تصاویر

- ماہ چیت ۲ر، بیساکھ ۲ر
- جیٹھ ۲ر، اساڑھ ۲ر
- بھادون ۲ر، ماگھ ۲ر
- پھاگن ۲ر، ساون ۲ر

مشہور انشاء پردازان اردو

- مولانا شبلی ار
- شمس العلماء ذکاء اللہ
- شمس العلماء ڈاکٹر سید علی
- میر تعشق علی ۲ر
- حضرت انیس مرحوم ۲ر
- حضرت سرور ۲ر

- مولوی عزیز مرزا صاحب ۲ر
- بابو بالمکند گپتا ۲ر
- اڈیٹر بھارت مترا ۲ر
- مشاعرہ کیننگ کالج منعقدہ سنہ ۱۹۱۱ء ۶ر
- منشی احمد علی شوق ار
- مرزا سلطان احمد ار
- مرزا محمد رفیع سودا ار
- مرزا انشاء اللہ خان ار
- مولانا عبد الرزاق ایڈیٹر الکلام ۲ر
- مولانا آزاد دہلوی ۲ر
- مسٹر رام بابو سکسینہ ۲ر
- منشی نوبت رائے نظر ۲ر
- جناب چکبست ۲ر
- حضرت صفی ۲ر
- ڈاکٹر اقبال ۲ر
- مولانا حسن نظامی ۲ر
- لیڈران ہند
- ونامور ان ملک
- راجہ رام موہن رائے ار
- مسٹر دادابھائی نوروجی ار
- سالار جنگ ۲ر

- ڈاکٹر نذیر احمد خاں ار
- ارکین دیانند کالج لاہور
- مسٹر تلک ۲ر
- جسٹس محمود ۲ر
- بابو سریندر ناتھ بنرجی ار
- مسٹر کالیچرن بنرجی ار
- مسٹر رام کرشن بھنڈارکر ار
- بابو گنگا پرشاد ورما ار
- سوامی دیوکانند ۲ر
- نواب محسن الملک ۲ر
- مسٹر مس بہاری ۲ر
- ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی ار
- پنڈت بشمبر ناتھ ۲ر
- بابو ترباب چندر بنرجی ۲ر
- جسٹس لال چند ایم اے ار
- آنریبل مسٹر گوکھلے ۲ر
- انجمن خادمان ہند ۲ر
- مسٹر رام داس ۲ر
- مہاتما گاندھی ۲ر
- پنڈت مدن موہن مالوی ار

- کرنل بھولا ناتھ ۲ر
- پنڈت موتی لال نہرو ۲ر
- لالہ لاجپت رائے ۲ر
- ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ۲ر
- سر ابراہیم رحمت اللہ ار
- لالہ ہنسراج ۲ر
- راجہ صاحب محمود آباد ۲ر
- لارڈ ستیاند سنہا ار
- سر آغا خان ۲ر
- مولانا محمد علی ۲ر
- مسٹر سچدانند سنہا ۲ر
- مسٹر سروجنی نیڈو ۲ر
- مسٹر وجے لکشمی پنڈت ... راؤ ار
- مہاتما تلسی رام ۲ر
- سوامی سردھانند ۲ر
- سر نیندرا ناتھ بنرجی ٹیگور ۲ر
- بابو بھگوان داس ار
- سید امیر علی ار
- نواب سید حسن بلگرامی ار
- نواب سید محمد ار

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے منگائیے

بانی
ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن
لمیٹڈ
ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن
کلکتہ
اسٹار ٹریڈ مارک رجسٹرڈ
SKB
"پچاس سالوں سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کے بے مثل موجد"
REGD.
پشٹینا
(مقوی باہ کی گولیاں)
اس مقوی دوا کے استعمال سے معمولی کمزوری۔ نامردی۔ جریان۔ ہاتھ پیروں کا کانپنا۔ حول دل۔ حافظ کی کمی اور تکان وغیرہ رفع ہوتی ہے۔ دوران استعمال دوا لگا ہے گاہے ہماری تیار کردہ "جلابن" جلاب کی گولی سے معدہ صاف کر لینا ضروری ہے۔ قیمت دو ہفتوں کی خوراک تیس ۳۰ گولیوں کی ایک روپیہ دو آنہ ۱۸/۲
قیمت جلابن بارہ گولیوں کی شیشی دس آنہ (۱۰/) محصول ہر دو شیشی سات آنہ ۷/
قیمت نمونہ پشٹینا ۳/ نمونہ جلابن دو آنہ (۲/)
REGD
کیشراج تیل
(سر میں لگانیکے تیلوں کا بادشاہ)
یہ خوشبودار تیل بالوں کی جڑوں کو مضبوط اور دماغ کی خشکی دور کر کے تر و تازہ رکھتا ہے۔ یہ ان مفید اجزا سے مرکب تیار کیا گیا ہے جو دماغ و آنکھوں کے لئے نہایت مفید ہیں۔ اسکی خوشبو دیرپا اور نہایت دل پسند ہے۔ اسمیں وھائٹ آئیل وغیرہ کوئی مضر صحت چیز شامل نہیں ہے۔ قیمت فی شیشی پندرہ آنہ ۱۵/ محصول دس آنہ ۱۰/ قیمت نمونہ ۳/
نوٹ نمبر ۱:۔ ہمارے یہاں کی آیورویدک دواؤں کی فہرست چھپکر تیار ہو گئی ہے۔ طلب کرنے پر مفت روانہ ہوگی۔ عام خریداروں کو نمونے صرف ہمارے ایجنٹوں ہی سے مل سکتے ہیں۔
نوٹ نمبر ۲:۔ ہماری دوائیں ہر جگہ دوا فروشوں اور دوکانداروں کے یہاں ملتی ہیں۔ ڈاک محصول بہت بڑھ گیا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خریدیے۔
(صیغہ نمبر ۶۷) پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ
ایجنٹ:۔ کان پوریا گنج میں محمد حفیظ۔ محمد نصیر صاحبان

ہیرے اور سچے موتیوں کا
سفید سرمہ
مصدقہ
جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کراپر صاحب بہادر
سی۔ آر۔ فیلو آف کیمسٹری لندن
آنکھوں کی بیماریوں و ترقی بینائی کیواسطے مفید ہے اور سب سے
بہتر زود اثر دوا ہے۔ ملک روس افریقہ وغیرہ کے معزز ڈاکٹروں
و ہندوستان کے نامور حکیموں نے آنکھوں کی بیماری میں
اور دوا چھوڑ کر استعمال کئے ہیں۔
ہمارے سرمہ کا امتحان اور اُسمیں کامیابی
(۱) نگاہ تاب کر ہمارا سرمہ لگایئے دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائیگی
اور جملہ نقائص چشم دور ہونگے۔
(۲) عینک کی ضرورت نہیں ہوتی۔
(۳) دھند۔ ڈھلکا۔ آنسو بہنا۔ سرخی۔ کھجلی۔ سوزش۔ آنکھوں
کے سامنے اندھیرا۔ پلکوں کی اندرونی گوہانی دور ہوتی ہے
(۴) کمزور نگاہ سے تاگا سوئی میں بہت جلد پرو لیجئے۔
(۵) پربال۔ سبل۔ جالا۔ پھولی۔ ابتدائی موتیابند۔ ناخونہ۔
آنکھ کے سامنے ڈور اسا آنا بند ہو جاتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے
آنکھ کا تکان۔ درد۔ بہت جلد صاف کرتا ہے اور جملہ امراض
چشم کے لئے اکسیر ثابت ہوا ہے۔ قیمت فی تولہ ۲ روپے
محصول ڈاک چھ آنہ (۶/)
ملنے کا پتہ
مینیجر نگم کمپنی۔ بناچوک کانپور
سناٹوجن
سے
ملیریا کی کمزوری پر فتح حاصل کیجئے
بنگال کے مشہور ڈاکٹر ایچ۔ ڈبلو۔ ایس لکھتے ہیں
کہ ملیریا کی کمزوری کیلئے مسلمہ طور سے سناٹوجن
سب سے زیادہ موثر دوا ہے۔
کونین ملیریا سے شفا بخشیگی لیکن بخار کے بعد کمزوری
پر کبھی فتحیاب نہ ہوگی۔
ازسرنو طاقت حاصل کرنیکا صرف یہی طریقہ ہے کہ کمزور
جسم کو صحیح غذا دیجائے۔ یہ غذا سناٹوجن ہے
سناٹوجن جسم اور خون میں ٹھیک ٹھیک جزو داخل کرتی
ہے جن سے قوت بنتی ہے اور تعجب انگیز تھوڑے وقت
میں نیا خون بناتی ہے۔
آج ہی سے سناٹوجن کا استعمال
شروع کر دیجئے
SANATOGEN
اصلی مقوی غذا
سب دوافروشوں اور بازاروں سے ملسکتی ہے تیاری
یا پیکنگ کے دوران میں سناٹوجن ہاتھ سے نہیں چھوئی جاتی
CC-0 Kashmir Research Institute. Digitized by eGangotri

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

بزم خیال

اسمین اردو اور فارسی شعرا کی مجالس کے لطائف و ظرائف اور برجستہ گوئی و حاضر جوابی کے نمونے جمع کیے گئے ہیں جو خوش مذاق حضرات کی تفریح کا بہترین سامان ہے

قیمت صرف ایکروپیہ عہ ر

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے

قیمت فی جلد ۹ ر

خاک پروانہ

منشی پریم چند کی تازہ ترین چودھ منتخب مضامین کا مجموعہ پریم چند صاحب کے افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں

قیمت ایک روپیہ عہ ر

انتخاب اودھ پنچ

اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ان مضامین کا مجموعہ جو ۱۸۷۷ء سے ۱۸۷۸ء میں اسمین شایع ہوئے تھے علاوہ اس کے بہت سا تفریح کا سامان بھی موجود ہے

قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ ۸عہ

بہرام کی ہاتی

نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے

قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

خیالات عزیز

مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب جسکی باضابطہ رجسٹری ہوئی ہے حجم ۲۰۰ صفحات درق پر مصنف کی تصویر اور ٹائیٹل خوشنما رنگین ہے کاغذ عمدہ چھپائی اعلیٰ قیمت فی جلد عہ

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا مشہور و مقبول دیوان ہے جو حال میں حسن و خوبی کے ساتھ شایع ہوا ہے داغ صاحب کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں

قیمت بلحاظ دیوان صرف ۸عہ ر

مثنوی سحر

یعنی شگفتہ و شستہ منظوم حضرت سحر نگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز اول ایڈیشن کی قیمت ۶ر دوسرے ایڈیشن کی قیمت جسکی مصنف نے نظر ثانی بھی کی ہے صرف ۸ر

مرقع ادب

حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزاپوری اسمین ہندوستان کے مشہور انشاپردازوں شعرا کے وہ خطوط جمع کیے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں قیمت حصہ اول ۸ر حصہ دوم عار

ملنے کا پتہ: - منیجر نامی بک ایجنسی کانپور

ہمزاد (ڈراما)

اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔ اے کا وہ دلچسپ ڈراما جس میں کم عمر بیوی اور "بزرگوار شوہر" کے معاملات قدرے ظرافت آمیز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اچھی سوسائٹی میں اسٹیج کرنے کیلئے یہ ڈراما بہت مناسب ہے۔ طباعت کتابت، کاغذ بہت اچھا۔ یہ اُردو کی اُن کتابوں میں سے ہے جو تمام لوازم اشاعت سے آراستہ ہیں ۶

"گناہ کی دیوار" (ڈراما)

مصنفہ اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔ اے۔ گناہ بُری چیز ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر بدتر ہیں گناہ کی دیوار شاید ٹوٹ سکتی ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر کے بتوں کو توڑنا بہت دشوار ہے۔ یہ ایک باعصمت خاتون کا قصہ ہے جسے کچھ عرصہ تک مجبوراً عصمت فروشی کی زندگی گزارنی پڑی لیکن بالآخر خدا نے اُسکی گریہ وزاری سُن لی اور اس زندگی سے نجات دلائی قیمت ۸ر

کھیتی

مصنفہ محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لئے ایک دلچسپ ڈراما مذہب اور اخلاق کس رستے پر چلانا چاہتے ہیں۔ زمانے کی مصلحتیں، قوم و ملت کی ضروریات سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے اور ایک معیار بھی تجویز کیا گیا ہے جو رہنمائی کے دعویداروں کو پرکھنے میں کام آسکتا ہے۔

قیمت صرف ۶ر

پردۂ غفلت

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا وہ ڈراما جو اُنھوں نے قیام جرمنی میں لکھکر وہیں چھپایا تھا مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر، تعلیم نسواں، آزادی نسواں اور پردہ پر مفید بحث، دلچسپ ظرافت آمیز اور نتیجہ خیز قصہ طباعت عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

دیا نرائن نگم ایڈیٹر و پبلشر
مطبوعہ سری لیتھو ریشہ بسر دال پریس کانپور

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔اے

جلد ۵۸	مارچ سنہ ۱۹۳۲ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

تصویریں:- مہاراجہ جے چندر راٹھور کا دربار۔ ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور۔ حاذق الملک حکیم اجمل خانصاحب مرحوم۔

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت فی پرچہ ۴/

قیمت سالانہ ۳/

قیمت سالانہ ممالک غیر سے مع محصول ڈاک ... ہندوستان سے ... قیمت تین روپیہ

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

بزم خیال

اس میں اردو اور فارسی شعرا کی مجالس کے لطائف و ظرائف اور برجستہ گوئی و حاضر جوابی کے نمونے جمع کئے گئے ہیں جو خوش مذاق حضرات کی تفریح کا بہترین سامان ہے۔ قیمت عہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے

قیمت فی جلد ۹ر

خاک پروانہ

منشی پریم چند کے تازہ ترین چودہ منتخب مضامین کا مجموعہ۔ پریم چند صاحب کے افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں قیمت ایکروپیہ عہ

انتخاب اودھ پنچ

اخبار اودھ پنچ لکھنؤ نے ان مضامین کا مجموعہ جو ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۰ء میں اسمیں شائع ہوئے تھے علاوہ ازین بہت سا تفریح کا سامان بھی موجود ہے قیمت عمر

بہرام کی رہائی

نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کے بعد اسکا پڑھنا نہایت ضروری ہے

قیمت ۸ر

خیالات عزیز

مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب کی باضابطہ رجسٹری ہوگئی ہے حجم ۲سو صفحات ٹائیٹل خوشنا رنگین ہے لکھائی چھپائی اعلیٰ۔

مع تصویر مصنف

قیمت صرف دو روپیہ

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی کا مشہور و مقبول دیوان ہے جو کمال میں حسن و خوبی کے ساتھ شائع ہوا ہے داغ صاحب کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں قیمت بلحاظ دیوان صرف عمر

مثنوی سحر

یعنی شکنتلا و شانتی منظوم حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز اول اڈیشن کی قیمت ۶ر دوسرے اڈیشن کی قیمت جسکی مصنف نے نظر ثانی بھی کی ہے صرف ۸ر

مرقع ادب

حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزاپوری اسمیں ہندوستان نے مشہور نثار پرداز و شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں۔ قیمت حصہ اول عمر

حصۂ دویم ۶ر

ملنے کا پتہ:۔ مینجر زمانہ بک ایجنسی۔ کان پور

مرقع دربار مہاراجہ جے چندر راٹھور والی قنوج
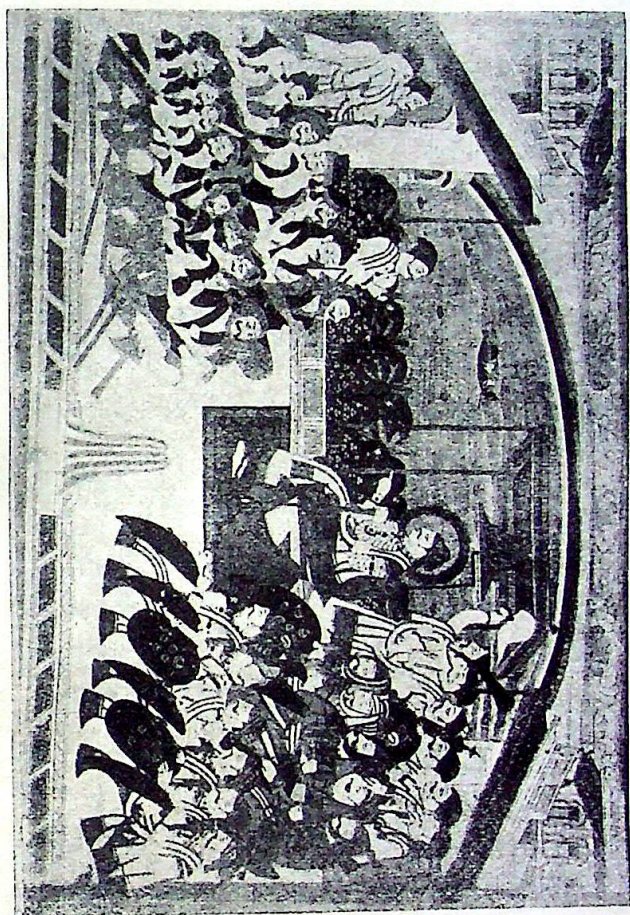
زمانہ

جلد ۵۸ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء نمبر ۳

ملک الشعراء ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹیگور

از منشی اقبال ورما سحرؔ ہتگامی

واقعی فخر و مسرت کا مقام ہے کہ ہم کو اس سال اپنے ایک ایسے شہرۂ آفاق اور یکتائے روزگار شاعر کی سترویں سالگرہ کے جشن منانے کا موقع ملا ہے جس کی عالمگیر شخصیت پر نہ صرف ہندوستان بلکہ کل دنیا کو بجا طور پر ناز ہے۔ جس کے اشعار وہ نغمۂ عشق ہیں جو اپنی کشش اور دلآویزی سے تمام بنی نوع انسان کو بلا تفریق مذہب و ملت و قومیت اپنی جانب مائل کرنے کے علاوہ اُن کو رشتۂ اتحاد و ارتباط میں بھی باہم منسلک ہونے کی دعوت دیتے ہوئے اُس ذات حقیقی کی جانب رجوع کرتا ہے جو عشق مجسم ہے، اُس کے کلام میں وہ لطافت و نازک خیالی ہے جن کے اتصال کو ہم روحانیت کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں جو انسان کے مادّی قالب سے بے تعلق ہو کر کام کرتی ہے اور جو دل و دماغ کی وساطت سے بے نیاز ہو کر براہ راست روح کو متحرک و متاثر کر دیتی ہے۔ اس کے کلام سے روح پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل و دماغ کے فوری اور وقتی عمل کی بدولت سارا قالب انسانی نشۂ مسرت سے سرشار ہو کر بے اختیار جھومنے لگتا ہے۔ یہی وہ معراج شاعری ہے جس تک رسائی حاصل ہونے کی دنیا کے بہترین شعرا کی ہمیشہ سے ہوس رہی ہے بلکہ ہمیں یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہے کہ آج اس بارے میں دنیا کا بڑے سے بڑا شاعر بھی ٹیگور جی کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہے۔

ربیندر ناتھ ٹیگور کا جنم بنگال کے ایک قدیم معزز اور دولتمند گھرانے میں ہوا تھا، اُن کا سنہ ولادت ۱۸۶۱ عیسوی ہے اور مقام ولادت کلکتہ۔ اُن کے والد ماجد دیویندر ناتھ ٹیگور برہمو سماج کے مقتدر لیڈر تھے۔ اُن کے روحانی کمال کا یہ عالم تھا کہ لوگ اونھیں مہرشی کے مقدس لقب سے یاد کرتے تھے، اُن کی والدہ میں بھی وہ تمام اوصاف موجود تھے جو ایک بہترین ہندوستانی خاتون کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس طرح ٹیگور کو خوش قسمتی سے بہت سی پاکیزہ خصلتیں اور روحانی برکتیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملی ہیں، مگر قدرت نے اُن کو اپنے ماں باپ کے فیضان صحبت سے کما حقہ مستفید ہونے کا زیادہ موقع نہیں دیا۔ ربیندر ناتھ ٹیگور ابھی بہت ہی کم سن تھے کہ اُن کی والدہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اُدھر اُن کے والد کی مذہبی مصروفیتیں مانع ملاقات ہورہی تھیں چار و ناچار ٹیگور کا بچپن زیادہ تر مکان ہی کی چار دیواری کے اندر یا تو ایک کمرہ میں گذرا یا نوکروں چاکروں میں۔ غرض ان مجبوریوں سے وہ تنہائی پسند ہو گئے، مگر تنہائی میں بھی وہ بیرونی دنیا کی گوناگونیوں کے متعلق برابر خیال کرتے رہتے تھے جس کی بدولت اُنھیں بار بار یہ خیال آنے لگا کہ کوئی بہت ہی عزیز دوست غائبانہ طور پر ہر وقت اُن کے پاس موجود رہتا ہے۔ انھیں خیالات میں ہمکو اس شاعر اعظم کے تخیل کی پرواز کا سراغ ملتا ہے۔ انھیں کی بدولت ہم اُن قدرتی مدارج سے روشناس ہوتے ہیں جو صانع قدرت کی موجودگی کا اظہار کرتے ہوئے بالآخر اُس تک رسائی حاصل کرنے میں زینے کا کام دیتے ہیں۔

جب ٹیگور پیدا ہوئے اُس وقت بنگال میں دو انقلابات عظیم رونما ہو رہے تھے جنھوں نے آگے چلکر وہاں کی مذہبی اور ادبی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی پہلے کے بانی راجہ رام موہن رائے اور دوسرے کے پیشوا بنکم چندر چٹرجی تھے۔ ایک برہمو سماج کے ذریعہ مذہب کو زیادہ سے زیادہ قابل قبول شکل دیتے ہوئے مذہبی رواداری اور انسانی مساوات کے لیے کوشاں تھا اور دوسرا اپنے ادبی کارناموں کے ذریعہ بنگلہ زبان میں جدت و ترقی کے دَور کی بنیاد ڈال رہا تھا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا انقلاب بھی تھا جو ملکی اور دنیوی نقطۂ خیال سے نہایت اہم تھا اور جس کا تعلق ہندوستان کی فن مصوری سے تھا جو اپنی فطری اور روحانی سادگیوں سے مغربی مصوری کی مادّی اور مصنوعی رنگینیوں کو بے رونق اور ناپسندیدہ بنانے پر تلا ہوا تھا۔ ان تینوں تحریکوں میں ٹیگور کے گھرانے والوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ بہرحال جس انقلابی ماحول میں ہونہار شاعر کا جنم ہوا تھا اس سے اس کا دل متاثر بھی ضرور ہوا، مگر ٹیگور کی زندگی پر یہ اثر خالص شاعرانہ طریقہ پر نظر آرہا ہے، اسی کی بدولت اس کے تخیل میں روحانیت، طرز تحریر میں جدت اور کلام میں ندرت آفرینی کا عنصر غالب آتا گیا۔

ٹیگور نے ابتداءً اس وقت کے رواج کے مطابق ایک پاٹھ شالا میں پڑھنا شروع کیا، مگر وہاں کی پابندیاں اور اُستاد کی سخت گیریاں اُن کے آزادی پسند اور نازک دل پر گراں بار ہوئیں اور سب سے زیادہ یہ بات تھی کہ ان کا دل ایسی تعلیم میں کسی طرح نہ لگ سکتا تھا جو اُنھیں "چاروں طرف کی دنیا سے سرد مہری کے ساتھ الگ رکھتی تھی" غرض جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں، اُنھوں نے تیرہ سال ہی کی عمر میں اُس تعلیم سے نجات حاصل کر لی جو اُنھیں معمولی اسباق کی سنگی دیواروں میں مقید رکھنا چاہتی تھی" بہر نوع انھوں نے کسی اسکول یا کالج میں کبھی نہیں پڑھا اور لطف یہ کہ اس کو وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں، اُن کے والد نے خانگی تعلیم کے لئے ایک ماسٹر مقرر کر دیا تھا، اس کے علاوہ سترہ سال کی عمر میں اُنھوں نے انگلستان جا کر ایک سال تک وہاں انگریزی علم و ادب کا درس لیا۔ اس سلسلے میں انھیں نامور ادیب و مصنف جان مارلے (بعدہٗ لارڈ مارلے) صاحب کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔ پہلے ان کا ارادہ بیرسٹری کی سند حاصل کرنیکا تھا مگر وہ پورا نہ ہوا درحقیقت قدرت تو اُنھیں ایسا شاندار کام سپرد کرنے جا رہی تھی جس سے اُس کے رازہائے سربستہ منکشف ہو کر لوگوں کو حیرت میں ڈالدیں۔

ٹیگور کے خاندان کے تمام افراد کو موسیقی، مصوری اور شاعری سے گہری دلچسپی تھی، اور ٹیگور کے فطرتی رجحان نے ان کو بھی اُنھیں فنون لطیفہ کی جانب مائل کر دیا تھا، چنانچہ اُن کا کلام ہر سہ کمالات کا ایک مرقع ہے۔ اور شاعری کے علاوہ وہ مصوری اور موسیقی میں بھی کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے کتنے ہی نئے طرز کے گیت بنائے ہیں، اُن کی خوش الحانی کا یہ عالم ہے کہ سامعین اُن کی مادری زبان سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی اُن کا گانا سنکر مسرور ہو جاتے ہیں، ان کو بحیثیت فن ناچ سے بھی دلچسپی ہے، اور یہ انھیں کی تلقین کا نتیجہ ہے کہ اب معزز بنگالی سوسائٹی میں مستورات کے لئے گانا یا ناچنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ٹیگور ڈراموں میں بھی شوق سے پارٹ لیتے ہیں اور اُسے شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے اظہار کا ایک کامیاب وسیلہ سمجھتے ہیں۔

تئیس ۲۳ سال کی عمر میں ٹیگور کا بیاہ ہو گیا، جس کے بعد اُن کے والد بزرگوار نے اُنھیں زمینداری کی دیکھ بھال کے کام پر تعینات کیا۔ چنانچہ اس خدمت کی تکمیل کے لئے انھیں دیہات جانے اور وہاں قیام کرنے کا موقع مل گیا۔ پہلے تو انھیں شہر کی چہل پہل سے جدا ہو کر دیہات کی نسبتاً سونی فضا میں رہنا شاق ہوا۔ مگر مجبوری معذوری کا معاملہ تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد رفتہ رفتہ ان کی طبیعت دیہاتی زندگی سے بہت مانوس ہو گئی، اور بالآخر ایک دن ایسا آیا کہ دیہاتوں اور وہاں کے باشندوں

کی اصلاح کرنا ہی اُن کی زندگی کا ایک خاص مشن بن گیا جس کی تکمیل میں وہ ابھی تک ہمہ تن مصروف ہیں
۱۹۰۱ء کے قریب اُن کے پدر بزرگوار نے کلکتہ سے تقریباً سو میل کی دوری پر شانتی نکیتن
آشرم کی تعمیر کرائی۔ اس میں کچھ لڑکے بھی آکر پڑھنے لگے، رفتہ رفتہ طلبا کی تعداد بڑھتی گئی جس سے آخرکار
ٹیگور کو اس آشرم کو اسکول کی صورت میں منتقل کرنا پڑا، اُن کو اس کام سے بیحد دلچسپی بھی ہوگئی اور اسے
اپنے مجوزہ اصلاحات کا ایک بڑا ذریعہ سمجھنے لگے۔ وہ شروع ہی سے ایسے قدرتی طریقۂ تعلیم کے دلدادہ تھے
جس کے مطابق لڑکے اسی شوق اور آزادی کے ساتھ پڑھ سکیں جس طرح وہ کھیلتے ہیں۔ وہ ابھی اپنے لڑکپن
کی واردات قلب کو بھولے نہیں ہیں، اس لئے وہ اب تعلیم کو متعلم کی شخصیت کے ارتقا کا ایک مکمل ذریعہ
بنا دینا چاہتے ہیں۔ مگر اس کے واسطے ضرورت تھی کہ وہ خود نمونہ کے طور پر ایک درسگاہ قائم کریں مگر اس کے
لئے سرمایہ درکار تھا اس کے لئے ٹیگور کو ابتدا میں اپنی کتب کا کاپی رائٹ فروخت کرنے کے علاوہ اپنی اہلیہ
محترمہ کا زیور بھی فروخت کرنا پڑا، طلبا کو بھی اُنھیں خود پڑھانا پڑا، مگر اُن کی دلی لگن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی چھوٹا
اسکول ترقی کرتے کرتے ۱۹۲۱ء میں بشو بھارتی نام کا دارالعلوم بن گیا۔ اب وہاں ادبی تعلیم کے ساتھ
مصوری، موسیقی، زراعت، صنعت وحرفت کے سیکھنے کا پورا انتظام ہے۔ اور ان سب شعبوں کے لئے
مختلف اسکول ہیں، اس کے علاوہ چند اور شعبے بھی ہیں جن میں دیہاتوں کی تنظیم، حفظان صحت و صفائی
وغیرہ کے متعلق ضروری تحقیقات و بندوبست ہوتا رہتا ہے تاکہ عام تعلیم کی اشاعت کی غرض سے حسب
ضرورت اسکول بھی کھولے جاسکیں۔ دیہاتوں میں زراعتی نمائشیں بھی کی جاتی ہیں اور بچوں کو بُنائی
جلد سازی اور لکڑی و چمڑہ وغیرہ کے کام سکھائے جاتے ہیں۔ دارالعلوم میں ایک عالی شان کتب خانہ
بھی ہے جس میں تقریباً ہر زبان کی بہترین کتابیں موجود ہیں ایک مطبع بھی ہے۔ اسکول کے لئے ضروری عمارتیں
ہوتے ہوئے بھی طلبا کو درختوں کے نیچے زمین کے قدرتی فرش پر بٹھا کر پڑھایا جاتا ہے۔ پڑھانے والوں
میں امریکہ، انگلستان، جرمنی، اٹلی وغیرہ کے علما اور پڑھنے والوں میں مغربی ممالک کے طلبا بھی ہیں،
ٹیگور نے بشو بھارتی کو اسم با مسمّٰی بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ شانتی نکیتن میں رنگ، نسل،
یا مذہب کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا ہے اور طلبا کے فطری رجحان کے مطابق زبان اور پیشہ کی تعلیم دی
جاتی ہے۔ ہندوستان کے سبھی خاص خاص فرقوں کے تمدنی، معاشرتی اور مذہبی خصوصیات کے متعلق
واقفیت پیدا کرادی جاتی ہے۔ اور لوگوں کو باہر سے بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ ٹیگور محبت کی ہمہ گیریت کے
حامی ہیں اور بشو بھارتی کے ذریعہ وہ اپنے پیام محبت کی تمام دنیا میں اشاعت کر رہے ہیں۔
ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کے لئے کتنے وسیع علمی تجربہ اور مشاہدہ کی ضرورت ہے۔ اسی لئے ٹیگور

نے کئی بار تمام دنیا کے خاص خاص ممالک کا سفر کیا جس سے انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی، امریکہ، چین، جاپان، ملابار کے باشندوں کو بھی اُن کی درویشانہ شخصیت سے متاثر ہونے کا موقع ملا۔ اس سیر وسفر کی بدولت نہ صرف اُن کی معلومات میں اضافہ ہوا نہ صرف انکو انسانی فطرت کی گوناگونیوں اور مناظر قدرت کی بوقلمونیوں پر گہری نظر ڈالنا نصیب ہوا بلکہ انھوں نے دنیا کے کانوں کو اس پیغام سے بھی آشنا کر دیا جسے وہ بھارت کا خاص پیغام سمجھتے ہیں اور جسمیں وہ روحانیت مضمر ہے جس کی بدولت ان کو یقین ہے کہ دنیا کی حالت بہتر بن سکتی ہے انکی بعض تقریریں جو اُنھوں نے ممالک غیر میں ارشاد فرمائیں اُنکی سادھن نامی کتاب میں شائع بھی ہو چکی ہیں۔

اس روحانیت کو اُن کی ذات میں کیسے فروغ ہوا؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ کس ماحول میں پیدا ہوئے تھے، وہ ابتدا ہی سے مناظر قدرت کے شیدائی تھے، دن میں نیلا آسمان، چمکتا ہوا سورج، رنگ رنگ کے بادل اور رات میں نکھرا ہوا چاند، ٹمٹماتے ہوئے ستارے، برق وباراں کا سیاہ سفید منظر، غرض سبھی اُن کی طفلانہ توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا کرتے تھے۔ ان کو دیکھتے دیکھتے اکثر ہمارے ننھے شاعر پر بیخودی کا عالم طاری ہو جاتا تھا، اُس کا دل محبت وروحانیت کے جذبات سے متحرک رہتا تھا اور وہ اسی کوشش میں رہتا تھا کہ کسی طرح اپنی چھوٹی سی ہستی کو قدرت کے اُن دلفریب مظاہر میں جذب کردے جو اُس کے لئے بمنزلہ عجائبات تھے۔ بارہ سال کا بچہ ٹیگور اکثر اپنے والد کی الماری سے ویشنو بھجنوں کی کتاب نکالکر پڑھتا اور محظوظ ہوتا تھا، آخر سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ٹیگور نے خود نظمیں کہنا بھی شروع کر دیا، جن سے عموماً اُس عالمگیر محبت کا انکشاف ہوتا تھا جسے روحانیت کی پہلی منزل سمجھنا چاہیئے پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں اُنھیں کچھ ایسے صدمات پے درپے لاحق ہوئے جنھوں نے تیزی کے ساتھ انھیں اس منزل سے بہت آگے بڑھا دیا۔ یہ صدمات اُن کی اہلیہ محترمہ، اُن کی لڑکی اور اُن کے لڑکے کی موت تھی جن کے سبب اُن کی طبیعت ایک دم روحانیت کی جانب مائل ہو گئی اور اُن کا کلام اُسی اعلیٰ جذبہ کی خوبیوں سے معمور نظر آنے لگا۔ ہر حالت میں صابر وشاکر رہنے والے شاعر نے اُس وقت اپنے دوست مسٹر اینڈریوز سے یہ کہا تھا:۔ "یہ موتیں مجھے گویا ایشوری برداں (خدائی برکت) معلوم ہوئیں اور میں نے سمجھ لیا کہ اب میری زندگی کی تکمیل ہو گئی ہے۔" ٹیگور کے بعد والے کلام کو اسی تکمیل کا ایک نادر نمونہ کہنا بیجا نہ ہوگا جس کا جزوی رنگ اُن کی "گیتانجلی" میں نمایاں ہے جسے اونھوں نے ۱۹۱۲ء میں ولایت جاکر تیار کیا تھا۔ یہ کتاب ان کی بعض بنگالی نظموں کا انگریزی ترجمہ ہے جو اُن کی بنگلہ گیتانجلی اور دیگر کتب سے منتخب کی گئی ہیں۔ اگرچہ ترجمہ میں اصل کا لطف باقی نہیں رہتا پھر بھی اُس نے یورپ کے علم دوست اور سخن فہم حضرات کو اس درجہ متاثر کیا کہ دوسرے ہی سال ۱۹۱۳ء

میں ٹیگور کو اسی کتاب کی بدولت سوا لاکھ کا نوبل انعام ملا۔ جسے اُنھوں نے اپنی شاعرانہ بے نیازی اور فراخدلی سے شانتی نکیتن کے حوالہ کر دیا۔ اس انعام سے نہ صرف اُن کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی بلکہ اُن کی حیثیت بھی بین الاقوامی حیثیت خیال کی جانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی گیتانجلی نے دنیا کے شاعری میں ایک ایسی اعلیٰ شاہراہ قائم کر دی جس پر چلنا زمانۂ آیندہ کے شعرا اپنا متبرک فرض خیال کرینگے۔ اور اس طرح اُس دورِ روحانیت کے وجود میں لانے میں معین ہونگے جسے قدرت کسی نہ کسی روز دنیا میں لا کر رہے گی۔

گیتانجلی کے علاوہ نظم اور نثر میں ٹیگور نے مختلف موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ وہ اس قدر سن رسیدہ ہونے پر اب بھی برابر لکھتے جا رہے ہیں۔ پیرانہ سالی نے اگر اُن کے دماغ پر کوئی اثر ڈالا ہے تو یہی کہ اس میں اور زیادہ پختگی آ گئی ہے۔ علم ادب کے علاوہ ناٹک، ناول کہانی گیت، متفرق مضامین، سبھی کے متعلق اُن کی کتابیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ابتک وہ کئی ماہوار رسالوں کے کامیاب ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ اُن کی ذات فطری اور علمی محاسن کا ایک نادر و نایاب مجموعہ ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُنھوں نے محض اپنی ذاتی مساعی کی بدولت اس قدر اخلاقی عظمت اور علمی ترقی حاصل کی اور پھر اُس ترقی کو کتنے عملی کاموں کے لئے وقف کیا تو ہم حیرت سے انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔ اپنے مطالعہ کو انھیں وسیع بنانے کا کس قدر شوق ہے، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے جرمنی کی ایک مشنری خاتون سے چند ماہ محنت شاقہ کر کے جرمن زبان بھی سیکھی تاکہ جرمنی کے زندہ جاوید شاعر گیٹے کی مشہور و معروف تصنیف فاسٹ کا خاص اُس کی زبان میں مطالعہ کر سکیں۔ مگر ان سارے کمالات کے باوجود وہ اول اور آخر شاعر اور صرف شاعر ہیں۔ اُنھوں نے حال میں اپنی ستّرویں سالگرہ کے جشن میں خیرمقدمی ایڈریس کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے شانتی نکیتن میں فرمایا تھا کہ "کچھ لوگ مجھے فلاسفر سمجھتے ہیں اور کچھ لیڈر، کچھ لوگ مجھے تعلیمی مشنری خیال کرتے ہیں اور کچھ مجھے ماہرِ سیاسیات۔ مگر میں ان میں سے ایک بھی نہیں ہوں، میں تو صرف ایک بانس کی پوری (بانسری) ہوں۔ جسکے ذریعہ کبھی کبھی میرا خالق اپنا ترانہ سنا دیا کرتا ہے"۔

ٹیگور کو سیاسیات سے کوئی عملی دلچسپی نہیں، اگرچہ وہ آزادی کو اپنے بچپن ہی سے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی وہ جس آزادی کو قابل قبول وحصول خیال کرتے ہیں اُس کا لگاؤ محض جسمِ انسانی سے نہیں۔ وہ خارجی رسم و رواج اور بیرونی پابندیوں و ظاہرداریوں سے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اُس آزادی کے موید ہیں جس کا تعلق انسان کی روح سے ہے اور جو کفارہ

وایثار کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ بہر حال اُن کا سیاسیات سے علیحدہ رہنا اُن کی حب الوطنی کو مشتبہ نہیں بنا سکتا، کیونکہ وطن کی محبت اُن کے شاعرانہ دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بہر حال جس کام کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہے اُس کے پورا کرنے میں وہ تن من دھن سے لگے ہوئے ہیں۔ تاہم ملک کے اہم واقعات وحادثات سے موقعہ بموقعہ متاثر ہوتے رہتے ہیں مثلاً جلیانوالہ باغ کے واقعہ سے متاثر ہو کر اُنھوں نے گورنمنٹ کو اپنا سر کا خطاب واپس کر دیا تھا۔ اپنی اسی سالگرہ کی تقریب کے موقع پر اُنھوں نے یہ فرمایا کہ "سوراج نہ محض جھنڈا اُڑانے اور نہ مقررہ مقدار میں سوت کاتنے سے مل سکے گا، ملک کے لئے ٹھوس کام اور ہموطنوں کی واقعی خدمت کرنے سے آپ بیشک اسے حاصل کر لیں گے۔" اپنے خیالات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ٹیگور اسی خدمت اور اسی مشن کو انجام دے رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی طرح ٹیگور کو بھی اہنسا (عدم تشدد یا محبت) پر کامل اعتقاد ہے۔ اور بشو بھارتی کے تعلیمی پروگرام میں اہنسا پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے، اور طلبا کو بنی نوع انسان کے ساتھ محبت اور رواداری برتنے کی عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

اُن کی صورت وشباہت اور تندرستی بھی اُتنی ہی عمدہ و مؤثر ہے جتنی کہ ایک باقاعدہ اور باریاضت زندگی لبسر کرنیوالے بزرگ کی ہونی چاہیئے۔ چند سال ہوئے کہ کلکتہ کے مشہور انگریزی رسالہ ماڈرن ریویو کے نامور اڈیٹر شری جت رامانند چیٹر جی کو کچھ عرصہ کے لئے ٹیگور کے شانتی نکیتن کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اس کے متعلق صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ "اُس وقت اُن کی زندگی سخت محنت اور جفاکشی کی زندگی تھی، وہ صبح تڑکے ہی پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر اپنے کام میں لگ جاتے تھے اور دوپہر میں ذرا بھی آرام کئے بغیر کافی رات گئے تک کام کرتے رہتے تھے۔ شانتی نکیتن کی سخت گرمی میں بھی ان کو پنکھا جھلنے یا جھلانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اس طرح دن رات کی مصروفیت میں اگر کوئی وقفہ ہوتا تھا تو صرف اُن چند گھنٹوں کا جو نہانے، کھانے اور سونے میں لگ جاتے تھے۔" آگے چلکر اڈیٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "ضعیف العمری کے سبب اُن کے اطوارِ سابقہ میں تغیر ہو جانا ممکن ہے مگر اس وقت تو وہ کتنے ہی نوجوانوں سے زیادہ کام کرتے ہیں۔" دراصل اسی کام کرنے کی لگن میں اُن کی درازیِ عمر کا راز مستور ہے۔

ٹیگور بقول خود "شاعرانہ مذہب" کے پابند و پیرو ہیں۔ اس کی جامعیت کے بارہ میں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ اس کا پیرو ہونا بڑے بڑے شاعروں کو بھی نصیب نہیں ہے۔ ٹیگور کی عملی زندگی سے ان کے اس قول کی تصدیق ہو رہی ہے۔ وہ "کرم فلاسفی" کے قائل ہیں، وہ دنیا اور دنیا کے کاموں

سے الگ رہتے ہوئے نجات کے طالب نہیں ہیں، بلکہ دنیا میں رہکر دنیا والوں کو اپنی بے غرضانہ خدمات سے مستفید بنانا نجات کا بہتر وسیلہ خیال کرتے ہیں۔ خدا اُن کے اس ارادہ میں برکت دے اور اُسے پورا کرنے کے لئے اُنھیں زیادہ سے زیادہ موقع عطا کرے، یہی ہماری دعا ہے۔

ٹیگور نے اپنی ایک شہرہ آفاق نظم میں اپنی مشہور درس گاہ کا اس کے قیام سے پہلے اس طرح خاکہ کھینچا تھا:-

"ہماری درس گاہ شہر کے شور و غل سے بالکل الگ تھلگ ہوگی، وہ کھلے میدان میں درختوں کے سایہ میں قائم کی جائیگی، اساتذہ اور طلبا امن اور خموشی کی فضا میں درس و تدریس کے کام میں مشغول رہیں گے۔ اس درس گاہ کے متعلق بہت سے باغات اور کھیت بھی ہوں گے اور درس گاہ کے طلبا زراعت کے مختلف کاموں میں مصروف ہونگے۔ وہ مویشیوں کی داشت کریں گے اور اپنے ہاتھ سے گایوں اور بھینسوں کا دودھ دوہیں گے۔ اپنی فرصت کے اوقات میں وہ زمین کھودیں گے اپنے ہاتھ سے پودے لگائیں گے اور اُن کی آب پاشی کریں گے۔ سایہ دار درختوں کے نیچے طلبا کو تعلیم دی جائے گی، اور وہ اپنے اساتذہ کے ہمراہ ہرے بھرے کھیتوں میں چکر لگائیں گے اور اس طور پر قدرتی مناظر سے اُن کے نہ صرف خیالی بلکہ علمی تعلقات قائم کئے جائیں گے۔"

اس کے کئی سال بعد ڈاکٹر ٹیگور کو ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے واسطے کلکتہ سے شمال مغرب میں ۱۰۰ میل کے فاصلہ پر ریلوے اسٹیشن بول پور کے قریب ایک وسیع قطعہ زمین ملگیا جو زمانہ گذشتہ میں ایک ویران اور سنسان مقام تھا لیکن اب ساٹھ سال کے دوران میں یہ ایک زرخیز جگہ بن گئی ہے جس میں چاروں طرف لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، ہرے بھرے کھیت، باغات اور پھلواریاں ہیں اور گزشتہ تینس ۳۰ سال سے اُسی پر فضا مقام پر ہندوستان کے ہر گوشہ سے طلبا آتے ہیں اور ہر قسم کی تعلیم سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اور اسی مقام پر درس و تدریس کا سود مند کام مسلسل جاری ہے۔
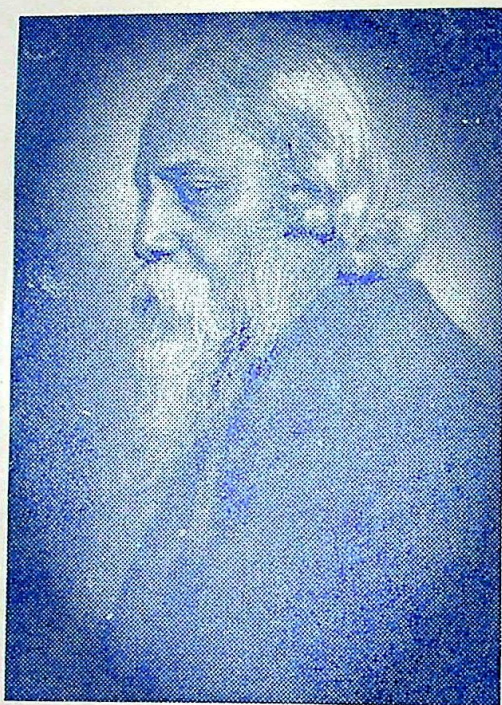
ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹگور

حاذق الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم

مولانا رومی کا نظریۂ ارتقا

از جناب سید حسن برنی، بی۔اے، ایل ایل۔بی (علیگ)

ایک زمانہ تھا کہ مشرق بھی دل و دماغ اور فکر و غور کی قوت رکھتا تھا، مثال کے طور پر مولٰنا جلال الدین رومی (متوفی ۶۷۲ھ ۱۲۷۳ء) کو پیش کیا جاسکتا ہے جو ایک بہترین صاحبِ فکر تھے۔ اور جن کی مثنوی افکار عالیہ سے بھری پڑی ہے اور عظمت کے لحاظ سے "پہلوی قرآن" کہلاتی ہے۔

انسان کیا ہے؟ کیسے وجود میں آیا؟ اور کیوں وجود میں آیا؟ ان دشوار سوالوں پر مولٰنا رومی نے غور کیا، اور اُن کے جواب اپنی مثنوی میں دیے ہیں جن کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے بلند نظر حکیم تھے۔

حکمائے حال کی طرح مولٰنا بھی یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ انسان کا ظہور بطریق ارتقا ہوا ہے، یعنی وہ زمانۂ دراز تک حیوانی نباتی اور جمادی درجوں میں ہوکر گزرا ہے ؎

آمدہ اول باقلیم جماد	از جمادی در نباتی او فتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد	وز جمادی یاد نارد از نبرد
وز نباتی چوں بہ حیواں او فتاد	ماندش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوے آں	خاصہ در وقتِ بہار ضمیراں
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت	تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

(اول انسان جمادات کی اقلیم میں آیا پھر جمادات سے نباتات میں آیا، سالہا اس اقلیم میں گزار دیے اور اپنی جمادی حالت بھول گیا۔ پھر جب نباتات سے حیوانات کی اقلیم میں آیا تو اُسے حالت نباتی کا کوئی خیال نہیں رہا، بجز اس کے کہ فصل بہار میں وہ اس کی طرف مائل ہوتا ہے، اس طرح وہ اقلیم باقلیم گردش کرتا ہوا اب عاقل و دانا و توانا ہوگیا ہے۔)

مولانا نے یہ خیال بھی پیش کیا ہے کہ انسان کا ارتقا ابھی ختم نہیں ہوا، اور اُسے ابھی اور بلند مدارج طے کرنے باقی ہیں۔ اس تصور میں ہمارے زمانے کے بہترین اہل خیال بھی اُنسے آگے نہیں جاسکے

عقلہائے اولینش یاد نیست ہم ازیں عقلش تحول کردنیست
تا رہد زیں عقل پر حرص و طلب صد ہزاراں عقل بیند بو العجب
گرچہ خفتہ گشت و ناسی شد زپیش کے گذارندش دراں نسیانِ خویش
باز ازاں خوابش بہ بیداری کشند کہ کند بر حالتِ خود ریشخند

(انسان کو اپنی ابتدائی عقلیں یاد نہیں ہیں، اور ہر عقل بھی بدل جائیگی۔ اس عقل پر حرص وطلب سے آزاد ہوکر وہ لاکھوں عجیب عقلیں دیکھے گا۔ اگرچہ آدمی سوتا رہا اور اپنی پہلی حالت کو بھولا ہوا ہے لیکن اُسے اس خود فراموشی کی حالت میں کب تک چھوڑا جائیگا؟ پھر سوتے سے جگا یا جائیگا اور وہ اپنے حالات پر ہنسے گا۔)

مستقبل کے اس امید افزا منظر میں مولانا نے ایک ایسا تصوّر پیش کیا ہے جب کہ انسان ذاتی خود غرضی سے آزاد ہوکر ترقی کے میدانوں میں آگے بڑھتا چلا جائیگا۔

(۳)

یہ ارتقائے انسانی کا صاف صاف بیان ہے جو مشرق کے اس بزرگ مفکّر نے اب سے چھ سات سو برس پہلے دنیا میں پیش کیا تھا اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ارتقا کا خیال مشرق کے لئے نیا ہے یا مشرق کی مذہبی ذہنیت پر بار گزر سکتا ہے۔

اُنیسویں صدی کے مادّہ دوست مفکرین عام طور سے اس کے منکر تھے کہ ارتقا کی کوئی غرض و غایت ہے، لیکن بعد کے بعض بہترین مفکرین ہم آہنگ ہیں کہ ارتقا کا ایک منشا ظاہر ہوتا ہے ورنہ اس کے کیا معنی ہیں کہ انسان جو اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے بہترین مخلوقات ثابت ہوتا ہے سب سے آخر میں ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا رومی کا خیال ہے کہ ابتدا ہی سے یہ منشا پیش نظر تھا اور نقش اول نقش ثانی کے لئے پیدا کیا گیا تھا ؎

نقش ظاہر بہرِ نقش غایب است واں برائے غایب دیگر بہ بست
ہمچو بازیہائے شطرنج اے پسر فائدہ ہر لعبت در ثانی نگر
لے نہادہ بہر آں لعبت نہاں واں برائے آں و آں بہر فلاں
اول از بہر دوم باشد چناں کہ شدن بر پایہائے نردباں

(موجودہ نقش آنے والے نقش کے لئے ہے، اور وہ دوسرے غیر موجود نقش کے لئے جس طرح کہ

شطرنج کی بازی کے پہلے داؤ کا فائدہ دوسرے داؤ میں ہوتا ہے یعنی اس کھیل میں یہ داؤ اُس داؤ کے لئے اور وہ داؤ دوسرے کے لئے چھپایا گیا ہے، جیسے کہ سیڑھیوں کے ڈنڈوں پر چڑھتے ہیں۔)

ارتقا کی غرض و غایت کیا تھی؟ اس کا جواب خود ارتقا کی تاریخ میں لکھا ہوا ہے ؎

تو ازاں روزے کہ درہست آمدی　آتشی یا خاک یا بادی بُدی

گر بداں حالت ترا بودے بقا　کے رسیدی مر ترا ایں ارتقا

(جس دن تو وجود میں آیا تو محض ایک آگ خاک اور باد کا مجموعہ تھا، اگر تو اس حالت میں ٹھیرا رہتا تو تجھے ارتقا کیونکر نصیب ہوتا۔)

از مبدّل ہستی اوّل نماند　ہستی دیگر بجائے او نشاند

ہمچنیں تا صد ہزاراں ہستہا　بعد یک دیگر دوم از ابتدا

(اگر تبدیل کرنے والے نے پہلی ہستی نہیں چھوڑی تو اُس کی جگہ دوسری ہستی بخشی، اس طرح لاکھوں ہستیاں یکے بعد دیگرے پہلے سے بہتر بخشتا چلا گیا۔)

(۳)

اس زندگی کا مآل کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ اور کس لئے ہے؟

ان سوالات کا جواب بھی سنیئے ؎

جاں چہ باشد باخبر از خیر و شر　شاد از احسان و گریاں از ضرر

چوں سر و ماہیت جاں مخبر است　ہر کہ او آگاہ تر باجاں تر است

اقتضائے جاں چو اے دل آگہیست　ہر کہ آگہ تر بود جانش قوی است

روح را تاثیر آگاہی بود　ہر کہ را ایں بیش اللّٰہی بود

جاں نباشد جز خبر در آزموں　پس کرا افزوں خبر جانش فزوں

جانِ ما از جانِ حیواں بیشتر　از چہ رو؟ زاں کو فزوں دارد خبر

(جان کیا ہے؟ ایک ایسی چیز جو نیک و بد سے باخبر ہے، احسان سے خوش اور نقصان سے ناراض ہے چونکہ جان کی ماہیت خبرداری ہے اس لئے جو زیادہ باخبر ہے وہ زیادہ بہتر جان رکھتا ہے۔ اے دل چونکہ اقتضائے جان آگاہی ہے اس لئے جو زیادہ آگاہ ہے اُس کی جان زیادہ قوی ہے۔ روح کی قوت خبرداری ہے جس میں یہ قوت زیادہ ہے، وہی خدا سے زیادہ قریب ہے، آزما دیکھو۔ جان صرف خبر کے لئے جیسے زیادہ خبر ہے اسی کی جان بھی زیادہ ہے۔ ہماری جان حیوان سے کیوں

برتر ہے؟ اسی لئے کہ وہ اس سے زیادہ باخبر ہے۔)

لیکن اگر تم اس روح کی حقیقت دریافت کرو تو وہ کسی کو معلوم نہیں، وہ گویا ایک پرندہ ہی جو ہوا میں اُڑتا ہے لیکن زمین پر صرف سایہ دکھائی دیتا ہے، جسم سایہ کے بھی سایہ کا سایہ ہے، روح خدا کے حکم کی طرح مخفی ہے۔ جو مثال بھی دی جائے وہ اس کی نفی ہے۔

در ہوائے غیب مرغے می پرد　　سایۂ او برزمیں می گسترد

جسم سایہ سایۂ سایہ دل است　　جسم کے اندر خور پایہ دل است

روح من ہمچوں امر ربی مختفی است　　ہر مثالے کہ بگویم منتفی است

البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس عالم مادی سے باہر ہے ؎

حاش للہ تو برونی زیں جہاں　　ہم بوقت زندگی ہم بعد آں

(واللہ تو اس جہان سے باہر ہے، زندگی میں بھی اور اس کے بعد بھی)

ہمارے زمانہ کا بڑے سے بڑا مفکر بھی اس سرِّ عظیم کے سامنے پیر رومی کی طرح حیران نظر آتا ہی اور اُسکی حقیقت کے بیان سے عاجز ہے۔

(۴)

عمل ارتقا کیونکر وقوع میں آیا؟

اُنیسویں صدی اور مابعد کے مفکرین نے انتخاب طبیعی اور توریث کے قوانین دریافت کر کے انھیں ارتقا کا موجب قرار دیا ہے۔ لیکن ارتقا کے جو اسباب بھی اب تک دریافت ہوئے ہیں وہ اُس کی توضیح کے لئے پورے نہیں اُترتے۔ اصلی دشواری تغیر و تبدل کے قوانین کا معلوم کرنا اور نفس انسانی کے ظہور میں آنے کے اسباب کا دریافت کرنا ہے۔ یعنی ان سوالوں کا اطمینان بخش جواب ڈھونڈھنا کہ انواع کیونکر بدل جاتے ہیں، اور انسان کی دماغی قوتیں کیونکر پیدا ہو گئیں۔

مولانا رومی نے ان سوالوں کے جواب میں طبیعی نظریے پیش نہیں کیئے البتہ اُسے خالق کی جو ہست سے نیست کرتا رہتا ہے ع

ہستی اندر نیستی بتواں نمود

قدرت سے منسوب کر کے چھوڑ دیا ہے۔

نیست را بنمود ہست آں مُحتشم　　ہست را بنمود بر شکل عدم

دست پنہاں و قلم بیں خط گذار　　اسپ در جولاں و ناپیدا سوار

(اُس بزرگ و برتر ہستی نے نیست کو ہست کیا، اور شکل غیر موجود سے ہستی موجود بنائی۔ ہاتھ چھپا ہوا ہے اور قلم حروف لکھتا دکھائی دیتا ہے۔ گھوڑا دوڑ رہا ہے اور سوار ناپیدا ہے)

باوجود بہت سی طبیعی توضیحات کے جب عقل سراسیمہ ہوکر رہ جاتی ہے تو کائنات کے تمام عقدہائے سربستہ کی طرح ارتقائے بشری کا بھی یہی اخیر حل نظر آتا ہے اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ ایک پوشیدہ ہاتھ پردہ کے پیچھے کام کرتا رہا ہے۔

خوش نصیبی

انسان اُس وقت خوش نصیب ہے جبکہ وہ اپنی خوش نصیبی کو پہچان لے۔

قلبی راحت کے برابر کوئی خوش نصیبی نہیں۔

حقیقی خوش نصیبی فضیلت علم ہے۔

صرف ایک خوش نصیبی ہے اور وہ ادائے فرض ہے۔

بہترین خوش نصیبی دوسروں کی امداد کرنا ہے۔

اگر تم خوش نصیب بننا چاہتے ہو تو دوسروں کی خوش نصیبی کے لئے کوشش کرو۔ کیونکہ وہ خوشی جو ہم دوسروں کو پہونچاتے ہیں ہمارے دل کی طرف پلٹ آتی ہے۔

ہر ایک شخص اُس خوش نصیبی کا مالک ہوتا ہے جسے وہ سمجھ سکتا ہے۔

روئے زمین پر ایک پاک اور زندہ جاوید عشق سے بلند تر کوئی خوش نصیبی متصور نہیں۔

خوش نصیب صرف وہ ہے جو کسی سے محبت کرتا ہے۔

خوش نصیبی یہ ہے کہ انسان دنیا کو اس طور سے دیکھے جس وجہ سے اس کی آرزو ہے۔

خوش نصیبی یہ ہے کہ انسان چھوٹی سی چھوٹی نعمت پر شکر کرے اور بڑی سے بڑی قربانی سے نہ گھبرائے۔

سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ انسان ایک مستقل ارادہ کے ساتھ فضیلت کے مطابق زندگی بسر کرے۔

دوسرے کے آنسوؤں کو مسرت بھری نگاہوں میں تبدیل کر دینا بہترین خوش نصیبی ہے۔

(ماخوذ)

مسیح الملک کے ساتھ ایک ہفتہ

(از ص - ا - ب)

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر کے صدر تھے۔ ابتدائے دسمبر میں جب مجھے تعطیلات کے زمانہ میں دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو اُس وقت حکیم صاحب نے میرے قدیم دوست بابو سردار بہادر صاحب کی سفارش پر مجھے طلب فرمایا اور اپنے ساتھ ریاست دوجانہ چلنے کا حکم دیا۔ یہ ریاست دہلی سے کوئی پچاس میل کے فاصلہ پر ہے اور اگرچہ غدر سے پیشتر وہ خاصی بڑی تھی، لیکن اب سمٹ سمٹا کر بہت چھوٹی رہ گئی ہے۔ حکیم صاحب کے سکرٹری مسٹر رزمی بھی جو آجکل اخبار نویسی کی تعلیم کے سلسلہ میں امریکہ میں مقیم ہیں، حکیم صاحب کے ہمراہ تھے۔ شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں صاحب (بمبئی) کے بھائی حکیم ذکی احمد صاحب بھی ساتھ تھے، لیکن ان کا کام فقط اُن طبی خطوط سے متعلق تھا جو بیرونی دنیا حکیم صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتی تھی۔ الغرض یہ مختصر سا قافلہ بذریعۂ موٹر دوجانہ روانہ ہوا جہاں ہمارا مجموعی قیام آٹھ روز رہا اور اس اثناء میں ہم سب نواب صاحب مرحوم کے مہمان رہے۔ اگر اس امر کا اعتراف نہ کیا جائے تو ناحق شناسی ہوگی کہ نواب صاحب مرحوم نے حکیم صاحب مرحوم اور اُن کے رفقا کی خاطر داری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اسی طرح ریاست کے دیوان خان بہادر بشیر محمد صاحب مرحوم بھی خاص طور سے حکیم صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کے آرام کا خیال رکھتے تھے، اور چونکہ خان بہادر موصوف میرے ہم جماعت اور محترم دوست تھے اس لئے مجھ پر وہ خصوصیت کے ساتھ مہربان تھے۔ اُن کا اخلاص مجھے آج تک یاد ہے۔

حکیم صاحب مرحوم کی ڈاک کا انتظام بہت اچھا تھا۔ انگریزی اور اردو کے اخبارات ہمیں روزانہ مل جاتے تھے۔ میرا کام فقط اتنا تھا کہ میں روزمرہ کی خبروں اور بعض اہم تقاریر یا مضامین کا ترجمہ انہیں سنا دیا کروں۔ چنانچہ علی الصباح ناشتہ کے بعد میں اس خدمت کو انجام دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد حکیم صاحب اپنا ایڈریس لکھنے بیٹھ جاتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ حکیم صاحب کو مضامین کا ترجمہ سننے کی فرصت نہیں ہوئی یا یہ کہ وہ نواب صاحب مرحوم سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے تو وقت کی بچت کے خیال سے

میں قابل توجہ مضامین کا خلاصہ اُردو میں تیار کر لیتا تھا تاکہ حکیم صاحب جب چاہیں بطور خود ملاحظہ فرمالیں، جہاں تک مجھے یاد ہے حکیم صاحب نے اپنا خطبہ صدارت پانچ چھ دن میں تیار کر لیا تھا۔ اڈریس میں خصوصیت کے ساتھ جنرل ڈائر پر نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی گئی تھی اور وہ حصہ اُنھوں نے ہم سب کو سنایا بھی تھا۔

حکیم صاحب کو ہمیشہ سے اس امر کا شوق تھا کہ وہ جس ریاست میں جاتے وہاں کی قدیم یادگار چیزیں دیکھتے۔ پرانی قلمی کتابیں ملاحظہ فرماتے، پُرانے شاہی فرامین پر نظر ڈالتے اور اسم سرکاری کاغذات کا بھی مطالعہ فرماتے چنانچہ دوجانہ پہنچنے پر جب انھیں ذرا سکون ملا تو نواب صاحب نے جو اُن کے مذاق سے کماحقہ، واقف تھے اُن کے ملاحظہ کے لئے ریاست کے گھوڑے پیش کئے۔ یہ گھوڑے خاص نواب صاحب کے اصطبل کے تھے اور نہایت بیش قیمت اور قد آور تھے۔ جنگِ عظیم میں نواب صاحب مرحوم نے سلطنت برطانیہ کی مقدور بھر امداد کی تھی اور سرکاری فوج کے استعمال کے لئے بہت سے نایاب گھوڑے بھی بہم پہونچائے تھے۔ ایک دو دن کے بعد نواب صاحب نے حکیم صاحب موصوف کو لارڈ کیننگ آنجہانی کی وہ سند بھی دکھائی جو غدر فرو ہوجانے کے بعد اُن کے بزرگوں کو عطا کی گئی تھی اور جس میں بصلۂ وفاداری وعدہ کیا گیا تھا کہ ریاست ابدالآباد تک نواب صاحب کے خاندان میں رہیگی۔ اُن دنوں نواب صاحب موصوف خانہ جنگی میں مبتلا تھے اور حکیم صاحب سے افسوس کے ساتھ فرماتے تھے کہ اب صرف یہی سند میرے پاس رہ گئی ہے، باقی تمام کاغذات دوسروں کے قبضہ میں چلے گئے ہیں

اسی قبیل کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے جسے خود حکیم صاحب نے دوجانہ کی کسی صحبت میں بیان فرمایا تھا، وہ فرماتے تھے کہ "جب میں پہلی دفعہ ریاست ٹیکم گڑھ میں بغرض علاج گیا تو اُس وقت وہاں کے راجہ صاحب نے نہایت فخر کے ساتھ مجھے وہ تلوار دکھائی جس سے ابو الفضل کو قتل کیا گیا تھا"۔ اس قتل کی تفصیل کے سلسلہ میں فرمایا کہ اکبر نے شہزادہ سلیم کی سرکشی کی خبر سنتے ہی ابو الفضل کو جو دکن کی مہم میں مشغول تھا جلد سے دارالحکومت میں طلب کیا تاکہ رزم و بزم کا مرد میدان آکر اپنے ناخنِ تدبیر سے اس گتھی کو بھی حل کردے۔ چونکہ ابو الفضل سے شہزادہ سلیم کے تعلقات پہلے ہی سے کشیدہ تھے اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ دارالخلافت میں ایسے قابل معتمد کی موجودگی اُس کی ساری خواہشات پر پانی پھیر دیگی، اس لئے اُس نے ٹیکم گڑھ کے راجہ سے خفیہ ساز باز کر کے وعدہ کیا کہ اگر تم ابو الفضل کو دارالخلافت پہنچنے سے پہلے ہی قتل کرادو تو تخت نشین ہونے پر میں تمہیں "سر آمد راجگان بندھیل کھنڈ" کے شاندار لقب سے سرفراز کردونگا۔ چنانچہ ابو الفضل کو نہایت بے رحمی کے ساتھ عین عالمِ تنہائی میں قتل کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اکبر نے جب یہ وحشت ناک خبر سُنی تو شدتِ حزن میں اُس نے کہا کہ اگر سلیم کو تخت کی ضرورت تھی تو اسے چاہیئے تھا کہ مجھے قتل کر دیتا، لیکن ابو الفضل کو نہ مارتا۔ بہرحال وہ تاریخی تلوار آج ٹیکم گڑھ میں محفوظ ہے اور اسے اس محبت اور وفاداری

کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے جو اُس دور کے راجہ کو سلطنت مغلیہ میں تھی۔" اس ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حکیم صاحب جب ریاستوں میں علاج کے لئے تشریف لے جاتے تھے تو وہ اپنے اوقات کا بہترین استعمال کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے قصے وہ بالعموم رات کا کھانا کھانے کے بعد سنایا کرتے تھے جو مرحوم کے غیر معمولی تاریخی ذوق کی زبردست شہادت ہیں۔

دو ہفتہ کے زمانہ قیام میں حکیم صاحب سے تفصیلی گفتگو صرف رات ہی کو ہوا کرتی تھی، چنانچہ دس ساڑھے دس بجے تک کا وقت اسی قسم کی دلچسپ گفتگو میں کٹ جاتا تھا۔ کبھی وہ طبیہ کالج کی تعمیر کے سلسلہ میں لارڈ ہارڈنگ کی مہربانیوں کا ذکر کرتے اور فرماتے کہ علم طب پر لارڈ موصوف کا بہت بڑا احسان ہے اس لئے کہ انھوں نے طبیہ کالج کو قرول باغ میں اتنی بڑی زمین محض برائے نام قیمت پر دلوادی میں نے جب اس اجمال کی تفصیل دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ "طبیہ کالج کی زمین کا مسئلہ مدتوں سے چیف کمشنر دہلی کے یہاں زیر غور تھا۔ یہ صاحب فی گز بہت زیادہ قیمت طلب کرتے تھے اور ہم برابر انکار پر انکار کرتے رہتے تھے۔ اس زمانہ میں دہلی میں لارڈ ہارڈنگ کے اعزاز میں ایک گارڈن پارٹی ہوئی۔ وہاں مہمانوں سے ملتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ میرے پاس بھی آنکلے اور باتوں باتوں میں پوچھا کہ زمین کا قصہ طے ہو گیا ہے یا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جتنی قیمت طلب کی جارہی ہے وہ ہماری بساط سے باہر ہے، ہمیں زمین اول تو مفت ملنی چاہیئے اور اگر قیمتاً ہی ملنی ہے تو قیمت برائے نام ہونی چاہیئے۔ چنانچہ لارڈ موصوف نے اُسی وقت چیف کمشنر دہلی سے بتاکید فرمایا کہ اس قضیہ کا فیصلہ جلد سے جلد حکیم صاحب کے منشا کے مطابق کردو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کا قصہ جو مدت سے زیر غور تھا نہایت آسانی کے ساتھ طے پا گیا اور جو قیمت طلب کی گئی وہ خود ہم سب کے اندازہ سے بھی کم نکلی۔" اس سلسلہ میں یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ لارڈ ہارڈنگ حکیم صاحب کی غیر معمولی عزت کیا کرتے تھے جو بہت کم ہندوستانیوں کو نصیب ہوئی ہوگی؛ اور وہ اپنے خاص دوستوں سے حکیم صاحب کا ذکر کرتے وقت ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ حکیم صاحب دہلی کے بے تاج بادشاہ ہیں۔

کبھی کبھی حکیم صاحب اپنی سیاحت انگلستان کے واقعات بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ سب باتیں تو مجھے یاد نہیں البتہ ایک بات ذہن میں محفوظ رہ گئی ہے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ باوجود حکومت ہند اور صاحب وزیر ہند کی سفارشوں کے انھیں انگلستان کے متعدد کارخانوں میں دوا سازی کے طریقے نہیں دکھائے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اسے اپنی تجارت کا راز قرار دیتے ہیں اور اس کے بتانے پر کسی طرح تیار نہیں ہوتے۔ یہ واقعہ ہے کہ حکیم صاحب اپنی سیاحت انگلستان کو کچھ زیادہ کامیاب

نہیں سمجھتے تھے۔ واپسی پر آپ قسطنطنیہ بھی تشریف لے گئے تھے، وہاں کا ایک واقعہ بھی حکیم صاحب نے سنایا تھا جسے میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ فرماتے تھے کہ جب میں قسطنطنیہ کے اسٹیشن سے روانہ ہوکر اپنی جائے قیام پر اُترا تو گاڑی والے نے مجھ سے میرے اندازہ سے کہیں زیادہ دام طلب کئے جس پر میں نے کہا کہ یہ کرایہ بہت زیادہ ہے۔ مَیں نے اتنے ملکوں کی سَیر کی ہے لیکن کہیں بھی اس قدر دام طلب نہیں کئے گئے۔ ابھی گاڑیبان سے گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک ہندوستانی طالب علم وہاں آنکلا اور یہ سمجھکر کہ میں ہندوستانی ہوں مجھ سے اُردو میں بات چیت شروع کردی۔ مَیں نے اُسے سارا قصّہ سُنادیا، اس پر لڑکے نے گاڑیبان سے (جو ابتداہی سے نہایت مہذبانہ گفتگو کررہا تھا) یہ کہا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں، یہ ٹرکی میں ہم تمام مسلمانوں کے محترم مہمان ہیں اور تمہیں ان سے مناسب کرایہ لینا چاہیئے۔ گاڑیبان نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو یہ میرے بھی مہمان ہیں اور میں اب ہرگز ہرگز کرایہ قبول نہیں کرسکتا۔ چنانچہ باوجود اصرار کے گاڑیبان نے ایک پیسہ تک نہیں لیا اور چلا گیا۔ جب تک حکیم صاحب قسطنطنیہ میں رہے یہ لڑکا ان کے بہت کام آیا۔ چلتے وقت حکیم صاحب کو خیال ہوا کہ مستورات کے لئے چند ترکی برقعے بھی تیار کرالیں، لیکن وقت اتنا نہ تھا اس لئے انھوں نے چند اشرفیاں اُس لڑکے کے حوالہ کیں اور فرمایا کہ اتنے برقعے سلواکر بھجوا دینا۔ دہلی آکر حکیم صاحب اشرفیوں کے واقعہ کو بالکل بھول گئے، لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کچھ عرصہ بعد اُن کے نام اُس لڑکے کا پارسل آگیا۔ حکیم صاحب لڑکے کی ایمانداری کی بہت تعریف فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ پر اس کی ایمانداری کا بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک اور بات بھی ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ لندن میں بعض ہندوستانی طلبا کی جو حرکتیں حکیم صاحب کے مشاہدہ میں آئیں اُن سے وہ بہت رنجیدہ ہوئے اُن کی دلی خواہش تھی کہ ہمارے لڑکوں کو بیرونی ممالک میں جاکر اعلیٰ درجہ کا اخلاقی معیار پیش کرنا چاہیئے اور کوئی حرکت ایسی نہ کرنی چاہیئے جس سے ہندوستان کے وقار کو صدمہ پہونچے۔

حکیم صاحب کی طبیعت میں ظرافت بھی بہت تھی، ایک دن فرمانے لگے کہ نواب صاحب دوجانہ اس بڑے کمرے کو جو موصوف نے اپنے محل میں تعمیر کرایا ہے "ٹاؤن ہال" کہا کرتے ہیں اور انفلوانزا کو جو اُن کے منہ سے صحیح نہیں نکلتا "انفلورانزا" کہتے ہیں، چنانچہ وعدہ کیا گیا کہ جب نواب صاحب سے ہم سب کی ملاقات ہوگی تو اُس وقت اُن کے منہ سے یہ الفاظ سننے کا شرف ہم کو بھی دیا جائیگا۔ ایک دن باتوں باتوں میں حکیم صاحب نے انفلوانزا کے تباہ کن اثرات کا ذکر کیا اور پوچھا کہ آپ کی ریاست میں کیا حال رہا۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ حکیم صاحب انفلورانزا نے تو غضب ہی ڈھا دیا، ہماری

ریاست میں روزانہ بیسیوں موتیں ہو جاتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی باتوں سے حکیم صاحب جب حد سے زیادہ لطف اندوز ہوتے تو اپنی دلی مسرت کا اظہار ہلکے سے تبسم سے ظاہر فرما دیا کرتے تھے۔ یہ تبسم ان کی ایک ممتاز خصوصیت تھی اور وہ درحقیقت مختلف جذبات کی ترجمان ہوا کرتی تھی۔

ریاست سے چلتے وقت مجھ سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس اسپیچ کا ترجمہ بھی تم کر دو۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ ترجمہ میں وہی ادبی شان قائم رکھنا چاہتے ہیں جو اُردو ایڈریس میں موجود ہے تو آپ یہ خدمت مسٹر آصف علی صاحب کو سپرد کیجئے جو انگریزی علم ادب کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں حکیم صاحب نے اتفاق فرمایا اور ترجمہ کی خدمت مجھ سے لے لی گئی۔

میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ کوئی نہ کوئی سند یافتہ حکیم ہمیشہ حکیم صاحب کی معیت میں رہا کرتے تھے، اُن بیشمار خطوط کا جواب دینے کے لئے جو باہر کی دنیا اُن کی خدمت میں طبّی مشورے اور علاج کی غرض سے بھیجا کرتی تھی۔ دوجانہ کے قیام کے دوران میں اس خدمت پر حکیم ذکی احمد صاحب فائز تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ روزانہ خطوط کا مطالعہ کرتے اور اگر شکایتیں معمولی ہوتیں تو خود نسخہ لکھکر جواب بھیج دیتے، لیکن اگر ذرا بھی پیچیدگی ہوتی تو وہ اُسے فوراً حکیم صاحب کی توجہ میں لاتے اور ان سے نسخہ معلوم کرکے اپنے ہاتھ سے لکھکر بھیجدیتے۔ ایک دن حکیم ذکی احمد ایک مریض کے حالات پر غور کر رہے تھے اور جب بعد غور وفکر کے بعد اُنھیں کوئی دوا سمجھ میں نہ آئی تو کہنے لگے کہ مرض بہت پیچیدہ ہے، اگر یہ دوا تجویز کرتا ہوں تو اس سے نئی پیچیدگی کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اگر فلاں دوا لکھتا ہوں تو مرض میں زور ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ الغرض وہ بہت دیر تک کشمکش و پیچ میں رہے اور جب خود کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو اُنھوں نے معاملہ حکیم صاحب مرحوم سے رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے سارے خط کو غور سے سُنا اور فی الفور دوا تجویز کر دی۔ میں نے دیکھا کہ صحیح دوا کا نام سنتے ہی حکیم ذکی احمد بہت بشاش ہو گئے اور بعد میں مجھ سے کہا کہ ایسی ہی دوا کی ضرورت تھی جو تمام شکایات کو کم کرے اور ساتھ ہی کوئی پیچیدگی بھی پیدا نہ ہونے دے۔ میں نے اپنے آٹھ دن کے قیام میں بار بار دیکھا کہ حکیم صاحب مریضوں کے خطوط کی جانب بہت متوجہ رہتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرحوم کو خدمت الناس کا شغف کس قدر زیادہ تھا۔ اسی سلسلہ میں میں ایک اور واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ دوجانہ کے قیام سے متعلق نہیں تاہم وہ قریب قریب اُسی زمانہ کا ہے اور اُس سے حکیم صاحب کے جذبۂ خدمت انسانی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ میری اہلیہ بیان کرتی ہیں کہ "شادی سے قبل میں اکثر بیمار رہا کرتی تھی، میں سمجھتی تھی کہ مجھے مرض دق ہو گیا ہے۔ چنانچہ میں نے حکیم صاحب سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس خیال

سے آگرہ سے دہلی آگئی۔ دہلی میں میں اپنی ہمشیرہ کے یہاں قیام پذیر رہی، وہاں سے میں نے بغیر کسی سے مشورہ کئے ایک خط حکیم صاحب کی خدمت میں بھیجدیا، چند دن کے بعد کیا دیکھتی ہوں کہ حکیم صاحب اپنی گاڑی میں تشریف لے آئے اور فرمایا میں اُس مریضہ کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں جس نے مجھے خط لکھا تھا۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ حکیم صاحب محض ایک خط کے لکھدینے پر تشریف لے آئیں گے۔ خیر ہم نے انھیں اندر بٹھایا اور نہایت اطمینان سے سارا حال سنایا، حکیم صاحب نے مجھے اچھی طرح سے دیکھا اور فرمایا کہ دق کا خیال ایک وہم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اور میرا ہر طرح سے اطمینان کر دیا۔ دہلی کے لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ حکیم صاحب نیز شریفی خاندان کے دیگر ارکان کی ہمیشہ سے یہ ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ وہ باہر سے آنے والے مریضوں کو اپنا مہمان سمجھتے ہیں، خود ان کے گھروں پر باقاعدہ تشریف لے جاتے ہیں اور کوئی فیس حتیٰ کہ گاڑی کا کرایہ تک بھی نہیں لیتے۔ حکیم صاحب کے لیٹر پیپر پر "افضل الاشغال خدمت الناس" کی مشہور حدیث نقش تھی۔ کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ ان کی زندگی جو در اصل ایثار اور قربانی کی زندگی تھی ہمیشہ اسی بلند مطمح نظر کے مطابق بسر نہیں ہوئی۔

دوجانہ کے قیام کے بعد میں متعدد مرتبہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آخری مرتبہ میں نے انھیں اُس وقت دیکھا تھا جبکہ وہ شاہ امان اللہ خاں کو ایڈریس دینے کے لئے بمبئی تشریف لائے تھے۔ اس وقت وہ بہت نحیف تھے۔ لیکن یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ وہ چند دن کے بعد ہم سے جُدا ہو جائیں گے۔ بہر حال یہ خطبہ خوانی غالباً اُن کی آخری پبلک خدمت تھی جو باری تعالیٰ نے اُن سے لی۔

یہ واقعات جو میں نے اوپر بیان کئے ہیں، معمولی ہیں اور اپنے اندر کوئی خاص جاذبیت یا اہمیت نہیں رکھتے، لیکن انسانی زندگی انھیں چھوٹے چھوٹے واقعات پر مشتمل ہوتی ہے اور انھیں سے ہمیشہ انسانی سیرت کی عظمت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ میں نے صرف انہی باتوں کو قلمبند کیا ہے جو سوائے ایک واقعہ کے براہ راست میرے مشاہدہ میں آئی ہیں۔

آخر میں خدائے برتر سے دعا ہے کہ وہ حکیم صاحب مرحوم کی خدمات کو جو انھوں نے بنی نوع انسان کے لئے انجام دیں قبول فرمائے اور مرحوم کو اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی درجات عطا فرمائے۔ آمین۔

بلبل ہند سروجنی نائیڈو کے چند نغمے

(مترجمہ مسٹر ظفر قریشی دہلوی بی۔اے)

(۱) ہندوستانی جلاہے

طلوعِ صبح کے وقت اے عزیز جلاہو! تم کیا بن رہے ہو
یہ نفیس اور خوبصورت کپڑا جس کا رنگ نیل کنٹھ کے پر کی طرح
آسمانی ہے، کیا ہے؟

یہ ایک نوزائیدہ بچہ کا جامہ ہے!

غروب آفتاب کے وقت اے عزیز جلاہو!
تم یہ کون کپڑا بُن رہے ہو؟
یہ چمکیلا کپڑا جو نرم اور پر طاؤس کی طرح سرخ و قرمزی رنگ کا ہے
تم کس لئے بن رہے ہو؟

ہم ایک عروس نو ملکہ حسن کے روے روشن کیلئے نقاب تیار کر رہے ہیں

اے عزیز جلاہو!
چاند کی خاموش سرد اور غم آگیں کرنوں کی پھیکی روشنی میں
تم مغموم و متفکر و سرنگوں بیٹھے ہوئے اس قدر سنجیدگی کے ساتھ یہ کون کپڑا بُن رہے ہو؟
یہ مرغ کے پر کی طرح نرم اور بادل کی طرح سفید رنگ کا کپڑا، کس لئے بنا رہے ہو؟

ہم ایک مردہ کا کفن تیار کر رہے ہیں!

(۲) نسترن

مست، تیز اور زود اثر خوشبودار،
لطیف و نازک اور چمکیلے پھولو!
تمہاری اُلجھی ہوئی پنکھڑیاں عطر و آتش کے گہوارے ہیں

ان پنکھڑیوں میں:-

سرسوتی کا غم نہاں ہے،
سیتا کی آرزوئیں وابستہ ہیں
درو پدی کے ارمان پوشیدہ ہیں
دمینتی کا خوف و ہراس موجود ہے اور
شکنتلا کے اشک ہائے خونیں ہیں۔

---

(۳) گل مہر

اے بہارِ رنگیں کے دلنواز محسن!
تیرے جمالِ زرّیں کو کون پا سکتا ہے!
تیرا رنگ یا تو عروسِ نو کے لباس کی طرح سرخ ہے
یا کسی طائرِ وحشی کے بازوؤں کے مانند شعلہ گوں
نہیں نہیں تو اس مَن کی طلسمی روشنی کی طرح ہے جو
"شیش ناگ" کی پیشانی کو منوّر کئے رہتی ہے!

اے بہارِ معطّر کے سرتاج! تیرا خیرہ کن جمال!
اور تیری عماز چمک اور لالہ گوں رنگت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟
تو کسی زرّیں صبح کے منوّر بادلوں کی خیرگی کے مشابہ ہے۔
یا سطحِ آب کی چادرِ سیمیں کا نور ہے!
یا اُس خون کی چمک ہے جو ایک راجپوت رانی[1] کی حفاظت میں
ہزاروں خوددار سینوں سے بہا تھا!

[1] راجپوت رانی سے مراد چتوڑ کی مشہور رانی پدمنی ہے جو ہندوستانی گیتوں کا ایک عام موضوع ہے۔

(۴) اشوک کا پھول

ہمارے ہندوستان میں ایک روایت مشہور ہے کہ اگر "اشوک" کی جڑ پر کسی خوبصورت دوشیزہ کا پیر پڑ جائے تو اس کی بند کلیاں پھول کر چٹک جاتی ہیں اور اس کی شاخوں میں گل ہائے نوز پھوٹنے لگتے ہیں !

آہ! یہ سرخ و زریں غنچے کبھی دوشیزہ کے بالوں میں آویزاں ہوتے ہیں
کبھی معشوقوں کے سیج پر پامال ہوتے ہیں
یا پھر "شاخ عروسی" بنکر اس کے دست حنا مالیدہ میں نظر آتے ہیں !

میرے محبوب !! اگر تیرا مبارک قدم میرے سینہ کو جس میں میرے عشق کے راز سربستہ بند ہیں ایک بار بھی پامال کردے تو میرا بخت خفتہ بیدار ہو جائے
میرے قلبی جذبات اور دماغی تصورات "گل نغمہ" کی صورت اختیار کرلیں۔
جس کی ترنم ریز و سیم بار پنکھڑیوں کا عسمی اثر ہر راہگیر کو از خود رفتہ بنادے

(۵) نغمۂ غم

اے پپیہے ! اب تو مجھے اپنی داستان محبت نہ سنا،
بلکہ ان گزشتہ خواب ہائے مسرت کی یاد میرے قلب مضطر میں پھر تازہ کردے
جن میں تاروں بھری رات اور صبح صادق کے وقت میرا دل وجان سے
چاہنے والا عاشق آہستہ آہستہ میرے پہلو میں آجاتا تھا

دریا پر ہلکے ہلکے بادل منڈلا رہے ہیں ——— تار باراں میں پکھراج کی طرح
چڑے ہوئے آم کے پتے ہوا میں جھول رہے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں
جنبش میں ہیں !
لیکن اے پپیہے ! باران رحمت اور ان تمام چیزوں کا حسن وجمال کس کام کا ہے؟
جبکہ میرا حبیب ہی مجھ سے جدا ہے، اور مجھے اُس کا دیدار پھر
نصیب نہیں ہو سکتا

اے پپیہے! "پی کہاں" کی صدائے پیہم سے تو میرے دل کو کیوں دکھاتا ہے،
اب تو مجھے اپنی داستانِ محبت نہ سُنا!
تو میرے دل میں ایام رفتہ کی یاد پیدا کر کے ایک ٹیس پیدا کر دیتا ہے
صبح کو میں تیرے منور جنگل میں طاؤس کو اپنے جوڑے کی فرقت میں بیقرار ہو کر چیختے چلاتے سنتا ہوں، میں کوئیل کی غم میں ڈوبی ہوئی کوک بھی سنتا ہوں،
چمن میں بلبل و قمری کا شیریں و دلنواز نغمہ بھی میرے گوش گزار ہوتا ہے۔
لیکن اے پپیہے! تو ہی بتا کہ مجھے ان سُریلے موسیقی کے راگوں سے کیا تسکین ہو سکتی ہے؟
سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ نغمہ ہائے محبت و مسرت بالکل پسند نہیں
کیونکہ میں ہجراں نصیب ہوں، اور میرا دوست مجھ سے دُور ہے ——
اور بہت ہی دُور ہے!

من کا مندر

پہاڑ نے تاڑ کے گنجان درختوں کا لباس پہن رکھا تھا، اُسکی کمر پر تاریک بادلوں کا پٹکہ تھا، لیکن مجھے وہ تنگ اور پیچدار راستہ مل گیا جو ہر تا پھرتا مندروں کو جاتا ہے۔ مندر کی قدیم عمارت میرے سامنے تھی اُسکا کلس آکاش کے دیوتا کی مانند خلا میں اکیلا کھڑا تھا۔ ہوا پجاریوں کے گانے کی مدھم آواز کو اڑا کر لا رہی تھی، گھنٹوں کے بجنے کی آواز صاف تھی، اور شور انگیز طوفان کی طرح پہاڑوں میں گونج رہی تھی
میری روح نے زنجیریں توڑ دیں، اب وہ کائنات کی رفعتوں میں پرواز کر رہی تھی۔
آہ تڑکا ہو گیا، میں نے چونک کر کہا میں ایک درخت سے سہارا لگائے کھڑا تھا، میرا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا، اب مجھے مندر میں جانے کی ضرورت نہ تھی، میرا مندر میرا دل تھا۔
(ماخذ از گجراتی)

جذبات ٹیگور

(از منشی اقبال بہادر سکسینہ صاحب ایم۔ اے)

گیتا کے مطابق وہ کام جو محض ذاتی نفع کی خاطر کئے جائیں روح کو جکڑنے کا باعث ہوتے ہیں، ذاتی قربانی کا وہی کام ہے جو ذاتی اغراض سے بالاتر ہو کر کیا جائے اور جس کا موضوع اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی نفع رسانی ہو۔ برہاجی جب اپنی ذات کو قربان کرتے ہیں تب ہی آفرینش کے موجب ہوتے ہیں۔ ان کی قربانی کی کوئی دوسری غرض نہیں ہے۔ اس لئے ہم اپنے فرائض کی ادائیگی میں جن میں ذاتی قربانی شامل ہو برہما کی اسپرٹ کا اعادہ کرتے ہیں۔

خوشی سچائی کا ایک جوہر ہے، جب ہم کو سچائی کا احساس ہوتا ہے تو ہمارے دل میں خوشی کی ایک لہر اُٹھتی ہے جو اس سچائی سے جو ہمارے دل میں ہے موجزن ہو جاتی ہے۔ یہی بات تمام مذاہب کی سچائی کی تہ میں ہے۔

وہ شخص جو سچائی کا احساس اس فوری خوشی سے کرتا ہے جو روح میں پیدا ہوتی ہے تمام شکوک اور خطروں سے بچ جاتا ہے۔

محبت وہ مقناطیس ہے جس کے مس سے انسانی طمع قربانی میں مبدل ہو جاتی ہے۔

صلح اس اندرونی سرور کا نام ہے جو سچائی میں مضمر ہے نہ کہ بیرونی تبدیلیوں میں۔

حسن بتلاتا ہے کہ حقیقت سے ہمارا روحانی رشتہ ہمیشہ کے لئے قائم ہے، اور ہماری محبت اس کو اپنے نصف النہار پر پہونچاتی ہے،

تہذیب وشائستگی اپنی آفرینش کے لئے آرٹ کی محتاج ہے، اس کی آفرینش محض اس لئے ہے کہ ہم روحانی کمال کے متعلق اپنے خیال کو چشم دید مناظر کا جامہ پہنائیں، اس کو مذہب کے آرٹ کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔

سچائی علم الٰہی کا بے پایاں مشغلہ ہے، جبکہ واقعی وہ بے پایاں شے ہے جس کا تعاقب سائینس کا شغل ہے اور حقیقت اس بے پایانی کی تعریف ہے جو سچائی اور ذات شخصی میں توازن قائم رکھتی ہے حقیقت انسانی ہی وہ شے ہے جس کا ہمارے ضمیر کو علم ہوتا ہے جس سے ہم متاثر ہوتے ہیں اور جس کا ہم اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جب ہم کو اس کا بدیہی علم ہوتا ہے تو ہم اپنے آپ سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور اس میں ہم کو خوشی محسوس ہوتی ہے، ہم اسی حقیقت میں رہتے ہیں اور ہمیشہ اس کی حدود کو وسعت دینے میں لگے رہتے ہیں۔ ہمارا آرٹ اور ہمارا لٹریچر ہماری اس تخلیقی کوششوں کا اظہار کرتا ہے جو انسان کے لئے لابدی ہے۔

اس زندگی میں یقین واثق ہی تخلیق کا کام کرتا ہے نہ کہ وہ مشین جو صناعی کرتا ہے۔ وہی طاقت جو اپنی قوت کو پس پشت رکھتی ہے، حسن کے پھول کھلاتی ہے نہ کہ وہ طاقت جو آستینیں چڑھاتی اور دوسروں کو نقصان پہونچانے کی استعداد پر بغلیں بجاتی ہے۔ ہم کو جاننا چاہیئے کہ مشین تب ہی تک اچھی ہے جب تک وہ دوسروں کی مدد کرتی ہے نہ کہ اس وقت جبکہ وہ زندگی کا کچومر نکال لیتی ہے۔ ہم کو جاننا چاہیئے کہ سائینس کی عظمت اسی وقت تک ہے جب وہ برائیوں کی بیخکنی کرتی ہے نہ کہ اس وقت جب دونوں ملکر ایک ناپاک شرک قائم کرتی ہیں۔

اگر میں اس سمت میں گامزن رہوں جس سے وہ آتا ہے تو میں اس سے دور ہی ہوتا جاؤں گا۔ اگر میں مقابل کے راستہ پر قدم زن ہوں تب ہی ہم صرف مل سکتے ہیں۔ اس کو شکل پیاری ہے، اسی لئے وہ ہمیشہ اشکال کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔ ہم صرف اشکال پر زندہ نہیں رہ سکتے اس لئے ہم کو غیر اشکالی کی طرف بڑھنا چاہیئے۔ وہ آزاد ہے اس لئے اس کا کھیل حدود کی طرف مائل ہوتا ہے، ہم محدود ہیں اس لئے ہم کو آزادی میں خوشی نصیب ہوتی ہے۔ ہماری تمام تکالیف کا سبب یہی ہے کہ ہم اس راز کو ذہن نشین نہیں کر سکتے۔ ایک گانے والا اپنی خوشی کو راگ کا جامہ پہناتا ہے، شخص جو راگ کو سنتا ہے راگ سے

خوشی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ پہلی حالت میں خوشی جو لامحدود ہے محدود راگ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ دوسری حالت میں محدود راگ ہم کو لامحدود خوشی کا تجربہ کراتا ہے۔ پہلی حالت میں آزادی غلامی کی حالت میں تبدیل ہوتی ہے اور دوسری میں غلامی آزادی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ صرف اسی طرح غلامی اور آزادی کا میل ممکن ہے۔ وہ گاتا ہے اور ہم سنتے ہیں، جب وہ گاتا ہے وہ محدودات کی زنجیریں مصنوع کرتا ہے۔ جب ہم اس کے راگ کو سنتے ہیں ان زنجیروں کی بندشوں کو فتح کرتے ہیں۔

(ٹیگور کی کتاب مذہب انسانی سے ماخوذ)

انتخاب آئین اکبری

از مولوی محمد رفیع صدیقی صاحب، کراؤن سائز ۸۰ صفحات قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ:- لالہ کامتا پرشاد اگروال پبلشر الہ آباد

آئین اکبری ابوالفضل کی مشہور تصنیف ہے جس میں شہنشاہ ہند اکبر اعظم کے عہد حکومت کے قوانین درج ہیں۔ مولوی رفیع صدیقی صاحب نے فارسی زبان کے طلبا کے استفادہ کے لئے اس کا ضروری انتخاب مرتب کیا ہے۔ شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے جس میں ابوالفضل کے مختصر حالات اور اس کی تصانیف کے ذکر کے علاوہ آئین اکبری کی خوبیوں اور ابوالفضل کی طرز نگارش پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں مشکل الفاظ و اصطلاحات کی تشریح کر دی ہے۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔

انتخاب قصائد سلمان ساوجی

از مولوی محمد رفیع صدیقی صاحب۔ کراؤن سائز ۴۰ صفحات قیمت ۵ر

ملنے کا پتہ:- لالہ کامتا پرشاد اگروال پبلشر الہ آباد

سلمان ساوجی فارسی زبان کا مشہور شاعر ہوا ہے۔ قدیم زمانہ میں عام دستور کے مطابق سلمان بھی شاہان وقت کے درباروں سے متوسل تھا اور ان کی مدح میں جو قصائد اس نے لکھے ہیں ان میں سے چودہ قصائد کا انتخاب اس مجموعہ میں شامل ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں سلمان کے حالات اور اس کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ غالباً طلبہ کے مطالعہ کے لئے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔

بدگمانی

(از مسٹر جے کرشن)

راج ناتھ نے ماں باپ کا سکھ نہ جانا، ایک سال کا تھا کہ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، جب پانچ سال کا ہوا باپ نے بھی داغ مفارقت دیا، چچی اور چچا ہی کو اُس نے اپنا والدین سمجھا۔ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اُنھوں نے بھی بیٹے ہی کی طرح اُس کی پرورش کی، وہ راج ناتھ کی آنکھوں کو نم نہ ہونے دیتے تھے، جس بات کے لئے وہ ضد کرتا وہ فوراً مہیا کر دیتے، جب کبھی وہ بیمار ہوتا اُس کی چچی رات رات بھر گود میں لئے بیٹھی رہتی، صبح و شام دونوں وقت نوکر گاڑی میں ہوا کھلانے لے جاتا، غرض اُس کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی۔ چچی اور چچا نے ہمیشہ اُس کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھا، ماں کا تو اُسے خیال ہی نہ تھا لیکن باپ کی وہ اکثر یاد کیا کرتا تھا لیکن لذیذ مٹھائیوں اور خوشنما کھلونوں نے رفتہ رفتہ باپ کا خیال بھی اُس کے ننھے دل سے مٹا دیا۔

جب رجو آٹھ نو سال کا ہوا تو اکثر عورتیں اس سے پوچھتیں 'رجو تیری اماں کہاں گئیں' رجو خفگی کے لہجے میں کہتا 'میری اماں گھر میں ہیں، بلا دوں'۔ بعض عورتیں جن کو خواہ مخواہ فضول باتوں میں لطف آتا ہے اکثر اس سے کہتیں "رجو یہ تیری چچی ہیں، تیری اماں تو مدت ہوئی مر گئیں"۔ اس پر رجو ناراض ہو کر کہتا "تم جھوٹ بولتی ہو یہی میری اماں ہیں"۔

(۲)

رجو اب اٹھارہ برس کا خوبصورت جوان ہوا، اُس کا رنگ شگفتہ اور جسم گٹھا ہوا تھا، اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں، چچی اور چچا دونوں اُسے آنکھ بھر کر نہ دیکھتے کہ کہیں اُسے اُن کی نظر بد نہ لگ جائے لیکن دل ہی دل میں اسے دیکھکر پھولے نہ سماتے تھے اس وقت وہ بی۔ اے فائنل کلاس میں پڑھتا تھا، اُس کے پروفیسر اس سے بہت خوش تھے۔ ٹینس کھیلنے میں تو اُسے ایسا کمال حاصل ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے کھلاڑی اُسے دیکھکر عش عش کرتے۔ اُسے رفاہ عام کے کاموں سے بھی غیر معمولی رغبت تھی، چنانچہ ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں وہ الہ آباد سے ملحق دیہاتوں میں جاکر غریب بیماروں کو دوا دیتا

اور اُن کی تیمارداری بھی کرتا۔ اکثر وہ نادار مریضوں کے سرہانے بیٹھکر آنکھوں ہی میں راتیں کاٹ دیتا۔ اُس کی چچی اُس سے کہا کرتی کہ بیٹا مریضوں سے دور ہی رہا کرو نہ معلوم کونسا مرض ہو کہیں نقصان نہ پہونچ جائے۔ مگر رجو ان باتوں کو ہنسکر ٹال دیا کرتا تھا۔

یونیورسٹی میں گرمی کی تعطیلیں شروع ہو گئی تھیں اور رجو اپنے مکان آیا تھا کہ ایک روز آگرے سے ایک رشتہ دار کا تار آیا کہ اُس کے ماموں کا انتقال ہو گیا۔ تار دیکھتے ہی رجّو اور اُس کے چچا بابو رام شنکر آگرہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ رجّو کے ماموں آگرہ کے مشہور وکیل تھے، اُن کا کنبہ بڑا تھا، بیوی کے علاوہ دو کنواری لڑکیاں اور تین چھوٹے بچے تھے۔ دونوں لڑکیوں کی عمر شادی کے قابل تھی۔ وکیل صاحب کے انتقال کے بعد کوئی اس کنبے کی پرورش کرنے والا نہیں رہا۔

کریا کرم ختم ہونے کے بعد ایک روز بابو رام شنکر نے رجّو کی مامی سے کہا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا، اب یہاں پڑے رہنے سے کیا فائدہ، سب لوگ ہمارے ساتھ چلی چلو، جو کچھ روکھا سوکھا پرماتما دے اُسے سب ملکر خوش ہو کر کھائیں گے، رجو کی مامی راضی ہو گئیں اور کیوں نہ ہوتیں ایک خدا کے سوائے دنیا میں اُن کا اور کوئی دوسرا سہارا نہ تھا۔ چنانچہ گھر کا سب سازو سامان فروخت کر دیا گیا۔ اچھی اچھی چیزیں نصف اور تہائی قیمت پر چلی گئیں اور بابو رام شنکر سب کو اپنے ساتھ مکان لے آئے اُن کا مکان بہت چھوٹا تھا اس میں اتنے لوگوں کا گذر ہونا مشکل تھا، اس لئے انھوں نے پڑوس کا ایک مکان کرایہ پر لیکر ان لوگوں کو اسی میں ٹھہرایا۔

بابو رام شنکر اور راج ناتھ نے اس کنبہ کی دلجوئی کرنا اپنا فرض سمجھ لیا تھا، دونوں ہمیشہ اسی کوشش میں رہتے تھے کہ چاہے کچھ ہو لیکن ان مصیبت زدوں کا دل دُکھنے نہ پائے، دونوں لڑکے مدرسہ میں داخل کرا دیے گئے اور رجّو اپنی فرصت کا زیادہ تر حصہ اپنی مامی کے یہاں گذارنے لگا، وہ ہر دم اسی کوشش میں رہتا تھا کہ کسی طرح ان لوگوں کا غم غلط ہو جائے۔

(۳)

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا، مامی کے اصرار سے رجّو اکثر وہیں کھانا کھا لیا کرتا تھا۔ برجو اور رمو (مامی کے دونوں لڑکے) کو پڑھاتا، اس کی دونوں بہنیں پشپا اور رکملا جب اُسے دادا کہہ کر پکارتیں تو وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا۔ اس کی مامی جب کبھی ان پر خفا ہوتیں تو رجّو ان کو سمجھاتا کہ آپ انھیں کچھ نہ کہیں، یہ سب مجھے بہت عزیز ہیں، اپنے جیتے جی میں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ اُٹھانے دونگا۔ یہ سنکر مامی کے پژمردہ چہرے پر خوشی کی جھلک نمودار ہو جاتی اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے

ٹپک پڑتے، وہ رجّو کو دعائیں دینے لگتیں۔

رجّو کا ہر وقت مامی ہی کے یہاں رہنا سہنا اُس کی چچی کو اچھا نہ لگتا تھا، چنانچہ کچھ دنوں تک تو وہ خاموش رہیں، لیکن ایک روز اُنھوں نے رجّو سے کہا کہ بیٹا تم تو اب گھر پر بالکل رہتے ہی نہیں ہو، نہ وقت سے کھاتے ہو نہ پیتے، نہ معلوم تم کو اِن دنوں کیا ہو گیا ہے؟ رجّو نے ہنسکر جواب دیا "واہ اماں کھاتا کیوں نہیں ہوں، آج ہی سویرے تمہارے سامنے کھانا کھا چکا ہوں"۔ اس پر چچی نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا اب کیا کھاتے ہو پہلے البتہ جب دیکھو یہی کہا کرتے تھے کہ بھوک لگی ہے۔ اب تو تیری بھوک پیاس سبھی رخصت ہو گئی ہے، ذرا صورت تو دیکھو کیسی نکل آئی ہے؟ رجّو نے پھر ہنسکر کہا "اماں میری صورت کو کیا ہو گیا ہے، جیسا تھا اُس سے کہیں زیادہ موٹا ہو گیا ہوں، رہی کھانے کی بات تو کبھی کبھی مامی کے یہاں بھی تو کھا لیتا ہوں، وہ بھی تو مجھے خوب کھلاتی ہیں"۔

چچی نے منہ پھیر کر اُسی طرح خشک لہجے میں کہا، ہاں تو یہ کہو کہ اب مامی کے یہاں کی سب چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں، اب تو وہی تمہاری سب کچھ ہیں، مَیں کون ہوں۔ یہ کہکر انھوں نے ایک آہ سرد بھری۔

رجّو کو اب ہوش آیا، وہ سمجھتا تھا کہ اماں یہ باتیں یوں ہی کہہ رہی ہیں، اُسے خیال بھی نہ تھا کہ انھیں اس کا مامی کے یہاں آنا جانا پسند نہیں ہے، اب تک اس کے برعکس وہ کہتا تھا کہ اماں اس سے خوش ہوتی ہونگی، ان کی زبان سے اب ایسی باتیں سنکر اُسے دلی صدمہ ہوا۔ اس نے غمگین لہجے میں کہا "اماں میرے لئے تو تمہیں سب کچھ ہو اس سے کون انکار کر سکتا ہے، مین تو مامی کے یہاں اس سبب سے چلا جاتا ہوں کہ ابھی ان کا غم تازہ ہے ان کی دلجوئی کرنا چاہیئے .... اسکے آگے اس کی زبان رقت سے بند ہو گئی، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، لیکن چچی کے دل پر ان آنسوؤں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا حالانکہ یہ آنسو بیچارے رجّو کی نیک نیتی خلوص اور محبت کے مظہر تھے۔

بہرحال اُس دن سے رجّو نے مامی کے مکان میں آنا جانا بہت کم کر دیا، وہ اپنی ماں کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مامی کے ساتھ بھی اپنی ہمدردی میں کمی نہ کرنا چاہتا تھا لیکن چچی کے دل میں ایک گانٹھ پڑ گئی، جس قدر رجّو اُسے سُلجھانے کی کوشش کرتا اُتنی ہی وہ اور مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ چچی اُس سے بولتیں لیکن باتوں میں اگلی محبت اور اگلا سا خلوص نہ تھا، ان کا لہجہ خشک تھا جس سے رجّو کے دل پر خواہ مخواہ چوٹ سی لگتی، اور وہ دل مسوس مسوس کر رہ جاتا۔ اس کی طبیعت

ہیں آتا کہ رو رو کر اپنی جان دے دے، جس کی گود میں پل کر وہ اتنا بڑا ہوا اسی کی زبان سے ایسی تلخ باتیں سنکر وہ تلملا اُٹھتا تھا۔ لیکن فرط غم سے اس کے آنسو نہ نکلتے، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون پہلو اختیار کرے کہ اس کی ماں اس سے پھر اگلی سی محبت سے پیش آنے لگے۔

(۴)

رجّو کئی دن تک مامی کے یہاں نہیں گیا، وہ گھر ہی پر رہتا اور کہیں نہ جاتا وہ ہر وقت خدا سے یہی دعا کرتا کہ ایشور مجھے ٹھیک راستہ بتلا کہ میں کیا کروں۔

ایک روز وہ اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں گیا، واپسی پر وہاں اُسے جو پان ملا۔ اس کے کھاتے ہی اُسے متلی ہونے لگی، شاید پان میں تمباکو پڑ گیا تھا، رجّو کا سر چکر انے لگا، مامی کا مکان بالکل قریب تھا وہ وہیں جاکر ایک چارپائی پر لیٹ رہا۔ اس کے بدن سے پسینہ نکلنے لگا، اور چہرہ سرخ ہوگیا۔ یہ دیکھکر مامی گھبرا گئیں، پشپا اور کملا پنکھا جھلنے لگیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد جب رجّو کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو پشپا نے ہنسکر کہا "دادا معلوم ہوتا ہے کہ آج تم نے بھنگ پی ہے، رجو نے جواب دیا نہیں بھنگ تو نہیں پی شاید پان میں تمباکو کھا گیا، اُسی وقت کملا بھی ہنستی ہوئی رمّو سے مخاطب ہو کر بولی "ارے رمّو جاکر بواجی سے کہہ آ کہ دادا نے آج بھنگ پی ہے اُنھیں نشہ چڑھ گیا ہے جس کے اُتارنے کے لئے دہی اور پیڑے بھیجدیں"۔ پشپا نے بھی اس بات کی تصدیق کی اور کہا "ہاں رمو دوڑ جا دیکھ آج تجھے دہی پیڑے کھانے کو ملیں گے، برجو تو بھی رمو کے ساتھ چلا جا"۔ غرض رمو اور برجو دونوں دوڑ گئے، رجو نے کہا "پشپا تم نے یہ بُرا کیا، اماں مجھ پر خواہ مخواہ ناراض ہونگی"۔ یہ کہتا ہوا وہ بھی لڑکوں کے پیچھے جانے کے لئے باہر نکلا مگر دروازے سے باہر نکلتے ہی اس کا ایک دوست کیلاش مل گیا، وہ بولا "واہ یار کب سے تمھیں تلاش کر رہا تھا، مگر کہیں تمہارا پتہ نہیں چلا، خیر چلو روپ چند کے کمرے میں کورٹ پیس ہو رہا ہے، تم کو بلانے آیا تھا"۔ رجو نے کہا "بھائی ذرا دیر کے لئے مجھے معاف کرو، میں ابھی آتا ہوں ذرا گھر جاکر ایک ضروری بات کہہ آؤں"۔ لیکن کیلاش نہ مانا، مسکرا کر بولا "اجی حضرت ابھی آپ کو گھر میں کون سی ایسی ضروری بات کہنا ہے، ابھی تو بیوی صاحبہ بھی تشریف نہیں لائی ہیں"۔ رجو نے بہت کچھ عذر معذرت کی لیکن کیلاش نہ مانا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ رجّو نے مایوسانہ نگاہوں سے کیلاش کی طرف دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر کوئی بھاری مصیبت آنیوالی ہے

(۵)

تاش کھیلتے کھیلتے شام ہوگئی، رجّو کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا۔ بہر حال چراغ جلنے کے وقت

جیسے ہی وہ مکان میں داخل ہوا چچی نے بگڑ کر کہا "اب تک تو کہاں رہا، اب تو تجھے بھنگ پینے کا بھی شوق پیدا ہو گیا ہے، آگے چلکر گانجہ چرس بھی پینے لگے گا"۔

رجو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، بولا "اماں تمھیں ناحق مجھ پر شبہ ہے، میں نے بھنگ نہیں پی"

"تو رمو اور برجو جھوٹ ہی کہتے تھے؟"

"پشپا اور کملا نے مذاق میں تم سے کہلا بھیجا تھا، میں گوپال چچا کے یہاں گیا تھا، وہاں پان شاید دھوکے سے تمباکو پڑ گیا تھا، کیونکہ اس کے کھاتے ہی میرے سر میں چکر آنے لگے، اور اندھیرا سا چھا گیا"، چچی نے اور تیز ہو کر کہا "جھوٹا کہیں کا مجھے بہلانے چلا ہے نشہ تو تیری آنکھوں سے ظاہر ہے، دیکھ آگے چلکر اور کیا کرتا ہے"۔

رجو ان باتوں کو نہ برداشت کر سکا، اس کے ساتھ سراسر بے انصافی ہو رہی تھی، اگر چچی اُسکی ایک گوشمالی بھی کر دیتیں تو شاید اُسے اتنا غم نہ ہوتا، اُس نے بھی ذرا تیز ہو کر کہا "اماں تم تو مجھ سے ناحق ناراض ہو رہی ہو، میں نے بھنگ نہیں پی ہے"۔

بھنگ نہیں پی تو مامی کے یہاں کیوں پڑا رہا گھر کیوں نہیں چلا آیا، کیا انھیں لوگوں نے تجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے؟ رمو کہتا تھا کہ سب تیرے ٹھکا جھل رہے ہیں اور تجھے ہوش نہیں آتا"، رجو کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ زمین پر گرنا چاہتا ہے، اُس نے پھر اُسی تیز لہجے میں جواب دیا "بالکل غلط ہے میں تو روپ چند کے کمرے میں تاش کھیل رہا تھا یقین نہ ہو کیلاش کو بلا کر دریافت کر لو" مگر چچی نے اس کی ایک نہ سُنی اور اُسی دھن میں جو کچھ دل میں آیا کہہ ڈالا۔ بابو رام شنکر مکان پر موجود نہ تھے ورنہ شاید اس قدر طوالت نہ ہوتی، پڑوس کی چند عورتیں جنھیں کسی مکان میں پھوٹ پیدا ہوتے دیکھکر خوشی ہوتی ہے کسی نہ کسی بہانہ پہونچیں۔ ایک اپنے چھوٹے بچے کی آنکھ میں انجن لگوانے کے بہانہ سے آگئی، دوسری کو خانہ داری کے متعلق کوئی ضروری مشورہ لینا تھا۔ ان میں سے ایک ذرا منہ بنا کر بولی "ٹھیک ہے بہن سیانی لڑکیوں کا لڑکوں سے ہنسنا بولنا اچھا نہیں ہوتا"۔ یہ سنکر رجو کے بدن میں اور بھی آگ لگ گئی اُس نے ایک طرف خشمگین نگاہوں سے دیکھکر کہا "تم چپ رہو تم سے کون صلاح پوچھتا ہے"۔ یہ سنکر دوسری عورت بولی "تم کیوں بولتی ہو تم کو کسی کے بیچ میں پڑنے کا کیا اختیار ہے"۔ رجو سمجھدار لڑکا تھا، دل میں سوچا کہ چاہے مجھ پر جتنی زیادتی کیوں نہ ہو ان کو خوش نہ ہونے دونگا۔ یہ سوچکر وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد چچی بھی چپ ہو رہیں۔ رات کو جب بابو رام شنکر مکان آئے تو رجو ان کے سامنے جاکر زار و قطار رونے لگا، رام شنکر نے تعجب سے کہا "میں رجو تم روتے کیوں ہو کیا بات ہے"، مگر رجو پہلے تو روتا ہی رہا

پھر جب اس کے آنسو تھمے تو اس نے کل قصہ کہہ سنایا، سب باتوں کو سنکر بابو رام شنکر نے کہا "تو اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات تھی"۔

رجّو نے جواب دیا "میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے بھنگ نہیں پی، پشپا اور کملا نے یوں ہی اماں سے کہلا بھیجا تھا کہ میں نے بھنگ پی ہے"۔

رجّو کے چچا نے مسکراتے ہوئے کہا "اچھا تو تمہاری اماں تم سے ناحق خفا ہوئیں"۔

رجّو سر نیچا کئے خاموش کھڑا رہا۔

ادھر رمو اور رجو نے جب کل قصہ اپنی ماں کو سنایا تو وہ لڑکیوں پر بہت خفا ہوئیں، پشپا اور کملا دونوں رونے لگیں اور تھوڑی دیر بعد معافی مانگنے کے لئے اپنی بوا کے یہاں آئیں، بوا کے پاس پہونچتے ہی دونوں پھر بلک بلک کر رونے لگیں۔

رجو کی چچی ابھی تک بالکل خاموش بیٹھی تھیں، انھیں روتے دیکھکر ان کا دل پگھل گیا، انھوں نے بظاہر بے رخی سے کہا "تم دونوں کیوں رو ہی رہی ہو میں نے تمھیں تو کوئی بات بھی نہیں کہی ہے"۔

کملا بولی "بواجی دادا نے بھنگ نہیں پی تھی میں نے جھوٹ موٹ آپ سے یہ کہلا بھیجا تھا آپ چاہے پشپا سے دریافت کریں"۔

پشپا نے سسکتے ہوئے کہا "ہاں بواجی دادا کا کوئی قصور نہ تھا، ہمیں نے جھوٹ بات آپ سے کہلا بھیجی آپ ہمیں جو سزا چاہیں دیجیے" یہ کہکر وہ پھر سسکنے لگی۔

بابو رام شنکر رجو کو ساتھ لیئے ہوئے کھانا کھانے اندر آرہے تھے، جب انھوں نے پشپا کو سسکتے سنا تو بولے "تم لوگ آج جھوٹ کیوں بولیں؟ بواجی اور دادا سے اس بات کی معافی مانگو"۔

چچی کا غصہ اتر چکا تھا، اب وہ دل ہی دل میں پچھتا رہی تھیں کہ انھوں نے بلا وجہ بچارے کو اس قدر سخت سست کہا، وہ پشپا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں "بیٹی تم کیوں روتی ہو، میں تم سے ناراض نہیں ہوں"۔

اتنے میں کملا بول اٹھی "اگر ناراض نہ ہوئیں تو دادا کو کیوں ڈانٹتیں"۔ یہ کہکر وہ سر نیچا کر کے زمین کی طرف تاکنے لگی۔

چچی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ڈانٹتی کیوں نہ تیرے جھوٹ بولنے کی سزا تجھے کیسے ملتی"۔

(۶)

بابو رام شنکر اور رجو دونوں کھانا کھاکر باہری کمرے میں سونے چلے گئے، پشپا اور کملا بھی مکان

چلی گئیں، رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن رجو کی آنکھوں میں نیند نہ آئی وہ سوچتا رہا کہ اماں کا دل میری طرف سے ابھی صاف نہیں ہوا، یہ خیال رہ رہ کر اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔

بارہ بجے کے قریب وہ اٹھا اور اپنی چچی کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ وہ ابھی تک جگ رہی تھیں، رجو نے غور سے دیکھا، ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ کچھ سوچ رہی تھیں رجو کے آنے کی انھیں خبر نہ ہوئی، مگر یکایک رجو نے پکارا "اماں" تو چچی نے چونک کر دیکھا کہ ان کے پاس رجو کھڑا ہے۔ وہ بھی بستر سے اٹھ بیٹھیں اور بولیں "بھیا رجو۔۔۔۔۔۔۔۔" اس کے آگے ان کی زبان بند ہو گئی مگر آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رجو بھی رونے لگا، چچی نے اس کو گلے سے لگا کر کہا "بھیا پچھلی باتوں کو بھول جاؤ"۔

رجو نے رقت آمیز لہجے میں کہا "اماں اب میرے مامی کے یہاں اٹھنے بیٹھنے کا برا نہ ماننا"۔

چچی نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا "بیٹا پہلے تیری اماں وہ ہیں بعد کو میں"۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک روحانی مسرت کا ظہور تھا۔

مصنفہ بخشی معتمد خاں، کراؤن سائز ۳۳۷ صفحات۔ مجلد قیمت عہ

اقبال نامہ جہانگیری

ملنے کا پتہ: رائے صاحب رام دیال اگروال پبلشر الہ آباد

یہ وہ مشہور و معروف کتاب ہے جس کو کپتان ولیم ناسولیس نے بعد تلاش حاصل کر کے ۱۸۶۵ء ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے شائع کیا تھا اور اب بعد صحت مولوی محمد رفیع صاحب نے مرتب کیا ہے۔

اس میں شہنشاہ جہانگیر کے زمانۂ حکومت کے خاص خاص تاریخی واقعات کے علاوہ حکما و شعرا وغیرہ کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ اس کے مصنف (معتمد خاں) جہانگیر کے بخشی تھے اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ ان کے چشم دید حالات ہیں۔

اس کی زبان فارسی ہے، سادہ و رواں، طرز تحریر دلچسپ ہے۔ فارسی زبان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔

تنقید

کلام حضرت اثر لکھنوی

(از سید محمد عسکری طبا طبائی۔ بی۔ اے)

اُردو کے موجودہ ادیبوں میں ایک طرف تو وہ حضرات ہیں جو مشرقی علوم سے واقف مگر علوم مغرب سے بے بہرہ ہیں۔ دوسری طرف وہ اصحاب ہیں جن کی نظریں مغربی علوم سے ایسی خیرہ ہوگئی ہیں کہ انھیں اپنے علم و ادب کی خوبیاں نظر ہی نہیں آتیں۔ پہلا طبقہ اگر ادب میں مزید خوبیوں کا باعث نہیں تو دوسرا اپنی تنگ نظری سے اُس کے لئے نقصان رساں ہے۔ بہر صورت وسط کا طبقہ بہترین ہے، اور اس میں وہ حضرات شامل ہیں جو علوم مشرق و مغرب دونوں سے آگاہی رکھتے ہیں، دراصل یہی حضرات ادب اردو کی صحیح خدمت انجام دے سکتے ہیں، جناب اثر لکھنوی انھیں چند مبارک افراد میں ہیں جنھوں نے مشرق و مغرب کے درمیان صحیح راہ معلوم کرلی ہے۔ اور استقلال کے ساتھ اسی پر گامزن ہیں۔ نہ صرف مشرقی ادب کی خوبیوں سے واقف ہیں بلکہ مغربی اصول تنقید سے بھی کماحقہ آگاہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی شاعری موجودہ زمانے میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

جو شاعری تصنع سے پاک ہوگی دل پر اثر انداز ہوگی، اثر کلام اثر کی جان ہے اور وہ اسم بامسمیٰ ہیں ان کے احساسات نازک اور جذبات لطیف ہیں، خیالات میں بلندی اور انداز بیان میں جوش و ندرت ہے طبیعت میں شوخی و بذلہ سنجی کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے۔ ملٹن کی بتائی ہوئی خصوصیتیں یعنی سادگی، جوش اور اصلیت اُن کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس وقت ان کی ایک غزل مشتے نمونہ از خروارے حاضر ہے جس سے معلوم ہوگا کہ اس فطری شاعر کے کلام میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔

یہاں پر میں یہ بھی عرض کردینا چاہتا ہوں کہ یہ غزل ان کی منتخب غزلوں میں نہیں اور نہ یہ اُن کی بہترین غزل ہے، میں اس پر خامہ فرسائی کے لئے محض اس طرح آمادہ ہوگیا ہوں جیسے کوئی خوشنما پھولوں کے گلدستے سے آنکھ بند کر کے ایک پھول توڑلے اور بعد میں اس کے رنگ و بو سے اپنے ذوق نظر اور

قوت شامہ کا صحیح اندازہ لگائیے۔

اب غزل ملاحظہ ہو:۔

کیوں کرے شکوۂ محرومیِ درماں کوئی دل برا ہوتا ہے تجھ سے غمِ جاناں کوئی

غمِ عشق میں شکوۂ تغافل آدابِ عشق کے خلاف ہی نہیں بلکہ دل برا ہونیکی بھی علامت ہے، اسی لیے پہلے مصرعہ میں ایک تغافل کیش کی طرفداری کی جارہی ہے، مصرعہ ثانی میں غمِ جاناں سے تخاطب ہے اور ایسے پیار کے لہجے میں کہ شعر سے مجموعی طور پر ایک طربناک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کہنے والے کی حقیقی خوشدلی پر دال ہے مگر اس کی تہ میں خود درد واثر اور سوز وگداز پوشیدہ ہے جس سے ذہن سامع پر برعکس اثر ہوتا ہے اور وہ عاشق کی اس خندہ پیشانی پر جس کے ساتھ وہ دردِ الفت اور محرومیِ درماں، بیک وقت برداشت کرتا ہے، دل میں ایک جذبۂ رحم وہمدردی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ محرومیِ درماں کا یہ عالم ہے کہ خود غمِ جاناں پشیمان ہے کہ میں نے اس غریب کو کیسی کیسی بلاؤں، مصیبتوں اور ایذاؤں کا نشانہ بنایا ہے اور یہ شکوہ بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا غم کی دلدہی کو کہتے ہیں "کیوں کرے شکوۂ محرومیِ درماں کوئی + دل برا ہوتا ہے تجھ سے غمِ جاناں کوئی"۔

لے لیا حسنِ فسوں ساز نے پیماں کوئی لو چلا شعلہ بدل جانبِ امکاں کوئی

روداد ازل کی طرف اشارہ ہے جب "الست بربکم" کے جواب میں "بلیٰ" کہا گیا تھا حسن اور حسن بھی فسوں ساز، آخر اس نے عشق سے پیمانِ وفا لے ہی لیا۔ اور عشق کی سادہ لوحی دیکھئے کہ اقرار وفا کرنے کو تو کر لیا لیکن انجام کو نہ سوچا جس کا ایک فوری نتیجہ یہ ہوا کہ دل کو ایک شعلہ سپرد کر دیا گیا (یہ آنیوالی مصیبتوں اور اضطراب کی نشانی تھی) اور پھر منزل امکاں کی راہ بتادی گئی جو خود بلاؤں کا پیش خیمہ ہے۔ دوسرے مصرعہ کا طرز ادا اور خصوصاً "لو" کا صرف ایسے محل پر ہوا ہے کہ آئندہ مصائب کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے۔ شاعر تو اتنا کہکر خاموش رہے کہ "لو چلا شعلہ بدل جانبِ امکاں کوئی"۔ مگر سننے والا خود بخود مطلب پورا کر لیتا ہے کہ اب خدا ہی خیر کرے دیکھئے کیا کیا مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔

بلاغت دیکھئے کہ شاعر نے پہلے مصرعے میں "پیمان" کی کوئی تشریح نہیں کی اور صرف اس کی نوعیت کی طرف دوسرے مصرعہ میں "شعلہ بدل" کہکر اشارہ کر دیا جس سے مطلب صاف ہوگیا۔ یعنی انسان کو آستانِ حسن سے التہاب واضطراب عشق عنایت ہوا اور وسعت گہ امکان کی رہ نوردی کا حکم ہو کر ارشاد ہوا کہ تیرے پیمانِ عشق ووفا کا امتحان ہے، پہلے اپنے کو درخورِ لطف وعطا ثابت کر پھر ہماری خلوت خاص میں باریاب ہوگا۔ مصرعہ اولیٰ میں لفظ "فسوں ساز" اور ثانی میں کلمۂ استعجاب واضطرار "لو"، ان تمام آلام وآفات اور

آزمائیشوں کی مجمل تاریخ میں جو انسان کو حیزِ امکان میں پیش آنیوالے تھے۔

جا رہا ہے طرفِ گورِ غریباں کوئی ... آج درپیش ہے پھر کارِ نمایاں کوئی

شعر کی تعریف یہ ہے کہ کانوں کے راستے سیدھا دل میں اتر جائے، سوچنے اور سمجھنے کی مہلت نہ دے اوپر کا مطلع ایسا ہی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ایک گہرا طنز پوشیدہ ہے۔ تخئیل کی کارفرمائی دیکھیے کہ اسی طنز سے معشوق کی مغرورانہ رفتار پیش نظر ہو جاتی ہے، یعنی جا تو رہے ہیں بیکسوں کی قبریں برباد کرنے اور چال ایسی پرتکبر ہے کہ گویا کوئی بڑا کام کرنے جا رہے ہیں۔ "پھر" کا لفظ بہت اہم ہے: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مرتبہ پیشتر بھی ایسے ہی مظالم ڈھائے جا چکے ہیں۔ گورِ غریباں بسانے والے اسی سراپا ناز کے کشتۂ ادا ہیں، زندگی میں ان غریبوں کو تباہ و برباد کیا اب ان کے نشاناتِ مزار بھی مٹا دیے جائیں گے۔ ایک کارِ نمایاں دہ تھا دوسرا یہ ہے۔

پہلے پیدا تو کرے دیدۂ حیراں کوئی ... مل ہی جائیگی رہِ منزلِ عرفاں کوئی

کس قدر بلند مطلع ہے، بیشک راہِ منزلِ عرفاں کا مل جانا آسان اور دیدۂ حیراں پیدا کرنا مشکل ہے۔ یہ حیرانی وہ نہیں ہے جو جہل سے پیدا ہوتی ہے (العلم حجاب اکبر) حقیقت یہ ہے کہ انسان جس قدر علم و عرفان کے منازل طے کرتا جاتا ہے اُس کا دماغ عاجز ہوتا جاتا ہے اور آخر ایک مدام حیرت و استعجاب کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ یہ وہی حیرانی ہے کہ طالبانِ حقیقت اگر اس وادی میں ثابت قدم رہیں تو منزلِ عرفان تک رسائی آسان ہوتی ہے، بلکہ یہی حیرانی عین معرفت ہے۔ حیرت ہی وہ رہبر ہے جس کی نظر سے حجاباتِ زمان و مکان اُٹھ جاتے ہیں اور جو برسوں کی راہ دم بھر میں طے کرتا ہے۔ دیدۂ حیراں تحقیقِ جادہ و منزل سے بھی بے نیاز ہے، جس طرف نظر اُٹھ گئی وہی جادہ راستہ ہے اور اُدھر ہی منزل بھی پیش نظر ہو گی۔

دوسرے مصرعہ میں لفظ "کوئی" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیدۂ حیراں پیدا کرنے کے بعد یہ پابندی نہیں رہتی کہ کسی خاص راہ سے منزل کی طرف قدم اُٹھے، ہر شے منزلِ مقصود کا جادہ بن جاتی ہے۔ پھول کی ایک پنکھڑی نگہت آوارہ کا ایک جھونکا، ایک ذرہ، ایک قطرہ سب منزل تک پہونچا دیتے ہیں۔ ہاں شرط یہ ہے کہ "دیدۂ حیراں" کی نعمت مل چکی ہو۔ یعنی غور و فکر اور نفسیاتی تحلیل کے بجائے دل کی حساس بیاض کو سادہ چھوڑ دینے کا ملکہ حاصل ہو چکا ہو تا کہ نقوشِ فطرت و حقیقت از خود مرتسم ہو کر اپنے اسرار ظاہر کریں۔ جب عقل و شعور کی دراندازی و رنگ آمیزی نہ ہو گی تو نقوش خالص اور فطرت کے ترجمان ہونگے یہی وہ نکتے ہیں جن تک عام شعرا کی نظریں نہیں پہونچتیں۔ الہٰیات کے ان گہرے مسائل پر اس قدر

نیز روشنی ڈالنا حضرت اثر ہی کا کام تھا۔

جوش زن خوں ہے کہ نغموں کا ہے طوفاں کوئی — اس طرح چھیڑ گیا تارِ رگِ جاں کوئی

معاذ اللہ، مطلع ہے یا ایک نغمہ نار کہ جس میں احساسات گم ہوئے جاتے ہیں، اگر دل پوری طرح متاثر ہو جائے تو تخئیل میں شور برپا ہو جاتا ہے۔ اور دماغ میں تاروں کی سی جھنکار پیدا ہونے لگتی ہے۔ مطلب سمجھنے اور لکھنے کا کسے یارا ہے۔

شاعری کا اعلیٰ کمال یہ ہے کہ شعر کہتے وقت جو کیفیت شاعر کے دل پر طاری ہوئی تھی وہی شعر سنتے وقت سامع کے دل پر طاری ہو جائے۔ اس مطلع کو بار بار ٹھہر ٹھہر کر پڑھیئے، دیکھیئے بربطِ جاں سے نغمے پھوٹ نکلتے ہیں یا نہیں

اپنی ہی بزم تمنا ہیں نہیں بار مجھے — خانۂ دل میں ہے اس شان سے مہماں کوئی

خانۂ دل میں کسی کے مہمان ہونے کا تقاضا یہی تھا کہ عاشق آپ سے بیگانہ ہو جائے، قسمت کی نیرنگی دیکھیئے کہ جب معشوق کا قرب نصیب ہوا تو عاشق اپنے آپ کو بھول گیا، اس کو عشق کی غیرت کہا جائے یا حسن کی شان بے نیازی کہ محفلِ یار میں خیالِ غیر تو کجا خود عاشق کو بھی باریابی حاصل نہیں۔

مجھ کو بھولے ہوئے اربابِ وطن یاد آئے — یوں ستاتا نہیں اے شامِ غریباں کوئی

شعر ہے یا ایک نشتر کہ دل میں چبھتا چلا جاتا ہے۔ مضمون فرسودہ تھا مگر حقیقی شاعر اثر کیلئے کوئی بات کھدے اور ضائع جائے یہ ناممکن ہے۔ "یوں" کے استعمال میں جو قوت صرف ہوئی ہے اس کی پناہ نہیں۔ اگر "ستانے" کی حدیں علیحدہ علیحدہ بیان کی جاتیں تو یہ اثر نہ پیدا ہوتا۔

اشکِ خوں زیبِ مژہ رہنے دے اے دیدۂ تر — اپنے ہاتھوں سے لٹاتا ہے گلستاں کوئی

شعر صاف ہے مگر اثر سے خالی نہیں، دوسرے مصرعہ کی زبان دیکھیئے، الفاظ میں شہد ملا دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دانتوں میں انگلی دبائے کہہ رہا ہے "اپنے ہاتھوں سے لٹاتا ہے گلستاں کوئی"۔
"زیبِ مژہ" سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خانۂ چشم کی تمامتر زینت کا انحصار اشکِ خوں ہی پر ہے

ذرے ذرے سے ہے آہنگِ انا البرق بلند — وادیٔ شوق سے گذرا ہے غزلخواں کوئی

اس شعر میں اثر مابعد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کوئی مستانہ وار نغمہ فشاں وادی سے گذر گیا اور اب یہ عالم ہے کہ ذرے ذرے سے شور انا البرق نہیں "آہنگِ انا البرق" بلند ہے۔ ہائے کیا لفظ رکھا ہے کہ کانوں میں نغموں کی صدا آنے لگتی ہے۔ ایک طرف تو کسی کی غزلخوانی نے ذرے ذرے کو مطرب خوشنوا بنا دیا دوسری طرف اسی کے شوقِ فراواں اور گرمیٔ رفتار نے ان کے پیکر میں بجلیاں بھر دیں اب وادیٔ

شوق کیا ہے ایک دنیائے نغمہ و نور ہے کہ مجسّم پیشِ نظر ہے۔

قطرہ ہے موج بدل، موج ہے طوفاں بکنار بحرِ ہستی کے نہیں جوش کا پایاں کوئی

زندگی کو بحر بتایا اور وہ بحر جس کا قطرہ قطرہ موج بردوش اور ہر موج طوفان در آغوش ہے، یہ فلسفۂ ارتقا ہے جو خاص شاعرانہ انداز میں نظم ہوا ہے۔ برگسان مشہور عالم جرمن فلسفی لکھتا ہے کہ "حیات جو عالم میں جاری و ساری ہے بالذات آمادۂ ارتقا ہے، دنیا برابر تکمیل پا رہی ہے" یہی نقطہ حضرت اثر کے پیش نظر تھا قطرے اپنے دامن میں موجیں چھپائے ہوئے ہیں اور موجیں طوفانوں کی پرورش کر رہی ہیں، ہر شئے مائل بہ ترقی ہے۔ خدا جانے حیات کن کن صورتوں میں ظہور پذیر ہوگی اور دنیا ابھی کیا سے کیا ہو جائیگی۔

فلسفیانہ مضامین کے نظم کرنے میں شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ مضمون سے فلسفے کی خشکی دور کرے اور اس کے نظم کرنے میں شاعری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ حضرت اثر کے شعر میں اس خوبی کا اندازہ لگائیے، وہی دلآویز استعارے ہیں وہی دلفریب ترکیبیں اور وہی مخصوص زور بیان جو شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

گلِ نظارہ سے آغوشِ تماشا بھر لے دیکھتا ہے تجھے لے دیدۂ حیراں کوئی

کسی کا دیدۂ حیراں ہے کہ بے خبر کسی دوسرے عالم میں ہے اور کوئی دیدۂ حیراں کی بہار دیکھ رہا ہے کس قدر لطیف منظر ہے، اس موقع پر دیدۂ حیراں کو یہ تاکید کہ ایسے میں جلوۂ حسن عام ہے، جی بھر کے بہاریں لوٹ لے کیا مزہ دے رہی ہے حقیقت میں یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ "نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد" نہ کہ چشم تماشا خود حیرت فروش بنجائے اور نظارہ سے یکسر محروم رہے۔

"گلِ نظارہ" "آغوشِ تماشا" اور "دیدۂ حیراں" کتنی شگفتہ ترکیبیں ہیں، ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک شعر ہے۔

مدعا پوچھنے والے تری باتوں کے نثار اب وہ عالم ہے کہ حسرت ہے نہ ارماں کوئی

کیا کہنا، عشق کی ادا شناسی کا تقاضا یہی تھا۔ جناب اثر زبان کے تو مالک ہی ہیں اگر مضمون بھی لطیف ہو تو نورٌ علیٰ نور کیوں نہ ہو جائے۔ بس پڑھیئے اور لطف اُٹھایئے۔

پھر تڑپتے ہوئے دل ٹھہرے، ٹھہر کر تڑپے پھر ہوا نازسے برہم زنِ مژگاں کوئی

کتنی دلکش تصویر ہے "برہم زنِ مژگاں" ہونے سے مراد آنکھوں کی وہ خواب آلود کیفیت ہے جس میں پلکیں بار بار بے اختیار جھک جاتی ہیں۔ اگر نازِ حسن سے یہ کیفیت پیدا کی جائے تو اس کی دلفریبی کا کیا عالم ہو گا۔ اس ادا کے دیکھنے والے پر جو اثر مترتب ہو سکتا ہے اُس کے اظہار کے لئے ایک شاعر

کوشاید ہی اس سے بہتر اسلوبِ بیان مل سکتا ہو جو حضرت اثر نے پہلے مصرعہ میں اختیار کیا ہے۔ جبتک تیغ نگاہ کے بھرپور وار ہو رہے تھے، دل مستقل طور سے تڑپ رہے تھے۔ اُدھر مژگان کی صفحوں میں برہمی پیدا ہوئی اور ادھر دلوں کی حرکت ایک لمحے کے لئے رک گئی سکتہ سا ہو گیا، پھر پلکیں سیدھی ہوئیں اور پھر رقص بسمل ہونے لگا۔ "برہم زنِ مژگاں" جناب اثر کی مخصوص ترکیبوں میں سے ہے۔ ایک جگہ اور کہا ہے

نیند کے حیلے سے وہ برہم زنِ مژگاں ہوا — ہمنشیں اب ہم یونہی ترسا کرینگے خواب کو

قیدِ امکاں سے بھی دیوانوں کی وحشت نہ گئی — اور تعمیر ہوا ان کے لئے زنداں کوئی

کس قدر بلند مضمون ہے اور کتنی بیساختگی کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ یہ شعر یوں کہنا چاہیئے کہ اس خیال کے اثرات مابعد ہیں جو اس مطلع میں نظم ہوا ہے ؎

لے لیا حسن فسوں ساز نے پیماں کوئی — لو چلا شعلہ بدل جانبِ امکاں کوئی

عالمِ امکاں کو زنداں قرار دیا ہے کیونکہ مختلف قیود عائد ہیں۔ حسن فسوں ساز نے انسان کو اپنا عشق دیکر یہاں اس لئے بھیجا کہ امکان یا مجاز کی دلکشی و دلفریبی میں اُلجھ کر فرمانِ "اہبطوا" کا حقیقی منشاء فراموش کر دے اور آستانِ حسن سے نیازمندی کا پیمان، وقت آزمایش غلط ثابت ہو، حسن ہنگامہ زا کی یہ ایک ادنیٰ شوخی ہے۔ دیوانگانِ عشق آئے اور مجاز کو حقیقت کا پرتو سمجھنے لگے۔ ہر شے میں اسی نگاہ فتنہ زا کو کارفرما دیکھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ کبھی علانیہ اور کبھی چپکے سے کہتے ہیں کہ "حضور آپ کا منصوبہ پورا نہیں ہوا" لہذا اب کوئی اور زنداں اس زندانِ امکان سے الگ تعمیر ہو۔ گویا در پردہ یہ التجا ہے کہ اِن دیوانوں کو دوبارہ حریم ناز میں باریابی کا حکم ہو ورنہ فتنہ و شر، شور و فساد فرو ہوتے نظر نہیں آتے، اس التجا نے حسن فسوں ساز کی بات بھی رکھ لی۔

شعر کی بنیاد وہی عظیم الشان مسئلہ ہے کہ حسن و عشق ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

ہوش رہتا ہے بس اتنا دمِ تحریکِ جنوں — جیسے چھینے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

عجیب و غریب شعر ہے، جوشِ وحشت اور فراوانیِ جنوں کی ترجمانی کے لئے اردو زبان میں شاید ہی اس سے بہتر کوئی پیرایۂ بیان وضع کیا گیا ہو۔ شعر میں اس عالم کی مصوری کی گئی ہے جس میں جنون اس نقطے پر پہونچ جاتا ہے کہ دیوانہ خود اپنی وحشت کا پردہ چاک کرنے لگتا ہے اور اُسے اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہ کس کا فعل ہے، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی دوسرا ایسا کر رہا ہے۔ شعر کی لطافت کا راز اسی نکتے میں پوشیدہ ہے کہ جو بات ہوش کی علامت بتائی گئی ہے وہ خود بے ہوشی کی دلیل ہے جس کو ہوش کے عالم میں یہ محسوس ہوتا ہو کہ جیسے کوئی گریباں چھینے لئے جاتا ہے اُس کی بیہوشی

کا کیا ٹھکانا ہوگا، پھر بڑھتی ہوئی وحشت سے جو خلش سی دل میں پیدا ہوئی اسے ہوش سے تعبیر کر دینا حضرت اثرؔ ہی کا کام تھا۔ احساسات کی یہ نزاکت ایک فطری شاعر ہی میں پائی جا سکتی ہے۔ دیکھئے گریبان کا مضمون اردو شاعری میں کس قدر پامال ہے لیکن جو شعر التقلید سے بیگانہ ہیں وہ ہر جگہ تازگی وجدت پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ جدت ادا ہی کا افسوں ہے جس نے اس پیکر مردہ میں از سر نو روح پھونکدی۔ شعر میں "تحریک جنوں" کا لفظ خاص ہے۔ اس سے وہ کیفیت پیش نظر ہو جاتی ہے جب طبیعت قابو سے باہر ہو جائے اور ہاتھ بلا ارادہ گریبان کی طرف بڑھنے لگے۔ خود لفظ تحریک میں یہ جادو موجود ہے۔ تحریک اور گریبان چھیننے میں، جو معنوی ربط ہے وہ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ذرا اور گہری نظر سے دیکھئے تو اس لفظ کی کارفرمائیاں معلوم ہوں، گویا جنون ایک ساکت سمندر ہے جس نے یکایک سانس لی کروٹ بدلی اور جزر و مد پیدا ہو گیا، اب جوش جنوں کا یہ عالم ہے کہ خود ہی اپنا گریبان چاک کرتے ہیں اور دھوکا یہ ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص ہمارا گریبان چھیننے لئے جاتا ہے اور ہم اس کا ہاتھ پکڑ رہے ہیں یعنی اس کو اس فعل سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔

دیکھئے تو انداز بیان نے فنا کا کیسا رتبہ دکھایا ہے۔ خودی نہیں بلکہ احساس خودی فنا ہو رہا ہے، مگر ہنگام فنا بھی خودی اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتی ہے۔ یہ معمولی خودی نہیں ہے جو مائل بہ فنا ہے بلکہ اس میں جذبۂ خودداری بھی شامل ہے، ایسی خودی کو بھی نذر فنا کر دینا جس قدر مشکل اتنا ہی بصیرت افروز ہے۔ لفظ "جیسے" میں یہ نکتہ ہے کہ بیان واقعہ سے کیفیت قلب کی طرف اشارہ ہوتا ہے، دل پر ویسی ہی حیرت و وحشت طاری ہے جو اس وقت طاری ہوتی جب کوئی دوسرا شخص گریبان چاک کرتا۔ یہ نفسیات کے کیسے باریک مسائل ہیں اور فطرت کے کس قدر نازک پہلو۔ یہ مصور کا کام نہیں کہ وہ پردۂ تصویر پر ان لطیف جذبات و احساسات کی ترجمانی کر سکے۔ یہ شاعر ہی کا کمال ہے کہ وہ قلب انسانی کی عمیق ترین گہرائیوں سے ان سربستہ رازوں کو معلوم کرے اور اپنے اشعار میں ان کا حل پیش کرے۔

کارفرما وہ نگاہ غلط انداز نہیں   آہ کیونکر ہو حریف غم پنہاں کوئی

معشوق کی نگاہ غلط انداز کے ٹھوکوں سے عاشق کے دل میں ہر گھڑی غم عشق برداشت کرنے کی تازہ جرأت پیدا ہوتے رہنا کس قدر نازک بات تھی۔ ایک باریک بیں شاعر نے اس کی گرفت کر لی اور کس اثر آفرینی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ مطلب یہ ہے کہ دل غم الفت اٹھانے کے لئے محبوب کے ذرا سے التفات کا سہارا ڈھونڈتا تھا۔ چاہے وہ نگاہ غلط انداز ہی کی صورت میں کیوں نہ ہوتا۔ اب اتنا سہارا بھی نہیں تو دل ہمت ہارے دیتا ہے اور عاشق ہے کہ بیتاب ہوا جاتا ہے

وہ چاہتا ہے کہ کوئی تو ایسی سبیل نکلے کہ یہ دولت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

شعر میں کس قیامت کا اثر ہے، معلوم ہوتا ہے کوئی تڑپ رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

کار فرما وہ نگاہ غلط انداز نہیں　　آہ کیونکر ہو حریفِ غمِ پنہاں کوئی

یہ بات "آہ" کے صرف سے پیدا ہوئی۔

عدل کے بدلے طلب ہوتی ہے میزانِ کرم　　پیش کرنیکو ہے بے برگیِ عصیاں کوئی

میزانِ عدل میں دو پلّے ہونگے، ایک طرف اعمال نیک رکھے جائیں گے، دوسری طرف افعال بد۔ یہاں اعمال نیک کا تو پتہ ہی نہیں (بے برگی عصیاں سے اشارہ ہے) پھر میزانِ کرم کیوں نہ طلب ہو جو اس مقدار غیرِ مثبت کا وزن بھی کر سکے۔

طبعِ آثر نے رحمت و عصیاں کے جادے میں بھی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ اگر اس عنوان کے ماتحت اُن کے منتخب اشعار جمع کئے جائیں تو ایک نادر ذخیرہ فراہم ہو جائے۔ مثلاً

تیری مرضی ہو جہاں بھیجدے اے داورِ حشر　　مجھ سے دُہرائی نہ جائیگی خطائیں اپنی

نہ پڑھ فردِ عمل میری کچھ ایسے ہی معاصی ہیں　　کہ تیرے عفو کا اے میرے مالک امتحاں ہوگا

چشمِ عصیاں سے ڈھلک کر دامنِ رحمت میں تھا　　لغزشِ مستانۂ اشکِ ندامت دیکھئے

اِک نظر اور تری شانِ کریمی کے نثار　　یادِ عصیاں کی ابھی دل سے فراموش نہیں

خود بخود اشک بھرے آتے ہیں آنکھوں میں آثر　　شاید اب دل میں نہیں داغِ فروزاں کوئی

آنکھوں میں آنسوؤں کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ دل کے سب داغ بجھ چکے ہیں۔ ورنہ اگر ایک بھی باقی ہوتا تو اس پانی کو جلا دیتا۔ وادیِ عشق میں یہ وہ منزل ہے جہاں بیدلی کا عالم ہوتا ہے آنکھوں میں اشک بھر آنے کو عام طور سے زندہ دلی کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ حضرت آثر نے اس کو پژمردگیِ قلب کی نشانی بتایا ہے اور عدمِ داغ کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دل میں اب پہلا سا سوز کہاں، ورنہ اس کے کیا معنی کہ آنکھ تک آنسو آئیں اور دُھواں نہ بن جائیں۔

ایک مقطع اور ہے۔

ہے بڑی چیز آثر محرمیِ عشق و جنوں　　پہلے سمجھے تو سہی رازِ گریباں کوئی

یعنی عشق و جنون کی ظاہری علامت گریبان ہے جو بجائے خود ایک ایسا راز ہے کہ جس کا سمجھنا دشوار ہے۔ ہر شئے ایک پردہ نظر آتی ہے جس کے چاک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ایک حجاب اُٹھتا ہے دوسرا

پیدا ہوتا ہے۔ حریم عشق و جنون تک رسائی بغیر چاک گریباں دشوار ہے۔

شعر میں گریباں کی حقیقت بتائی ہے، یہ چار گرہ کپڑا نہیں ہے بلکہ حجابات شہود و تعین ہیں۔ انسان ان کو تو پہلے اُٹھا لے پھر اسرار عشق سمجھنے کا مدعی بنے۔

اوپر کے اشعار میں مَیں نے اُن چند خوبیوں کی طرف اشارے کئے ہیں جو صرف پختہ کار اور اعلیٰ شعرا ہی کے کلام میں پائی جا سکتی ہیں۔ بندش کی چستی، زبان کی روانی، روزمرہ کی چاشنی، ردیف کی قافیئے سے پیوستگی اور دیگر معمولی باتوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ یہ تو وہ راہیں ہیں جہاں سے ہر شاعر کا گذرنا ناگزیر ہے لیکن حضرت آثر اب اس منزل پر پہونچ چکے ہیں جہاں ان خوبیوں کا تذکرہ اُن کے لئے باعثِ ناز نہیں ہو سکتا۔

لالہ رام دیال اگروالا کی ہندی مطبوعات

حال میں رائے صاحب لالہ رام دیال صاحب پبلشر و بک سیلر الہ آباد نے ہندی کی کئی قابل قدر کتابیں شائع کر کے ہندی ادب کی توسیع و ترقی میں خاص حصہ لیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندی میں عام معلومات کی کتابیں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں، کیا اچھا ہو کہ قدرشناسان اُردو بھی اس طرف توجہ کر کے اردو ادب کی موجودہ کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ ابھی تک اُردو میں نئی معلومات کا ذخیرہ بہت ہی کمیاب ہے۔ یہ تینوں کتابیں یعنی "سمندر پر وجے" "وایو پر وجے" اور "پرکرت کی پرلجے" مشہور مصنف شری مان جگپتی چترویدی کی تصنیف ہیں اور تینوں باتصویر ہیں جس کی وجہ سے انکی دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے، ان کی عبارت سلیس اور طرز بیان نہایت آسان ہے اور کم عمر والے بچے بھی ان کو پڑھکر معلومات حاصل کر سکتے ہیں، قیمت بھی زیادہ نہیں ہے، اول دو کتابوں کی قیمت ایک روپیہ فی کتاب اور تیسری کتاب کی قیمت صرف دس آنہ ہے۔ لالہ رام دیال صاحب نے اسی مصنف کی ایک اور قابل قدر کتاب "او بہت مہا پرش" بھی شائع کی ہے جس میں گیلیلیو، نیوٹن، ایڈیسن، اور بوس وغیرہ نامور سائنسدانوں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں اور ان سب کی تصویریں بھی دی گئی ہیں قیمت ۱۰/ "ابھمینیو بدھ" شریت رامچندر شکل سرس کی دلچسپ منظوم تصنیف ہے، خود مصنف کا نام اس کتاب کی عمدگی کا ثبوت ہے اس کا حجم ۶۵ صفحات اور قیمت ۸/ ہے۔ شائقین رائے صاحب لالہ رام دیال صاحب بک سیلر کٹرا الہ آباد سے طلب فرمائیں۔

تنقید کتب

رَس یعنی فلسفۂ انبساط

مصنفہ مولوی حبیب الرحمٰن شاستری سنسکرت لیکچرار مسلم یونیورسٹی کالج علیگڈھ ڈیمائی سائز ۸۴ صفحات مجلد قیمت بلحاظ کاغذ درجہ اول ۱۲؍ درجہ دوم ۱۰؍

ملنے کا پتہ: ارشاد اینڈ کو، چوک بازار علی گڈھ۔

رَس اُردو داں حضرات کے لئے غالبًا نیا موضوع ہے اور اس کی حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہونگے، لہٰذا مندرجہ بالا کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے رَس کے معنی اور اسکی اصلیت کو ذہن نشین کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ رَس سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور انبساط یا لطف کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے لیکن اس لطف یا لذت کو جو مادّی ہو رس نہیں کہا جاتا بلکہ اس وجدانی کیفیت کو کہتے ہیں جو کسی دلکش منظر کے دیکھنے یا پُرلطف اشعار کے سننے سے انسانی قلب میں پیدا ہوتی ہے اور اس کتاب میں اُسی کیفیت کی تشریح کی گئی ہے اور اس کو ایک ربّانی پرتو اور ذاتی تجلّی بتلایا گیا ہے

دیباچہ اور تمہید کے علاوہ اس کتاب میں نو باب ہیں جن میں رَس کے متعلق مختلف العقائد حضرات کے عقیدہ، ان پر تبصرہ، رَس پیدا کرنے کے محرک، اُن کا اثر، منقلبات، جذبہ مستقل، رَس کی قسمیں، رَس کے مماثل اور رس کی حقیقت پر بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ جابجا سنسکرت کے حوالے حاشیہ پر درج ہیں اور ان کا ترجمہ متن میں موجود ہے۔

چونکہ اپنشد کے خیال کے مطابق رَس خود خدا ہے اس لئے دیباچہ میں وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور آخری باب میں یہ ثابت کیا ہے کہ واقعی حقیقی مسرت یا قلبی لذّت ایک پرتو ایزدی ہے۔

اس کتاب کا موضوع بالکل جدید ہے، اُردو میں ابتک غالبًا کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ مصنف مستحق ستائش ہیں جنھوں نے سنسکرت، فارسی عربی اور انگریزی زبانوں کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس مضمون پر یہ کتاب لکھی ہے جو اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ فلسفیانہ مباحث کے باوجود یہ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ ابتدائی حصہ کو غور و تامّل کے ساتھ پڑھنے کے بعد ناظرین کتاب

کو ختم کئے بغیر چھوڑ نہ سکیں گے۔ کیونکہ رس کے محرکات اور اثر وغیرہ کے سلسلہ میں سنسکرت ادب سے جو مثالیں دی گئی ہیں وہ بے حد دلکش ہیں، مصنف کا طرز تحریر سلجھا ہوا ہے، عبارت دلنشین ہے۔ غرض ہر حیثیت سے یہ کتاب لائق مطالعہ ہے اور مصنف کا یہ خیال کہ "رس کے مضمون کی جدت، محققانہ بلند پروازی، شاعرانہ نازک خیالی، سنسکرت شعراکی فطری اور دلآویز مضمون آرائی مسلمان طلبا کے قلوب میں بھی علم سنسکرت کا ذوق پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا سبب ہوگی" صحیح ہے کیونکہ ہندی اور سنسکرت کی شاعری میں بکثرت ایسی دلچسپ باتیں موجود ہیں جن کو اُردو داں حضرات بالکل نہیں جانتے۔

کتاب کے آخر میں اس کتاب کے متعلق سنسکرت کے ماہرین کی رائیں درج ہیں اور ہر شخص نے مصنف کی کوشش کی داد دی ہے اور اسکو ہندو مسلم اتحاد کا پیش خیمہ کہا ہے۔

ہم مصنف کو یہ قابل قدر کتاب لکھنے پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اُردو داں ہندو مسلمان حضرات اس کے مطالعہ سے کافی فائدہ اُٹھائیں گے۔

مبادیٔ فلسفہ

از مولانا عبدالماجد بی۔اے۔ کراؤن سائز ۱۰۵ صفحات

ملنے کا پتہ: معارف پریس اعظم گڈھ

اُردو کے مشہور مصنف مولانا عبدالماجد بی۔اے (دریابادی) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کی متعدد کتابیں شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکی ہیں، خصوصاً "فلسفۂ جذبات" و "فلسفۂ اجتماع"۔ یہ کتاب فلسفہ کی پہلی کتاب ہے اور چند قدیم متفرق فلسفیانہ مقالات کا مجموعہ ہے جو نظر ثانی اور ضروری ترمیم و اضافہ کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ دیباچہ کے علاوہ اس میں چھ باب ہیں (۱) فلسفہ و مذاہب فلسفہ پر ایک نظر (۲) بل کی منطق (۳) مقدمہ مکالمات برکلے (۴) عادت و فلسفۂ عادت (۵) نفس و مفردات نفس (۶) ماہیت جذبات۔ ابواب کے عنوانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

زبان و بیان کے لحاظ سے یہ کتاب صاف و سلجھی ہوئی ہے، اس کی عبارت میں وہی دلکشی ہے جو مصنف کا طرۂ امتیاز ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔

سہاگ رات یا بھورانی کو سیکھ

مصنفہ پنڈت کرشن کانت مالوی، کراؤن سائز، مترجمہ چودھری جگت موہن لال صاحب رواںؔ حجم ۲۶۵ صفحات، مجلد، قیمت ؏

ملنے کا پتہ: منیجر ابھیودیہ پریس الہ آباد

یہ کتاب پنڈت کرشن کانت صاحب مالوی نے لڑکیوں اور نئی دلہنوں کے لئے ہندی زبان میں لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی اور اب اس کا ترجمہ ہمارے مکرم چودھری جگت موہن لال صاحب رواں ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی نے مصنف کی خواہش پر اردو میں کیا ہے۔ اس کتاب میں شادی کے بعد عورت اور مرد کے فرائض نہایت وضاحت کے ساتھ دلچسپ پیرایے میں بیان کئے گئے ہیں اور عورت کس طرح شوہر کو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے، جسم کی صفائی حسب منشا، لڑکا یا لڑکی پیدا کرنا، بچوں کی حفاظت۔ ایسی تدبیریں جن سے حمل قرار نہ پائے، اس قسم کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عصمت و پاکدامنی پر بھی بحث کی گئی ہے غرض شادی ہونے کے بعد عورت کو جس قسم کے معلومات کی ضرورت ہوتی ہے یا جو باتیں پیش آتی ہیں ان کے متعلق تمام ضروری ہدایات اسمیں درج ہیں۔

مصنف نے کتاب کو دلچسپ بنانے کے لئے تمام مسائل پر خط و کتابت کے ذریعہ سے اظہار خیالات کیا ہے یعنی ایک شادی شدہ عورت اپنی دوسری بہن کے نام جس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے جو خطوط لکھتی ہے ان میں تمام باتیں بتلا دیتی ہے۔ ترجمہ کی زبان بے حد سادہ ہے کہ معمولی لکھی پڑھی لڑکیاں بھی اس کو بخوبی سمجھ سکتی ہیں، اس کے ساتھ ہی قابل مصنف کا انداز بیان بھی نہایت لطیف و دلچسپ ہے۔
یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے مگر لیتھو کی طرح کمپوزنگ کی اکثر غلطیاں پائی جاتی ہیں، مثلاً دلچسپ کو تقریباً ہر جگہ دلچشپ کمپوز کیا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر اختصار سے بھی کام لیا جا سکتا تھا، اور بعض اوقات ایک ہی بات کو مختلف مترادف الفاظ یا جملوں میں دہرایا گیا ہے، شاید اس وجہ سے کہ خطوط میں بے تکلف گفتگو کی شان پیدا کی گئی ہے۔ زن و شوہر کے تعلقات کے متعلق مہاتما گاندھی کے نظریہ پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زن و شوہر کو صرف بقائے نسل کی غرض سے یکجا ہونا چاہیئے اور زیادہ بچے بھی نہ پیدا کرنا چاہیئے مصنف کو اعتراف ہے کہ یہ نظریہ عموماً پسند نہیں کیا جا سکتا تاہم ان کی رائے میں آجکل ہر سمجھدار آدمی کو اسکی خاص طور پر کوشش کرنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے روز افزوں افلاس اور بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھتے ہوئے اہل ملک کو ان تدابیر کی طرف خاص طور پر متوجہ ہونے کی ضرورت ہے جن کی بدولت فی زمانہ اہل یورپ کثیر الاولادی کی مصیبت سے محفوظ رہتے ہیں۔ ہندوستان میں کسی زمانہ میں اولاد کی زیادتی کو لوگ باعث برکت سمجھتے تھے لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب سیاسی و تمدنی وجوہ کی بنا پر اس نظریہ میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے اور دیگر ملکوں کی طرح یہاں بھی اس کا خاص پروپگنڈہ ہونا چاہیئے۔
اس تصنیف کے ذریعہ نوجوانان ملک کے روبرو اصلاح معاشرت کے یہ تمام مسائل پیش کر دئے گئے اور ہم کو امید ہے کہ اردو داں جماعت اس ترجمے سے پورا فائدہ اٹھائیگی۔

مترجمہ کدارناتھ صاحب خورشید۔ چھوٹی تقطیع ۔ ۹۶ صفحات مجلد۔ قیمت ۸/

عورت اور مرد کے تعلقات

ملنے کا پتہ: لالہ راجپت رائے اینڈ سنس تاجران کتب لوہاری گیٹ۔ لاہور

جیساکہ نام سے ظاہر ہے اس چھوٹی سی کتاب میں مشہور روسی فلاسفر و مصلح قوم ٹالسٹائی کے اُن خطوط اور روزنامچوں کے دلچسپ اقتباسات و مضامین کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جن میں مصنف نے عورت و مرد کے تعلقات پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ عورت و مرد کے باہمی تعلقات کے متعلق ٹالسٹائی کی رائیں نہایت سخت ہیں، وہ دراصل برہمچریہ اور تجرد کے قائل و حامی ہیں۔ ٹالسٹائی شادی یا مناکحت کو اچھا نہیں سمجھتے ہیں، اور مرد و عورت دونوں کے لئے نفسانی جذبات پر قابو رکھنے کی تاکید کرتے ہیں اور شادی کی اجازت بدرجہ مجبوری دیتے ہیں اس حالت میں بھی ٹالسٹائی کی رائے ہیں میاں بیوی دونوں کو کسی طرح بھی اپنی خواہشات کا شکار نہ بننا چاہیئے بلکہ برسوں میں ایک آدھ دفعہ خواہش پوری کرنی چاہیئے۔ ٹالسٹائی یورپین ممالک کے مروجہ طریقہ کورٹ شپ کو بہت بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ بہرحال شروع سے آخر تک اُنھوں نے تاہّل کی زندگی کو پسندیدہ نہیں قرار دیا ہے بلکہ عورت و مرد دونوں کے لئے مجرد رہنے کی تلقین کی ہے، مہاتما گاندھی بھی بہت حد تک ٹالسٹائی کے مؤید ہیں اور انھوں نے بھی اپنی کتاب شاہ راہ صحت میں اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں، اس میں تو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ خواہشات نفسانی کو دبانا ہر طرح مفید ہے لیکن عام آدمی کے لئے ان نصائح پر عمل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے لیکن عورت مرد دونوں تھوڑی سی کوشش میں یہ بات آسانی سے کر سکتے ہیں کہ نفسانی خواہشات کے غلام نہ بنیں اور تاہّل کی زندگی بھی احتیاط کے ساتھ بسر کریں۔ بہرحال اُردو داں جماعت کے لئے یہ ایک نیا نظریہ ہے اس لئے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

مرتبہ مولانا ابو البلاغ علاؤ الدین خاوری ایم۔ اے مرحوم۔ کراؤن سائز ۴۴ صفحات قیمت ۱۲/

صیدیہ

ملنے کا پتہ: منیجر دار البلاغ، ملتانی اسٹریٹ، لاہور

یہ وہ نایاب مثنوی ہے جس میں میر وزیر علی صبا لکھنوی نے جان عالم واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے امرائے دربار نواب محسن الدولہ بہادر و نواب منور الدولہ بہادر کی مہم صید و شکار کے دلچسپ حالات نظم کئے تھے اور مرتب مرحوم نے ایک قلمی نسخہ سے اس کو مرتب کرکے بعد تصحیح و تحقیق شائع کیا تھا شروع میں ایک مبسوط دیباچہ ہے جس میں مثنوی پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ضمناً شعر و شاعری کے متعلق ضروری و مفید باتیں لکھ دی ہیں۔ دیباچہ اور اصل مثنوی میں جن جن حضرات کے نام یا تلمیحات آئی ہیں ان کے متعلق ضروری نوٹ حاشیہ پر لکھ دیئے ہیں اور اس طرح دیباچہ اصل مثنوی سے زیادہ دلچسپ و کار آمد ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ شعر و سخن کے دلدادہ اس کے مطالعہ سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

کلام جوش

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

اے حاجبو!

خدا کے واسطے اے حاجبو نہ دیر کرو
حریم ناز میں کوئی پکار کر کہہ دو
کہ پھر کوئی وطن آوارہ و جگر افگار
ملول و بیکس و مجنون و غمکش و بیمار
جگر کو خون کیے سختیاں اٹھائے ہوئے
درِ حضور پہ حاضر ہے سر جھکائے ہوئے
دھڑک رہا ہے کلیجہ ہر ایک آنسو میں
پکارتا ہے کہ اب دل نہیں ہے قابو میں
جبیں کے نقش میں رنگ سجود بھرنے کو
ہوا ہوں دور سے حاضر سلام کرنے کو
مرا رفیق نہیں کوئی بھی خدائی میں
زمیں جگہ نہیں دیتی تری جدائی میں

فنا کا جام اب ان انکھڑیوں سے پینے دے
نظر وہ ڈال جواب جوش کو نہ جینے دے

مغموم درخت

سڑک، غلغلہ، شور، ہلچل، غبار
دو رویہ درختوں کی سیدھی قطار
کوئی ہے کہ از راہِ سوز و گداز
سنے اِن درختوں کی کلیوں کے ساز

اسی طرح اِس مادّی عہد میں
کہاں دل کہ شاعر کے نغمے سنیں

بسنت

(از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی۔ بی۔ اے)

لو آگیا پھر بسنت بچو
جنگل میں چلو بہار دیکھو

ہے صبح کا وقت کیا سماں ہے
نیلا شفاف آسماں ہے

کیا خوب ہوا ہے بھینی بھینی
خنکی بھی ہے اور تازگی بھی

ننھی چڑیاں پھدک رہی ہیں
کیسی خوش ہیں چہک رہی ہیں

پھیلے ہیں نظر کے سامنے کھیت
کیسے دلکش ہیں یہ ہرے کھیت

شبنم جو پڑی نکھر گئے ہیں
سورج چمکا سنور گئے ہیں

پتی پتی کو دھو گئی ہے
شبنم موتی پرو گئی ہے

گیہوں جو میں ملی ہے سرسوں
پیلی پیلی کھلی ہے سرسوں

سرسوں ہے دور تک برابر
سبزہ اوڑھے ہے زرد چادر

سرسوں سے پھبن بسنت کی ہے
سرسوں سے زمیں دلھن بنی ہے

السی سرسوں کی ہے سہیلی
پھولی ہے بغل میں نیلی نیلی

ہیں پھول مٹر کے کیسے خوشرنگ
آنکھیں ہوں گلابی جیسے خوشرنگ

آموں کے شجر پہ آگیا بور
جیسے دولہا کے سر پہ ہو مور

کیا فصل بہار لائی ہے راگ
ٹیسو پھولا تو لگ گئی آگ

جنگل کا سنگار کچھ نہ پوچھو
پھولوں کی بہار کچھ نہ پوچھو

ہر سو ہیں کھلے ہزار ہا پھول
خوشبو خوشرنگ خوشنما پھول

خوشبو سے بسا ہوا ہے جنگل
گلزار بنا ہوا ہے جنگل

عالم میں کہاں ہیں یہ بہاریں
پیدا ہیں جو ہند کی زمیں میں

حضرت موسیٰ اور ایک سایل

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

اِک مرد ذکی فہیم ہشیار — لیکن بے زر غریب نادار
محروم فراغ بالیوں سے — مغموم شکستہ حالیوں سے
بے مے کا ایاغ ہو رہا تھا — مفلس کا چراغ ہو رہا تھا
جلتا تھا دیا نہ اُس کے گھر میں — دنیا تاریک تھی نظر میں
مفقود تھا زندگی کا جوہر — راحت نہ تھی جان کو میسّر
تاباں نہ تھی شمع انجمن میں — خنداں نہ تھا روئے گل چمن میں
رہتا تھا خطِ جبیں سے دلگیر — حرفِ اولاد تھا نہ تحریر
پارے کی طرح جگر تھا بے تاب — آئینۂ قلب میں نہ تھی آب
نظارہ کی راحتوں سے محروم — رہتا تھا مدام زار و مغموم
مایوس تمام نعمتوں سے — عاجز اپنی مصیبتوں سے
اِک روز غریب تنگ آ کر — پہونچا موسیٰ کے پاس جا کر
تدبیر نجات یوں نکالی — کی عرض کہ اے جناب عالی
ہیں آپ نبی پاک اکرم — عرفان کے پیشوائے اعظم
ذاتِ انور ہے باعثِ ناز — خاصانِ خدا میں خاص ممتاز
مجھ پر کچھ آپ کا کرم ہو — سامانِ سکونِ دل بہم ہو
درگاہ خدائے بحر و بر میں — یہ تین سوال پیش کر دیں
افلاس نے کر دیا ہے معذور — جلدی سے بلا یہ سر سے ہو دور
آنکھوں کو روشنی عطا ہو — سرمایۂ زندگی عطا ہو

اولاد کا رنج دور ہو جائے　　اس شمع سے گھر میں نور ہو جائے
حضرت نے سُنی جو حالتِ زار　　تھا اُنکی زباں پہ حرفِ انکار
بولے نادان تم ہو کتنے　　اِک منھ سے سوال اور اتنے
ممکن نہیں آرزو بر آئے　　خالق روئے طرب دکھلائے
کرتے فقط اِک سوال اگر پیش　　ہوتا منظور وہ کم و بیش
موسیٰ کا جواب سُن کے سائل　　یوں عرضِ سخن پہ اب تھا مائل
مَیں حکمِ جناب سے ہوں مجبور　　صرف ایک ہی التجا ہو منظور
دیکھا میں کروں یہ روز منظر　　اِک نورِ نگاہ صاحبِ فر
اِک بارگہِ فلک رسا میں　　سونے کے ظروفِ بے بہا میں
ہو نا شتہ و طعام سے سَیر　　ہو نعمت صبح و شام سے سَیر
موسیٰ پابند تھے سخن کے　　نقشِ حیرت بنے ہوئے تھے
پہلے جو کچھ طلب کیا تھا　　اب تک مشمولِ التجا تھا
وعدے سے تھے آپ اپنے مجبور　　کرنا ہی پڑا سوال منظور
درگاہِ کریم میں دعا کی　　سائل کی طرف سے التجا کی
تھے صدق و صفا اثر سے ہمدوش　　رحمت ہوئی اُسکی مائلِ جوش
سائل کی طلب ہر اِک بر آئی　　کھوئی ہوئی پھر نگاہ پائی
دیکھا قسمت سے منہ پسر کا　　روشن تھا اب چراغ گھر کا
دل صورتِ گلستاں ہرا تھا　　دولت ثروت سے گھر بھرا تھا

سائل کی بھی آن رہ گئی یوں
موسیٰ کی بھی شان رہ گئی یوں

(از جناب بسمل الہ آبادی)

دورِ سحر و شام سمجھتا ہوں میں　　رازِ غمِ ایام سمجھتا ہوں میں
جینا ہے تو مرنا بھی پڑے گا بسمل　　آغاز کو انجام سمجھتا ہوں میں

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی سالگرہ

از مسٹر وشستہ پرشاد فدا، بی۔اے،

عالم میں کس کی سالگرہ کی ہے دھوم دھام
پیشِ نظر ہے کس کا زمانے کو احترام

تقریب کیا ہے آج کہ دوشیزۂ بہار
دوشِ صبا پہ لائی ہے پھولوں کی بھر کے جام

کیوں گا رہے ہیں باغ میں مرغانِ خوش گلو
جنگل میں مور ناچتے پھرتے ہیں خوش خرام

فطرت کی دلفریبیاں کیوں جوبنوں پہ ہیں
کیوں شور کر رہی ہیں بپا ندیاں تمام

نرگس، گلاب، جوہی، چنبیلی، کہ موتیا
مہکا رہے ہیں کس لئے آفاق کا مشام

ستر برس کے سن پہ مشرف ہوا ہے کون
کس کی بلائیں لینے لگا ہے مرا کلام

بس ہو گیا ہے حال مرے دل پہ آئینہ
ہاں واقعی مسرت و بہجت کا ہے مقام

فطرت میں سب اُسی ہی کے اعزاز میں ہیں جشن
معروف جس کا نام ہے ٹیگور نیک نام

فطرت کو ہے عزیز کہ اُس کا تمام عمر
دیدِ طلسم جلوۂ فطرت رہا ہے کام

تاروں کے دل کی بات سمجھنے کے واسطے
باغوں کے جگنوؤں سے رہا ہے وہ ہم کلام

رازِ حیات اُس نے سنا جوئبار سے
شمس و قمر سے لیتا رہا درس صبح و شام

آنکھوں کے تل میں اُس نے بٹھائی ہے کائنات
روشن کیا چکور کے دل میں مہِ تمام

حاصل کیا عبور وہ اسرارِ عشق پر
بلبل کے ہاتھ پھول کو بھیجے کئی پیام

خاروں کو اُس نے پھول کا زیور بنا دیا
چشمِ غزال سے کیا صید افگنوں کو رام

ذرے کو آفتاب سے ایسا ملا دیا،
ذرہ بھی آفتاب پہ پھیلا رہا ہے دام

پروازِ فکر طائرِ سدرہ سے کم نہیں — طبع رواں ہے برق سے بڑھ چڑھ کے تیز گام

فنِ سخن کو عرش سے تشبیہ دیں اگر — ٹیگور ایسے عرش کا ہے داورِ کرام

اس کا کلام کیا ہے شرارے ہیں عشق کے — قائم ہے جس کی ذات سے خورشید کا نظام

انساں کو اس کے دم نے فرشتہ بنا دیا — جھک کر زمیں کو کرنے لگا ہے فلک سلام

طولِ کلام عیب میں داخل ہے اے فدا — اشعار آبدار کی بے سود ہے یہ لام

فرضِ محال زور لگائے بھی تو اگر — رہ جائے گی یہ مدح تری پھر بھی ناتمام

بہتر ہے اب کہ دستِ دعا کو دراز کر — موقوف کر اسی پہ قصیدے کا اختتام

جب تک ہے رنگ و بو کی کشش اہلِ فکر کو — جب تک فلک پہ ہے مہ و خورشید کو دوام

ٹیگور کا کلام ہو تب تک غذائے جاں
زندہ رہے جہان میں ٹیگور کا پیام

نوروز

(از سید اعظم حسین مدیر "ادب")

مسرت سے پر ہیں زمین آسماں — رنگا ہے نئے رنگ میں کل جہاں

درختوں سے فطرت نے کھیلا ہے رنگ — ہر اک شاخ پر سبز پھینکا ہے رنگ

گلوں کی قبائیں گلابی ہوئیں — تو کچھ اور پھولوں کی آبی ہوئیں

معطر ہوا باغ اس طور سے — اڑیں خوشبوئیں آم کے بور سے

ہوا معتدل پھر سنک کر چلی — چٹک کر مہکنے لگی ہر کلی

زراعت بھی کھیتوں میں تیار ہے — کسانوں کی گرمی بازار ہے

ہر اک نخل گلزار گل پوش ہے — دلوں میں پرندوں کے بھی جوش ہے

زباں پر پپیہے کی ہے "پی کہاں" — درختوں پہ کوئل ہے گرمِ فغاں

عجب ولولے ہیں امنگیں عجب — عجب مستیاں ہیں ترنگیں عجب

شناور سبک رو ہیں گرداب میں — نئے زور پیدا ہیں اعصاب میں

بہ سرعت رگوں میں لہو ہے رواں — کوئی دل میں لیتا ہے پھر چٹکیاں

نگارِ تمنا دل افروز ہے — مرے ساز میں بھی نیا سوز ہے

لگا ہونے رہ رہ کے جی بے قرار — تقاضا ہے پھر ہو کوئی ہمکنار

محبت کی تجدیدِ نو، روز ہو
[illegible] نوروز ہو

لطف سخن

(از لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی)

حسن عالم سوز نا محدود ہونا چاہیئے
ہر تجلی آفتاب آلود ہونا چاہیئے

ایک ہی جلوہ ہے جب ہنگامہ آرائے شہود
پھر وہی شاہد وہی مشہود ہونا چاہیئے

حسن عالم ساز کا فیض تجلی عام ہے
ایک اک ذرہ یہاں مسجود ہونا چاہیئے

بے نیازی! اب خطا کاروں کی ہمت بڑھ گئی
باب توبہ کچھ دنوں مسدود ہونا چاہیئے

حسن نیت ہے دلیل حسن انجام عمل
سعی میں بھی جلوۂ مقصود ہونا چاہیئے

شانہ و آئینہ کیا اے زلف مشکین ایاز
تیری زینت کو دل محمود ہونا چاہیئے

کاوش مژگاں کا پیہم یہ تقاضا ہے عزیز
ہر نفس کو تیرے خون آلود ہونا چاہیئے

(از لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی)

نالہ نغمہ ہے فریاد نہ فریاد رہے
کوئی کہہ جائے کہ ناشاد سرا شاد رہے

ہو کے آزاد تہ دامن صیاد رہے
گھر میں صیاد کے جبتک رہے آزاد رہے

کبھی خالی نہ ہو یہ گھر یونہی آباد رہے
شوق سے تیری طرح دل میں تری یاد رہے

صدقے اے تیر فگن آئے نہ آئے دل میں
تیری چٹکی میں یونہی ناوک بیداد رہے

ہر گھڑی ساتھ ہے کیوں ابروئے قاتل کا خیال
میرے سر پر لئے تلوار نہ جلاد رہے

میں وہ بلبل ہوں کروں دام محبت میں اسیر
چار ہی روز میں صیاد نہ صیاد رہے

ہمیں گلشن سے سوا ہے کہیں الفت اسکی
ہم نہ ہوں تو بھی الٰہی قفس آباد رہے

کیجئے کیا اسے رفتار زمانہ ہے یہی
پا بگل سرو رہے اور پھر آزاد رہے

کوئی کہتا یہ گزرتا ہے ادھر سے ہر روز
ہم رہیں یا نہ رہیں میکدہ آباد رہے

کس قدر [illegible] [illegible] بہت ہی جو خدا یاد رہے

لالے کا پھول بنے داغ بنے رنگ بنے　　دامنِ کوہ میں خونِ سرِ فرہاد رہے
چوڑیاں کیسی حنا کیا یہ زمانہ وہ ہے　　گورے ہاتھوں میں ترے خنجرِ فولاد رہے
ڈر سے محشر میں دم پرسشِ اعمال ریاضؔ　　اسکی رحمت کے سوا کچھ نہ مجھے یاد رہے

(از جناب منوّرؔ لکھنوی)

کیوں عیاں کرتا ہے اس کو جو نہاں ہے دل میں آگ　　یہ نہ کرنا ورنہ لگ ہی جائیگی محفل میں آگ
جب لگی دیکھی محبت کی کسی کے دل میں آگ　　چشمِ قہر آگیں سے وہ برسا گئے محفل میں آگ
عرضِ غم سے لگ گئی ایسی کچھ اُنکے دل میں آگ　　چھین کر دوزخ سے بھر دی کاسۂ سائل میں آگ
پہلے کشتی کی مری طوفانِ دریا کو سپرد　　چل دیے وہ پھر لگا کر دامنِ ساحل میں آگ
ہیئتِ دل کا مدارج پر ہے اس کے انحصار　　یہ کسی منزل میں پانی ہے کسی منزل میں آگ
ہے اثر ہر شے کا یہ جلدی سے کر لیتا قبول　　جب کبھی لگتی ہے تو لگتی ہے پہلے دل میں آگ
التہاب آگیں تلاطم نے کیا خاک سیاہ　　موجِ دریا نے لگا دی دامنِ ساحل میں آگ
گرچہ ہیں ضدّین دونوں جان لیوا ہیں مگر　　خنجرِ قاتل میں پانی نالۂ بسمل میں آگ
دور رہ کر نورِ حق سے اپنی مٹی کی خراب　　کیوں لگا دیتا نہیں تو پردۂ باطل میں آگ
سالکِ راہِ طلب کو چشمِ موسیٰ چاہیئے　　ورنہ مثلِ طور روشن ہے ہر اک منزل میں آگ
نالۂ دلگیر سے پیدا ہے شعلوں کی تڑپ　　لگ گئی ہے سوزشِ غم سے تنِ بسمل میں آگ
اک دلیل سادگی ہے یہ اداے نازِ حسن　　شوخیِ رنگِ حنا ہے یا کفِ قاتل میں آگ
میں منوّرؔ روزِ اول سے سراپا سوز ہوں　　کیا خبر بھر دی ہے کس نے میرے آب و گل میں آگ

(بابو ہرگوبند، یال سرلو استو نشترؔ)

ہمصفیرو رہنے دو افسانۂ ابرِ بہار　　آپ ہی دیوانہ ہے دیوانۂ ابرِ بہار
ایک مدت سے قفس کی زندگی ہے اور ہم　　کیا سُناتے ہو ہمیں افسانۂ ابرِ بہار
جب تصوّر بندھ گیا اُسکا وہیں مخمور ہیں　　میکشوں کے ساتھ ہے میخانۂ ابرِ بہار
دَیر سے مطلب نہ کچھ ہم کو حرم سے واسطہ　　ہم تو ہیں بس ساجدِ بتخانۂ ابرِ بہار
دیکھیے گلشن کی سرسبزی و شادابی کا رنگ　　پتّی پتّی کہتی ہے افسانۂ ابرِ بہار
ایک دن وہ تھے کہ ہم تھے اور چمن کی سیر تھی　　ابتو ہم ہیں اور فقط افسانۂ ابرِ بہار
ابتو نشتر کو جہاں دیکھا کہ سب کہنے لگے　　لیجیئے وہ آگیا دیوانۂ ابرِ بہار

علمی خبریں اور نوٹ

ہندوستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ کی ادبی کانفرنس کا تیسرا اجلاس الہ آباد میں ۵ و ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو وجیانگرم ہال میور سنٹرل کالج الہ آباد میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب صدر اکیڈیمی اپنی سیاسی مصروفیتوں کے باعث افتتاحی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے، چنانچہ آنریبل سر شاہ محمد سلیمان صاحب (چیف جسٹس الہ آباد ہائیکورٹ) چیرمین کمیٹی استقبالیہ نے اپنے و نیز صدر اکیڈیمی کی طرف سے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ صاحب موصوف نے جس طرح اکیڈیمی کے ہر کام میں شروع سے ابتک غیر معمولی دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اسی طرح آپ نے اس ادبی کانفرنس کی رہنمائی میں بھی اپنا بیش قیمت وقت بیدریغ صرف فرمایا۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس، سبجکٹ کمیٹی و مشاعرہ وغیرہ میں آپ شروع سے آخر تک تشریف فرما رہے اور اپنے ہدایات و مشوروں سے منتظمان کو مستفید فرماتے رہے شعبۂ اردو کے صدر اردو کے نامور ادیب و محسن۔ لاہور ہائیکورٹ کے محترم جسٹس سر عبدالقادر صاحب تھے۔ ہندی شعبہ کے صدر مہامہوپادھیائے پنڈت گنگا ناتھ جھا صاحب، وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی منتخب ہوئے تھے مگر ایک خانگی حادثہ کے باعث وہ کانفرنس میں تشریف نہ لا سکے اور انکے بجائے ہندی کے مشہور و معروف ادیب رائے بہادر لالہ سیتا رام صاحب نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ سر عبدالقادر صاحب کا خطبہ کسی آئندہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین ہوگا۔ اردو و ہندی شعبوں کے مباحث کا خلاصہ بھی آئندہ درج رسالہ ہوگا۔ فاضل سکریٹری اکیڈیمی ڈاکٹر تارا چند صاحب نے اس اکیڈیمی کی کارگزاری کے متعلق جو رپورٹ پیش کی اس سے یہ معلوم کر کے ہم کو مسرت ہوئی کہ گو امسال گورنمنٹ صوبہ نے مالی زیرباری کے باعث پچاس ہزار کے بجائے صرف تیس ہزار روپیہ ہی کی امداد عطا کی جسکی وجہ سے اکیڈیمی کو اپنے مجوزہ پروگرام میں تخفیف کرنا پڑی تاہم سال گذشتہ میں اکیڈیمی نے چودہ قابل قدر کتابیں شائع کیں انمیں ۲ دو کتابیں ڈرامے ۴ چار شعر و سخن کے متعلق ۲ دو ادبی سوانح عمریاں ۲ دو تاریخی تصانیف ایک کتاب فلکیات ۲ دو بیالوجی اور ایک زراعت کے متعلق ہے۔ اس وقت پانچ دیگر تصانیف (جنمیں تین تاریخی سوانح عمریاں ہیں اور ایک کتاب جغرافیہ اور ایک اقتصادیات کے متعلق ہے) زیر طبع ہیں، اور ۱۹ انیس دیگر مسودے منظور ہو چکے ہیں اور عنقریب ہی چھپنے کے لئے مطبع بھیجے جائینگے۔ ان کی تفصیل یہ ہے :-

ڈراما	۶	فلسفہ	۱	سائینس	۳
ادبی سوانحعمریاں	۱	شعر و سخن	۲	فن باغبانی	۱

انکے علاوہ اس وقت اکیڈیمی کے لئے چھتیس ۳۶ دیگر کتابیں زیر تصنیف ہیں، انکے مصنف بھی ملک کے مشہور و معروف اصحاب کے زمرہ سے انتخاب کئے جاچکے ہیں۔

پچھلے سال سے اکیڈیمی کا ایک اُردو ہندی تماہی رسالہ بھی مولانا اصغر و مسٹر رام چندر ٹنڈن کی اڈیٹری میں شایع ہورہا ہے، گو اسکے بعض پہلوؤں کے متعلق ملک کے ادبی حلقوں میں بہت کچھ مباحثہ رہا اور ہے لیکن بحیثیت مجموعی دونوں رسالوں کا شمار بہترین پرچوں میں ہونے لگا ہے اور انکی کامیابی پر ہم ان کے فاضل اڈیٹروں کو مبارکباد دیسکتے ہیں۔

اس کانفرنس کے سلسلہ میں دو فاضل ادیبوں کے دو اہم لکچر بھی ہوئے جو اکیڈیمی کی فرمایش پر خاص طور پر تیار کئے گئے تھے اور عنقریب کتابی صورت میں شایع ہونگے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جامعہ ملیہ دہلی کا لکچر اقتصادیات کے اصول اور نقطۂ خیال کے متعلق ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے، جسمیں اس اہم موضوع پر نہایت دلچسپ و دلنشین پیرایہ میں بحث کی گئی ہے اور زمانۂ حال کے تمام اقتصادی مسائل اور نظریے ایسے دلآویز طریقے اور سلیس زبان میں پیش کئے گئے ہیں کہ اس مبحث کے تمام دقیق نکات ایک معمولی شخص کے بھی ذہن نشین ہوجائینگے۔ ہمکو یقین ہے کہ جب یہ لکچر شایع ہوگا تو ہر حیثیت سے اکیڈیمی کے لئے باعث فخر ہوگا۔

دوسرا لکچر پنڈت پدم سنگھ صاحب شرما کا ہندی، اردو یا ہندوستانی زبان پر بھی نہایت مفید و دلچسپ تھا۔

امسال کانفرنس کے ساتھ ہندی اُردو مشاعرے بھی منعقد ہوئے۔ اُردو مشاعرے کی بعض غزلیات آیندہ ہدیۂ ناظرین ہونگی۔ اپنے طور پر دونوں صحبتیں دلچسپ ہیں لیکن ہماری رائے میں اکیڈیمی کو رسمی مشاعروں میں کچھ نہ کچھ جدت پیدا کرنیکی کوشش کرنا چاہیئے۔

زمانہ کے کسی نمبر میں مہاراجہ پرتھی راج چوہان کے دربار کا مرقع ہدیۂ ناظرین کیا گیا تھا، اس نمبر میں ہم ان کے نامور حریف مہاراجہ جے چند راٹھور والیٔ قنوج کے شاہانہ دربار کا فوٹو پیش کررہے ہیں۔ یہ دونوں مہاراجے ایکدوسرے کے عزیز تھے لیکن بات ہی بات میں دونوں میں کدورت ہوگئی، اور ان کی باہمی جنگ نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔

زمانہ بک ایجنسی کی دلچسپ و قابل دید کتابیں

نصائح جہانگیریہ

یعنی نامور مہندر جہانگیریہ کے مشہور و معروف و منیتی کا ترجمہ از جناب پنڈت ہیمنت راؤ صاحب مددگار خزانہ سرکار عالیہ گورنمنٹ نظام دام اقبالہ قیمت ۶/

گل کدہ

لسان الملک حضرت عزیز لکھنوی کا مجموعہ کلام جس کا ہر صفحہ ایک چمن زار اور ہر شعر ایک خوش رنگ پھول ہے قیمت عہ/

لسان الغیب

شرح دیوان حافظ مع مفصل سوانح عمری ملک کے مشہور اہل قلم حضرات کی رائے ہے کہ یہ شرح تکمیل کے درجہ تک پہونچ گئی ہے حصہ اول ہے، حصہ دوم عا/

کاس الکرام

شرح رباعیات عمر خیام مع مفصل سوانحعمری تمام ارباب سخن کا اس پر اتفاق ہے کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ مکمل اور مبسوط کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔

قیمت تین روپیہ ہے/

قومی نمبر رسالہ زمانہ

جسمیں ۴۷ قابل دید مضامین نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر اور مہاتما گاندھی اور لالہ لاجپت رائے ڈاکٹر سپرو مسز نائیڈو ڈاکٹر اقبال کے خاص بیانات اور بہت سے قابل دید مضامین نظم و نثر شائع ہوئے ہیں قیمت عہ/

اختر ستان

ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں اختر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ برجستہ اور ہر شعر تیر و نشتر ہے قیمت عہ/

مکمل عورت

دو لڑکیوں کی تعلیمی و سوشیل حالات کا مقابلہ ایک یورپین اسکول اور دوسری کو کینا ودیالیہ میں داخل کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ کینا ودیالیہ کی لڑکی تعلیمی و سوشیل حالت میں بہتر ہے قیمت ۸/

روٹھی رانی

جسمیں حسن و عشق کی سچی داستان اور راز و نیاز کا دلچسپ کم اور رہاہٹ کی دلکش مثال موجود ہے قیمت ۶/

پریم بتیسی

یعنی اردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند بی۔ اے کے بہترین فصول کا مجموعہ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابل دید ہے حصہ اول ۱۲/ حصہ دوم ۱۲/

دنیا کے راز

از ابو الفاضل راز چاندپوری قدیم و جدید دلکش نظموں کا مجموعہ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف قیمت صرف عہ/

یادگار قومی

جسمیں ملک کے مشہور ترین انشا پردازوں کے ۵ امضامین نادر چار عکسی تصاویر ہیں کاغذ لکھائی چھپائی صاف ہے قیمت عہ/

ترجمہ رامائن منظوم

بال کانڈ کا اصلی حصہ ہی ہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اردو اشعار میں مترجمہ سورج پرشاد تصور قیمت ۱۲/

بزم احباب

اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ قیمت ۶/

سیر المصنفین

اردو انشا پردازی کی مکمل تاریخ از جناب مولوی محمد یحیٰی صاحب بی۔ اے شعرا کی طرح نثاروں کا جامع تذکرہ قیمت دو روپیہ عا/

طریق دولتمندی

یہ کتاب ہر شخص کے قابل خرید ہے دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے کم لوگ واقف ہیں اس کتاب میں دولت حاصل کرنے کے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں۔ قیمت ۸/

اردو مضمون نویسی

مضمون لکھنے کے متعلق بابو نانک پرشاد بی۔ اے پروفیسر کی نہایت عمدہ کتاب ہے قیمت ۸/

حیات بیوہ

جسمیں مصنف نے بیوگان کی حالت زار کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور انکی جانگداز مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا گیا ہے۔

قیمت ۵/

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمائیے

پچاس سالوں سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کے بے مثل موجد

(سفر حضر میں کام آنے والا)

REGD. **ڈابر دواؤں کے نمونہ کا بکس**

(اس میں مندرجہ ذیل بارہ قسم کی دوائیں ہیں)

نمبر (۱) "کافو" اصل عرق کافور ہیضہ کی خاص دوا نمبر (۲) "پودن ہرا" عرق پودینہ نمبر (۳) "جلابن" جلاب کی گولی۔ نمبر (۴) "دب دمہ" دمہ کی دوا نمبر (۵) "لال شربت" بچے لڑکے اور بڑے سوتی کی لیشتی نمبر (۶) "کولاریا" کولاٹانک نمبر (۷) "لیشٹینا" مقوی باہ کی گولی۔ نمبر (۸) "سربائنا" دردسر کی ٹکیہ نمبر (۹) "زنگ رنگ" مرہم داد۔ نمبر (۱۰) "ہیلک" کٹے جلے وغیرہ زخموں کا مرہم نمبر (۱۱) "دردانت" دانت کے درد کی دوا۔ نمبر (۱۲) "درکان" کان کے درد کی دوا۔

قیمت فی بکس دو روپیہ ۲، محصول دس آنہ ۱۰/

REGD. **"کولاریا"**

(کولاٹانک)

یہ دل۔ دماغ۔ اور کلیجہ کو طاقت پہونچانے میں بے مثل ہے۔ اس کے استعمال سے دل کی دھڑکن۔ کلیجہ کی کمزوری تھوڑی محنت سے سانس کا پھولنا۔ دور ہو جاتا ہے اور سخت محنت کرنے پر بھی تکان نہیں ہوتی اس سے شراب و افیون وغیرہ کی بدعادت ترک ہو جاتی ہے اس سے گلے کی آواز سریلی ہوتی ہے۔ لکچرار علم۔ طالب علم اور گانے والوں کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ دو آنہ عہ/ قیمت نمونہ ۳/ محصول سات آنہ ۷/ نمونہ صرف ایجنٹ سے مل سکتا ہے۔

نوٹ ہماری دوائیں ہر جگہ دوا فروشوں اور دوکانداروں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ محصول بہت بڑھ گیا ہے اس لئے اس سے بچنے کے لئے اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خریدیئے۔

(صیغہ نمبر ۶۷) پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

ایجنٹ:۔ کانپور نیا گنج میں محمد حفیظ محمد نصیر صاحبان

METRES
CORDIAL RIO
THE WOMAN'S TONIC
الٹراس کارڈی آیل یعنی اکسیر نسواں
ڈاکٹراس کو جسمانی صحت کے لئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں
ہر گھر میں اسکا رہنا نہایت ضروری ہے
ماں بہن اور بیٹی کے واسطے بہترین دوائی
Rio Chemical Co.
79, BARROW STREET
NEW YORK (U.S.A)
ہندو شعراء
خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چار سو پچاس
گزشتہ و موجودہ ہندو شعراء کے حالات مع نہایت دلکش قابل
دید چیدہ اشعار
قیمت
تذکرہ آب بقا گزشتہ و موجودہ شعراء کے حالات
شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں
لغات اُردو مکمل سٹ
حال اُردو ہندی اور اُردو کی حقیقت اور الفاظ کا فرق
اصلاح زبان اُردو۔ متروکات کی تشریح
ترجمان پارس اُردو سے فارسی بنانیکی آسان ترکیب
زباندانی۔ اُردو کے مستند قواعد
اصول اُردو۔ صرف و نحو کے مختصر قواعد
المشتہر منیجر عشرت بکڈپو احاطہ خانساماں لکھنؤ
انقلاب زندہ باد
انتخاب لاجواب
زندگی میں آسودگی اور آرام اچھا نام اور اچھا کام نہ ہو تو زندگی ہی ناکام ہے لیکن جب آپکی صحت ہی اچھی نہیں اور جسم میں طاقت ہی نہیں تو ان کا حاصل کرنا غیر ممکن ہے۔ اگر آپ اپنی حالت میں انقلاب چاہتے ہیں تو اس کے لئے مقویات سراج عالم آتنک نگرہ گولیاں کا انتخاب لاجواب ہوگا۔ یہ گولیاں آپ کی جملہ شکایتوں قبض۔ بدہضمی۔ خون اور منی کی خرابی دکھی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت انزال۔ دل و دماغ کی کمزوری۔ قوت ہاضمہ اور قوت حافظہ کی کمی اور جملہ شکایتوں کو دور کر کے پورا آرام پہونچا کے آسودگی عطا کرکے اچھے اور اہم کام کے انجام دینے کی ہمت عطا کرکے نامور بنادے گی۔ قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں عہ ۵ ڈبیاں للعہ علاوہ محصول ڈاک۔ اسی طرح ہمارا طلا واجی کرن ہے۔ تمام بیرونی نقائص دور کرکے اعلیٰ درجہ کی مردمی عطا کرنے میں پوری فتح حاصل کرچکا ہے۔ قیمت فی شیشی پانچ روپیہ صہ صحت تندرستی کی پٹہر راہ راست کی رہبر اور سب سے عمدہ مضامین سے مزین کتاب کام شاستر بالکل مفت طلب فرمائیے۔
وید شاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاواڑ
ایجنٹ:۔ عبدالکریم اینڈ سنز مشن روڈ۔ کانپور

ہاف ٹون عکسی تصاویر

یہ تصاویر ہاف ٹون بلاک سے عمدہ آرٹ پیپر پر شایع ہوئی ہیں اور اُن کو عام پسندیدگی کا فخر حاصل ہے

تصاویر رنگین

فی تصویر ۲ ر

مسیح ابن مریم
نغمۂ محبت
موسم سرما
جادو بہاری
انتظار
ہدایت
خواب راحت
گل پنج روز
رفیق طفلی
شکنتلا و دشینت
مشعل ہدایت
تار شکستہ
صبح نوروزی

فن تصویر کے نمونے

کثرت میں وحدت ۲ ر
وقت نزع ۲ ر
رام بن باس ۲ ر
کرشن اجودھیا جی ۲ ر
نظر بد کا اتار ۲ ر
راجہ اج کا ملاپ ۲ ر

بھکارنی ۲ ر
گنگا اور بھیشم ۲ ر
سمندر سا شن ۲ ر
امید وفاداری ۲ ر
شیواجی اور رامداس ۲ ر
قدیم زمانہ کا طریق جنگ ۲ ر
یورپ کا ایک معرکہ ۲ ر
ایک قدیم مشرقی مدرسہ ۲ ر
مصطفٰے کمال پاشا
کی ترکی کونسل ۲ ر
غسل کی تیاری ۲ ر
ستیہ وان اور ساوتری ۲ ر
راجہ کمانڈر کے بیٹے
کا قتل ۲ ر
باسدیو اور دیوکی قید ۲ ر
زوبہ کمیش متعلق میگ
دوت کالیداس ۱ ر
گوتم بدھ ۱ ر
اکبر اعظم ۱ ر
راجہ مان سنگھ ۱ ر
اکبر اور چیتے کا شکار ۱ ر
دربار شاہجہاں ۱ ر
عہد مغلیہ میں شاہی

سواری کا جلوس
محاصرہ چتوڑ
پیدائش شاہزادہ سلیم
دربار جہانگیر میں سفیر
فارس
داراشکوہ کا سر اورنگزیب
کے سامنے پیش ہوتا ہے
بیرن صاحب معہ جعفر
ٹیپو سلطان
دربار مادھوراؤ پیشوا
دربار شاہ عباس

موسمی تصاویر

ماہ چیت ۲ ر بیساکھ ۲ ر
جیٹھ ۲ ر اساڑھ ۲ ر
بھادوں ۲ ر ماگھ ۲ ر
پھاگن ۲ ر ساون ۲ ر

مشہور انشاپردازان اردو

مولانا شبلی ۱ ر
شمس العلما ذکاء اللہ ۱ ر
شمس العلما ڈاکٹر سید علی ۱ ر
میر تعشق علی ۲ ر
حضرت امیر مرحوم ۲ ر

حضرت سرور ۲ ر
مولوی عزیز مرزا صاحب ۲ ر
بابو بالمکند گپتا ۲ ر
اڈیٹر بھارت متر ۲ ر
مشاعرہ کیننگ کالج
منعقدہ ۱۹۱۱ء ۱ ر
منشی احمد علی شوق ۱ ر
مرزا سلطان احمد ۱ ر
مرزا محمد رفیع سودا ۲ ر
مرزا انشاء اللہ خاں ۱ ر
مولانا عبد الرزاق البرامکہ ۲ ر
مولانا آزاد دہلوی ۲ ر
مسٹر رام بابو سکسینہ ۲ ر
منشی نوبت رائے نظر ۲ ر
جناب چکبست ۲ ر
حضرت صفی ۲ ر
ڈاکٹر اقبال ۲ ر
مولانا حسن نظامی ۲ ر

لیڈران ہند و ناموران ملک

مہاراجہ رام موہن رائے ۲ ر
مسٹر دادا بھائی نوروجی ۲ ر
سر سالار جنگ ۲ ر

ڈاکٹر نذیر احمد خاں ۱ ر
اراکین دیانند کالج ۱ ر
مسٹر تلک ۲ ر
جسٹس محمود ۲ ر
بابو سریندر ناتھ بنرجی ۱ ر
مسٹر کالیچرن بنرجی ۱ ر
سر رام کرشن بھنڈارکر ۱ ر
بابو گنگا پرشاد ورما ۲ ر
سوامی دیوکانند ۱ ر
نواب محسن الملک ۲ ر
مسٹر رہس بہاری ۲ ر
ڈاکٹر ستیش چندر
بنرجی ۱ ر
پنڈت بشمبر ناتھ ۲ ر
بابو پرتاب چندر
بنرجی ۲ ر
جسٹس لال چند ایم اے ۱ ر
آنریبل مسٹر گوکھلے ۱ ر
انجمن خادمان ہند ۲ ر
مسٹر رام داس ۲ ر
مہاتما گاندھی ۲ ر
پنڈت مدن موہن
مالوی ۱ ر

کرنل بھولا ناتھ ۲ ر
پنڈت موتی لال نہرو ۲ ر
لالہ لاجپت رائے ۲ ر
ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ۲ ر
مسلم رہنما رحمت اللہ
لالہ ہنسراج ۲ ر
راجہ صاحب محمود آباد ۲ ر
لارڈ سنہا ۱ ر
سر آغا خاں ۲ ر
مولانا محمد علی ۲ ر
مسٹر سچیدانند سنہا ۲ ر
مسز سروجنی نائیڈو ۲ ر
مسٹر وی پی۔ مادھو
راؤ ۱ ر
مہاتما منشی رام ۲ ر
سوامی شردھانند ۱ ر
سر سریندر ناتھ بنرجی
ٹیگور ۲ ر
بابو بھگوان داس ۱ ر
سید امیر علی ۱ ر
نواب سید حسن
بلگرامی ۱ ر
نواب سید محمد ۱ ر

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے منگائیے

ہمزاد (ڈراما)

اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔ اے کا وہ دلچسپ ڈراما جسمیں کم عمر بیوی اور بزرگوار شوہر کے معاملات قدرے ظرافت آمیز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اچھی سوسائٹیوں میں اسٹیج کرنے کیلئے یہ ڈراما بہت مناسب ہے۔ طباعت کتابت، کاغذ بہت اچھا۔ یہ اردو کی ان کتابوں میں سے ہے جو تمام لوازم اشاعت سے آراستہ ہیں ۶/

گناہ کی دیوار (ڈراما)

مصنفہ اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم اے۔ گناہ بری چیز ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر بدتر ہیں۔ گناہ کی دیوار شاید ٹوٹ سکتی ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر کے بتوں کا توڑنا بہت دشوار ہے۔ یہ ایک باعصمت خاتون کا قصہ ہے جسے کچھ عرصہ تک مجبوراً عصمت فروشی کی زندگی گزارنی پڑی لیکن بالآخر خدا نے اس کی گریہ وزاری سن لی اور اس زندگی سے نجات دلائی۔ قیمت ۸/

کھیتی (ڈراما)

مصنفہ محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لئے ایک دلچسپ ڈراما۔ مذہب اور اخلاق کس رستے پر چلانا چاہتے ہیں۔ زمانے کی مصلحتیں، قوم وملت کی ضروریات سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے اور ایک معیار بھی تجویز کیا گیا ہے جو رہنمائی کے دعویداروں کو پرکھنے میں کام آسکتا ہے۔

قیمت صرف ۶/

پردۂ غفلت (ڈراما)

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا وہ ڈراما جو انھوں نے قیام جرمنی میں لکھکر وہیں چھپایا تھا مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر، تعلیم نسواں آزادی نسواں اور پردہ پر مفید بحث۔ دلچسپ ظرافت آمیز اور نتیجہ خیز قصہ۔ طباعت عمدہ قیمت ایک روپیہ ۸/

بنڈت سری ملیہ پرنٹر بیسر ذال پریس کانپور   وا۔ نرائن نگم۔ ایڈیٹر۔ پبلشر

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱

زمانہ

مرتبہ:- دیانرائن نگم، بی۔اے۔

نمبر ۴	اپریل ۱۹۳۲ء	جلد ۵۸

فہرست مضامین

تصاویر آنریبل سر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ۔ ہز ہائینس جام صاحب نوانگر۔
مسٹر وال چند ہیرا چند۔ آنریبل مسٹر ہیگ۔ سر جیمس ڈیوڈ سفٹن گورنر بہار و اڑیسہ۔

قیمت فی پرچہ

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ

قیمت ممالک غیر سے سالانہ ... ششماہی ... ہندستان کیلیے ... ششماہی ...

زمانہ

جلد ۵۸ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء نمبر ۴

مختارات

(از مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی، بی۔ اے۔)

ہر زبان میں بہ شرطیکہ وہ ایک زندہ زبان ہو، متروکات و مختارات کا عمل جاری رہتا ہے۔ الفاظ بھی انسانوں اور دوسرے جانداروں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، پلتے ہیں، تربیت پاتے ہیں اور اس تربیت کے مطابق مہذب اور شائستہ یا غیر مہذب اور ناشائستہ ہوتے ہیں۔ تندرست و توانا ہوتے ہیں، علیل اور نحیف و نزار ہوتے ہیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں، ملکوں ملکوں کی سیر کرتے ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاکر مستقل طور پر قیام کر لیتے ہیں، وہاں کے رسم و رواج اور اطوار و خصائل اختیار کر لیتے ہیں اور ہر جاندار کی طرح یہ بھی ایک دن مر جاتے ہیں۔ لیکن الفاظ آسانی سے نہیں مرتے، بہت ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہیں، جب کوئی لفظ مر جاتا ہے یا اس قدر علیل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا نہ کر سکے تو اس کی جگہ دوسرے الفاظ لے لئے جاتے ہیں۔ یہ دوسرے الفاظ یا تو بالکل نومولود گویا لفظوں کی نئی نسل سے ہوتے ہیں یا پھر پکے پلائے کسی دوسرے ملک سے آجاتے ہیں، جو الفاظ مر جاتے ہیں یا ترک کر دیئے جاتے ہیں، اُن کا شمار "متروکات" میں ہوتا ہے اور جو الفاظ زبان میں نئے داخل ہوتے ہیں یا کسی

مخصوص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں اُن کا شمار "مختارات" میں ہوتا ہے لیکن الفاظ کے ترک و اختیار کا مسئلہ زبان کے نہایت اہم اور نازک مسائل میں سے ہے، یہ کسی مخصوص فرد یا جماعت کے بس کی بات نہیں ہے کہ زبان کے کسی لفظ کو ترک کر دے یا کسی نئے لفظ کو اختیار کرلے، بلکہ اس کا انحصار تمام تر زبان کے فطری ارتقا پر ہے، البتّہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ بعض اوقات صرف ایک شاعر یا ادیب چند الفاظ کو اپنی تصنیفات میں ترک کر دیتا ہے اور پھر کچھ مدت کے بعد وہ الفاظ استعمال میں نہیں رہتے گویا وہ تمام اہل زبان کے نزدیک متروک قرار پاتے ہیں اس کا سبب عموماً یہ ہوتا ہے کہ زبان کی ترقی کی رفتار میں بعض الفاظ اُس کا ساتھ نہیں دے سکتے جوں جوں زبان سجھی جاتی ہے اہل زبان کو الفاظ کی معنویت یا فصاحت وعدم فصاحت کا اندازہ ہوتا جاتا ہے اور جو الفاظ بہ آئینِ شایستہ مفہوم ادا نہیں کرسکتے یا ثقیل اور غیر فصیح ہوتے ہیں اہل ذوق حضرات اُن کے استعمال سے گُریز کرنے لگتے ہیں۔

مختارات ہر زبان میں دو صورتیں اختیار کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ ایسے علوم و فنون کے واسطے جو پہلے زبان میں موجود نہ تھے علمی اصطلاحات وضع کرنے کے لئے الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ اصطلاحیں عموماً دوسری ترقی یافتہ مشترک زبانوں سے لی جاتی ہیں، مثلاً اُردو ہے، یہ زبان آرین زبانوں کے سنسکرت اور ایرانی خاندان سے متعلق ہے۔ مگر اس میں کثرت سے عربی اور ترکی زبانوں کے لفظ بھی رائج ہیں اور ان دونوں زبانوں میں سے ایک سامی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری تورانی خاندان سے پس ہم اُردو میں ہر سہ خاندانِ السنہ کے الفاظ علمی اصطلاحوں کے لئے اختیار کرسکتے ہیں۔ دوسری صورت مختارات کی ادبیات میں ظہور پذیر ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ جب کبھی کسی لفظ کا استعمال عام طور پر ترک کردیا جاتا ہے تو اس کی جگہ کوئی نیا لفظ لے لیتا ہے، یا کسی مفہوم کے نازک پہلوؤں کو واضح کرنے کے لئے کبھی کبھی کوئی مصنف نیا لفظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اگر وہ لفظ ذوقِ سلیم کے مطابق ہوتا ہے اور حقیقت میں اس کی مدد سے کسی مخصوص مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے اور وہ مفہوم انسان کے طبعی رجحان کے مطابق ہوتا ہے اور عام حسیات وجذبات کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ لفظ رفتہ رفتہ رائج ہو جاتا ہے۔ مختارات کی بھی یہی دوسری صورت ہے، جو اس مضمون کا موضوع بحث ہے۔

ان میں سے پہلی صورت یعنی "اصطلاح سازی" تو اس مخصوص علم کے ماہرین سے متعلق ہوتی ہے جس کی وہ اصطلاحیں ہوں اور اُن کے وضع کرنے کا حق انھیں ماہرین کو حاصل ہے اور اُن کے رد کردینے یا قبول کرلینے کا حق بھی اُن اصحاب کو حاصل ہے جن کو اُس علم سے عام طور پر واسطہ پڑتا ہو، لیکن

ادبیات کے لئے "لفظ سازی" کا حق کسی فرد واحد یا کسی جماعت کو نہیں پہنچتا۔ ادبیات نام ہے الفاظ میں جذبات وحسیات و امور ذہنیہ وواردات قلبیہ کے اظہار کا، اور چونکہ ان چیزوں کے اظہار کی ضرورت ہمیشہ پڑتی رہتی ہے اس لئے ہر زبان میں اگر وہ زبان بالکل ابتدائی حالت میں نہ ہو، ان کے لئے الفاظ کا ایک وافر ذخیرہ موجود رہتا ہے اور بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ نئے الفاظ کی ضرورت پڑے۔ پس اگر کوئی صاحب ذوق شاعر یا ادیب اپنے مفہوم کے کسی پہلو کو واضح کرنے کے لئے نیا لفظ اختیار کرتا ہے تو جب تک زبان میں اس کے لئے جگہ نہ پیدا ہو جائے یعنی جب تک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے اُس وقت تک وہ نیا لفظ زبان میں رائج نہیں ہو سکتا۔

ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو اس موقعہ پر یہ خیال پیدا ہو کہ ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے متعدد مترادف الفاظ بھی تو ہوتے ہیں، اس لئے اگر کسی مخصوص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ موجود بھی ہے تب بھی ایک نئے لفظ کے اضافہ سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے، کسی زبان میں ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے متعدد الفاظ کا رائج ہونا مشکل ہے۔ چند الفاظ بالکل مترادف نہیں ہو سکتے ان کے معانی میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا خواہ وہ کتنا ہی نازک ہو۔ زبان چاہے کتنی وسیع کیوں نہ ہو بالآخر محدود ہوتی ہے اور خیالات ہمیشہ غیر محدود ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی زبان ایک بیکار اور فضول لفظ کا بار برداشت نہیں کر سکتی۔

اس کے برخلاف قریب قریب ہر زبان میں ایسے الفاظ ضرور ملیں گے جو دو یا دو سے زیادہ معانی میں مستعمل ہیں، مثلاً "یکا" اردو میں کئی معنوں میں بولا جاتا ہے، یعنی ایک قسم کی گاڑی، تنہا، بے نظیر، وہ سپاہی جسے گھر بیٹھے تنخواہ ملے۔ یا "لاکھ" کے بھی دو معنی ہیں، سو ہزار اور ہر چند۔ یا "مچھلی" بھی کئی معنوں میں مستعمل ہے، ماہی، بازو کا گوشت، ایک زیور جو کانوں میں پہنتے ہیں۔ یا "چاک" ہے، اس کے بھی کئی معنی ہیں، دامن کا کھلا ہوا حصہ، کمہار کا پہیہ، کھریا مٹی، کواڑ کی دراز۔

اس تمام گفتگو سے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی مخصوص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں کوئی لفظ رائج ہے تو ہمیں صرف اس بنا پر کہ یہ لفظ تو بہت دنوں سے رائج ہے اور پرانا ہو گیا ہے اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ استعمال کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے، یہ کوشش کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتی، ہم نئے لفظ بنا کر لوگوں کے حلق میں زبردستی ٹھونس نہیں سکتے۔ جو الفاظ کسی نہ کسی سبب سے زبان کے اندر اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں اور عام طور پر رائج ہو جاتے ہیں وہی زبان کا جزو بن سکتے ہیں۔

دورِ حاضر میں حیدرآباد نے اُردو کو جس قدر فائدہ پہنچایا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور وہاں کی تعلیم نے جو بعض نئے ادیب پیدا کئے ہیں اُن کی قابلیت، طباعی اور ذہانت کی تعریف نہ کرنا انصافی ہوگا۔ لیکن ان میں سے بعض اصحاب نے موقع بے موقع اپنی تصانیف میں نئے الفاظ کی بھرمار کر دی ہے اور ان میں کثرت سے ایسے الفاظ ہیں جن کے لئے ہماری زبان میں نہایت موزوں اور فصیح الفاظ پہلے ہی سے موجود ہیں۔ اس طرزِ عمل سے زبان کو تو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچتا۔ ہاں اُن کی تصانیف ضرور ناقابلِ فہم بن جاتی ہیں۔

مثلاً ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے اپنی کتاب "روحِ تنقید" میں "کلاسیکل لٹریچر" کے لئے "دبستانی ادب" استعمال کیا ہے، اول تو کلاسیکل کے لئے ہمارے یہاں مستند اور قدیم ادب ایک مدت سے مستعمل ہے۔ دوسرے ڈاکٹر صاحب نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ قطعاً کلاسیکل کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا۔ دبستانی ادب سے زیادہ سے زیادہ یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ درسی ادبی کتابیں جو مدرسوں اور مکتبوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کلاس کے معنی مکتب یا جماعت کے سمجھے اور ان معنی میں یہ لفظ انگریزی میں اور خود ہمارے یہاں رائج بھی ہے لیکن کلاسیکل لٹریچر ایک ادبی اصطلاح ہے اور اس میں لفظ کلاسیکل کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ انگریزی زبان کے مستند ادیب اور نقاد میتھو ارنالڈ نے کلاسیکل کے معنی یہ لکھے ہیں:۔

"The work that belongs to the class of the best."

اور ولیم ہنری ہڈسن نے اپنی مشہور کتاب "این انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف لٹریچر" میں "کلاسکس" کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

A 'Classic' may be simply defined as a book which has stood the test of time, and by its stability and permanence, and the universality and persistency of its appeal, has given unmistakable assurance of immortal life."

ظاہر ہے کہ "دبستانی ادب" سے یہ مفہوم ہرگز واضح نہیں ہوتا۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب موصوف "بت تراش" کے لئے "مجسمہ ساز" لکھتے ہیں، بت تراش ہماری زبان میں ابتدا سے مستعمل ہے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

خدا ساز تھا آزرِ بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

"کامیاب" جیسا عام اور کثیر الاستعمال لفظ بھی ڈاکٹر صاحب کو پسند نہیں، اس کی جگہ آپ نے "کامگار" کو دیدی ہے۔ صناع کی جگہ آپ "فن کار" اور استقلال کی جگہ "دیرپائی" استعمال فرماتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بعض انگریزی محاوروں کا بھی لفظی ترجمہ کر دیا ہے، مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:-

"انھوں نے اُردو میں ایک خاص رنگ پیدا کیا اور ان کے رنگ میں ابتدا اور انتہا دونوں انھیں تک رہے"۔

یہ ترجمہ ہے "He was the first and the last" کا، یہ مفہوم اردو میں اس طرح ادا کیا جا سکتا تھا جو ہمارے روزمرہ کے خلاف نہ ہوتا۔

"اُنھوں نے اُردو میں ایک خاص رنگ پیدا کیا جو انھیں پر ختم ہوگیا"۔ یا یوں کہہ سکتے تھے "جو شروع بھی انھوں نے ہی کیا اور ختم بھی انھیں پر ہوگیا"۔

حیدر آباد کے نوجوان ادیبوں نے ایک اور دلچسپ ترجمہ "Bird's eye view" کا "طائرانہ نظر" کیا ہے، یہ ترجمہ نظر کو ضرور کھینچتا ہے لیکن جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ شاید اس کا مفہوم کسی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ دوسرے یہ کہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بھی ہمارے یہاں "سرسری نظر" مستعمل ہے، پھر کسی دوسرے لفظ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یا مثلاً ہمارے صوبہ کی مشہور نیم سرکاری جماعت "ہندوستانی اکاڈمی" نے "سہ ماہی" کے بجائے "ترماہی" کو رواج دینے کی کوشش کی ہے، سہ ماہی ایک مدت سے ہماری زبان میں مستعمل ہے اور ترماہی سے بدرجہا زیادہ فصیح اور خوش آواز ہے۔

بہ ظاہر اس لفظ کے جاری کرنے کی کوشش کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ ہندی اور اُردو قریب تر ہو جائیں۔ مقصد ضرور اچھا ہے لیکن رسالے کے سرورق پر صرف ایک ایسے فارسی لفظ کی جون بدل کر جو مدت سے ہماری زبان میں رائج ہے یہ مقصد کیونکر حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اسی رسالے میں یعنی "ہندوستانی" کے پہلے نمبر میں کثرت سے ایسے فارسی اور عربی الفاظ اور اُن الفاظ کی اجنبی ترکیبیں موجود ہیں جن کے بجائے اُردو کے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ مل سکتے تھے۔ مثلاً عمّال، تتبع، زاویہ نگاہ، طوائف الملوکی، عصبیت، نشاۃ الثانیہ، احتشام، اختلاف سوز، یگانگت انگیز، شمشیر ہیبت زا تمدن نوازی، خیالستان تہذیب، پرحزن آواز، پردۂ مستور، پرفکر شائستہ خیالی وغیرہ۔ میں اس قسم کے الفاظ اور ترکیبوں کو قطعاً ناجائز قرار نہیں دیتا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعض مواقع ایسے پیش آتے ہیں جہاں ان کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ جس رسالے کے اراکین ادارت "سہ ماہی" جیسے سادہ اور کثیر الاستعمال لفظ کو محض اس بنا پر ترک کر دینا چاہتے ہیں کہ اس میں "فارسیت" ہے

وہ خود اپنی تحریروں میں فارسی کی اجنبی اور غریب ترکیبوں کے استعمال کو کس اصول کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں خدانخواستہ ہندوستانی اکاڈمی کے مخالفوں میں ہوں، ہرگز نہیں، میرے نزدیک اپنی عمر کے پہلے چار سال ہی میں اکاڈمی نے نہایت عمدہ اور قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں اور اپنے وجود کو اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے لئے مفید ثابت کر دیا ہے۔ اسی طرح اکاڈمی کے آرگن "ہندوستانی" میں بھی اکثر مضامین نہایت پر مغز اور پر از معلومات ہوتے ہیں۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا مقصد محض ایک جزوی معاملہ پر نہایت خلوص نیت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار ہے۔

بہرحال میں نئے الفاظ کا ذکر کر رہا تھا، ایک اور نیا لفظ دکن کے ایک نئے رسالے کے سرورق پر دیکھا، "ماہوار" کی جگہ اس پر "ماہ نامہ" لکھا گیا ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے اردو کے جو اخبار ہر روز شائع ہوتے تھے وہ "روزانہ" اخبار کہلاتے تھے۔ چند سال سے ایران کے بعض اخباروں کی دیکھا دیکھی ہمارے اخبارات نے اس لفظ کی جگہ "روز نامہ" لکھنا شروع کیا چنانچہ اب آپ ہر روزانہ اخبار کے سرورق پر یہی لفظ پائیں گے۔ لیکن روزمرہ میں ابھی تک یہ لفظ داخل نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی جگہ وہی قدیم لفظ روزانہ مستعمل ہے۔ اب "روز نامہ" کے قیاس پر یہ جدت کی گئی ہے کہ ایک نیا لفظ "ماہ نامہ" گڑھ لیا، ممکن ہے آگے چلکر "ہفتہ نامہ" "سہ روز نامہ" "سہ ماہی نامہ" یا "تماہی نامہ" بہت سے نئے لفظ بن جائیں۔

خدا بخشے مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی بڑے طباع اور ذہین آدمی تھے اور "لفظ سازی" میں تو ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم نے اپنی قابل قدر کتاب "وضع اصطلاحات" میں صدہا نئے لفظ بنائے ہیں ان میں سب سے زیادہ دلچسپ نئے مصادر ہیں، مثلاً دفتر سے دفترانا، اشک سے اشکانا، برف سے برفانا، ثمر سے ثمرانا، جذبہ سے جذبانا، جسم سے جسمانا، حسن سے حسنانا، سرخ سے سرخانا، قطرہ سے قطرانا، قلم سے قلمانا، نظر سے نظرانا وغیرہ۔ ان مصادر کے پیش کرتے وقت مولانا نے اس اہم نکتہ پر غور نہیں کیا کہ جن اسما اور صفات سے یہ مصادر بنائے گئے ہیں وہ ایک طویل عرصہ سے ہماری زبان میں رائج ہیں، اگر ضرورت ہوتی تو یہ مصادر ان الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ یا کچھ عرصہ بعد ضرور زبان میں داخل ہو گئے ہوتے جس طرح دوسرے اسما و صفات سے مصادر بن کر رائج ہو گئے۔ اصل یہ ہے کہ ہر زبان میں لفظوں کی درآمد دبرآمد فطری طور پر ہوا کرتی ہے جن الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے وہ کچھ عجیب غیر محسوس اور نامعلوم طریقہ سے زبان میں آکر داخل ہو جاتے ہیں، جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا ہے یہ نہیں ہوا کرتا کہ ہم پہلے

سے الفاظ بنا کر لوگوں کو مجبور کردیں کہ وہ اپنی تحریر و تقریر میں ان الفاظ کو استعمال کریں، کوئی زبان لغتوں سے الفاظ حاصل نہیں کیا کرتی بلکہ لغت انہی الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں جو زبان میں جاری ہوں۔ ابھی چند سال کی بات ہے کہ جب اول اول "ایروپلین" ہمارے ملک میں آئے تو زبان کو ان کے لئے ایک لفظ کی ضرورت پڑی۔ ہمارے اخبارات و رسائل نے کوشش کی کہ ان کو "طیارہ" کہا جائے لیکن عوام نے اس لفظ کی طرف قطعاً توجہ نہ کی اور سب ایک زبان ہوکر "ایروپلین" کو "ہوائی جہاز" کہنے لگے، یہاں تک کہ خود اخبارات و رسائل کو اسی لفظ کے استعمال پر مجبور ہونا پڑا۔ اسی طرح ایران میں جب ریل چلی تو خود بادشاہِ وقت نے کوشش کی تھی کہ اس کو "کالسکہ بخاری" کے نام سے یاد کیا جائے اور تمام سرکاری کاغذات اور احکام میں ریل کے لئے یہی لفظ استعمال کیا گیا تھا، لیکن پبلک نے اس لفظ کو قبول نہ کیا اور عوام میں ریل کے لئے "ترن" رائج ہوگیا جو "ٹرین" کا مفرس ہے۔

ایران کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ شاید اب سے بہت مدت پہلے وہاں بھی بعض جدت پسند حضرات نے مروجہ اسما و صفات سے نئے مصادر بنانے کی کوشش کی تھی، اس امر کا اندازہ وہاں کے ایک مشہور اور خوشگو شاعر طرزی افشار کے کلام سے ہوتا ہے۔ طرزی نے از راہ تمسخر و ظرافت بہت سے نئے مصادر بنائے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے چند شعر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

تا ابروے تو دیدہ جنونیدہ ایم ما ۔۔۔ نشناختند خلق کہ چونیدہ ایم ما
قامت خمیدہ و دل چو نقطہ شد سیاہ داغ ۔۔۔ از عین و شین و قاف تو نونیدہ ایم ما

گر در فراق روے تو کاہیدہ ایم ما ۔۔۔ گہ چوں کتاں ز حسنِ تو ماہیدہ ایم ما
افتادہ دل بہ چاہِ زنخ ساقیا ز لطف ۔۔۔ حبل المتین زلف کہ چاہیدہ ایم ما

اگر بے تو ہر گز شرابیدہ باشم ۔۔۔ بکانونِ ہجرت کبابیدہ باشم
خور و خواب بر من حرامیدہ باشد ۔۔۔ اگر در غمت خورد و خوابیدہ باشم

از بلدۂ قزوین بہ صفاہاں سفریدم ۔۔۔ بے خرجی و بے اسپ خراماں سفریدم
یاراں سفریدند بہ جمعیت و من ہم ۔۔۔ یک قافلہ با جانِ پریشاں سفریدم

ترکیدم وتاتیدم وآنگہ عربیدم | در دینِ کوتہ نظراں بوالعجبیدم
شعباں رمضاں کرب وبلادم متعجب | بے آتش حجا دیدم وبے ناں رجبیدم

لیکن اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ میں اردو میں ایک سرے سے نئے الفاظ کے استعمال کا مخالف ہوں، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہماری زبان میں الفاظ موجود ہیں اس کے لئے کوئی نیا لفظ جاری کرنے کی کوشش کارآمد ثابت نہ ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ ایک زندہ زبان میں نئے الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے زیادہ تر نئے علوم کے لئے اصطلاحات کی صورت میں نئے الفاظ زبان میں داخل ہوتے ہیں۔ ادبیات میں یا زندگی کے معمولی واقعات وحالات کے بیان میں نئے الفاظ کی ضرورت صرف اسی وقت پڑتی ہے جب کہ موجودہ لفظ میں ثقل ہو یا پورے طور پر اس سے مطلب ادا نہ ہو سکے یا اظہار خیال کا کوئی ایسا پہلو اختیار کیا جائے جو بالکل نیا ہو اور اس کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے بعض مستعمل الفاظ کمزور یا بے بس ثابت ہوں، اصطلاحات علمیہ کے علاوہ اردو میں آجکل جن نئے الفاظ کے جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ان میں سے بھی بعض ضرور ایسے ہیں جو شاید زبان میں مستقل جگہ اختیار کرلیں گے اور ہمارے روزمرہ میں داخل ہو جائیں گے۔ مثلاً ایک لفظ ہے "شاہ کار" فارسی میں پہلے یہ لفظ "بیگار" کے معنی میں مستعمل تھا، اب جدید فارسی میں اسے انگریزی کی ادبی اصطلاح "ماسٹر پیس" کے معنی میں استعمال کرنے لگے ہیں اور اسی معنی میں ہم نے یہ لفظ فارسی جدید سے اردو میں اختیار کرلیا ہے، یہ بہت اچھا لفظ ہے اور شاید سب سے پہلے اسے رسالہ "معارف" اعظم گڑھ نے اختیار کیا تھا لیکن ہماری زبان کے اکثر ادبی رسائل نے اپنے تجارتی مقاصد کی بجا آوری کے لئے اس کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اب ہر رسالہ "بہتر سے بہتر شاہکار" پیش کر رہا ہے اور اس کا کوئی نمبر ایسا نہیں ہوتا جو بہترین شاہکاروں کا مجموعہ نہ ہو چنانچہ اس بے اعتدالی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی سے اس لفظ کی اہمیت اور اس کے معانی کا وقار کم ہونے لگا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں رفتہ رفتہ یہ لفظ اپنے قدیم معانی یعنی "بیگار" کی طرف عود کر رہا ہے۔ لفظ اچھا ضرور ہے لیکن اس کے استعمال میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے اور جس مخصوص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے یہ لفظ اختیار کیا گیا ہے اُس کو صرف اُسی تک محدود رکھنا چاہیئے۔

نئے الفاظ میں سے دو لفظ "حزنیہ" اور "طربیہ" بھی اچھے ہیں، یہ "ٹریجڈی" اور "کامیڈی" کے لئے اختیار کئے گئے ہیں اور جو مفہوم یہ ادا کرتے ہیں اس کے لئے ہماری زبان میں الفاظ موجود نہ تھے۔ یہ دونوں الفاظ مختصر بھی ہیں اور خوش آواز بھی۔

"پبلشر" کے لئے "ناشر" اور "پرنٹر" کے لئے "طابع" بھی ایسے الفاظ ہیں جو آسانی سے زبان میں داخل ہو جائینگے
مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم کے مصادر میں سے بھی دو چار ایسے ہیں جن کے لئے غالباً زبان میں جگہ
نکل آئیگی، مثلاً برق سے برقانا میرے نزدیک بہت اچھا مصدر ہے اور جو مفہوم اس سے ادا ہوتا ہے
اس کے لئے ہمارے یہاں کوئی لفظ موجود نہ تھا، منوّر کرنا اور روشن کرنا ان دونوں مصادر سے ضیا و نور کی
وہ شدت ظاہر نہیں ہوتی جو "برقانا" سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ استعارہ کے طور پر زیادہ وضاحت
اور صفائی کے ساتھ بیان کرنے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔

کچھ عرصہ سے ہمارے بعض مصنف خصوصاً بعض رسائل کے مضمون نگار صاحبان فارسی اور عربی
کے غریب اور اجنبی الفاظ اور ترکیبیں بے تکلف اُردو میں استعمال کر رہے ہیں، یہ بھی "لفظ سازی" کی
ایک صورت ہے، میرے نزدیک اس طرز کے مضامین لکھنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ
جن کے پاس خیالات کی کمی ہے اور وہ محض الفاظ کی نمائشی فوج سے اپنی عبارتوں کو شاندار بنانا چاہتے
ہیں، خیر یہ تو قابل توجہ نہیں کیونکہ ان کے عارضی "رنگ و بو" کا زبان پر کچھ اثر نہیں پڑتا، دوسرے وہ ہیں جن
کے خیالات میں جدید تعلیم نے وسعت پیدا کر دی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں دقت محسوس کرتے
ہیں اور نہایت نیک نیتی کے ساتھ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسری مشترک زبانوں سے الفاظ حاصل کر کے
اس کمی کو پورا کر دیں۔ اس دقت کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی زبان پر عبور حاصل نہیں ہے، ان کی عمر
کا زیادہ حصہ انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں صرف ہوا ہے۔ اردو زبان کے مستند اور قدیم ادب کے
مطالعہ کا انھیں موقعہ نہیں ملا اور وہ نہیں جانتے کہ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے انھیں دوسری زبانوں
کا دست نگر ہونا پڑتا ہے اس کے لئے خود ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سادہ اور سلیس الفاظ موجود ہیں۔
مطالعہ کا رواج ہمارے یہاں بہت کم ہو گیا ہے، یہ خامی صرف ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات ہی تک محدود
نہیں ہے بلکہ ہماری قوم کے اکثر نوجوان اپنی مادری زبان کے ادب کا مطالعہ نہیں کرتے، خود ہماری زبان
کے اکثر شعرا اسی مرض میں مبتلا ہیں، معدودے چند حضرات کو چھوڑ کر قریب قریب ہر جگہ کثرت سے ایسے شعرا
ملیں گے جنھوں نے اُردو کی مشہور اور مستند کتابوں کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے۔ جب یہ حالت ہے تو ظاہر ہے
ان لوگوں کو زبان پر کیونکر قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے سب سے اہم اور سب سے زیادہ ضروری
بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف کے ادبی کارناموں کا مطالعہ نہایت توجہ اور غور کے ساتھ کرنا چاہیئے اس
کے بعد ادبیات میں "مختارات" کا مسئلہ شاید زیادہ اہمیت اختیار نہ کریگا۔

سلطنت مغلیہ اور بنگال

از مسٹر ہری کرشن بی۔اے، ایل۔ٹی،

ہمایوں کی وفات کے بعد جب اکبر تخت سلطنت پر بیٹھا تو تمام ہندوستان مغلیہ حکومت کے دشمنوں سے بھرا پڑا تھا۔ بابر کی قلیل مدتِ حکومت اور ہمایوں کی بے سروسامانی کی وجہ سے مغل سلطنت کو استحکام حاصل نہ ہو سکا تھا۔ شیر شاہی رعب وداب کی آندھی نے بظاہر نئی سلطنت کے نازک پودے کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر عدم آباد کے راستہ پر ڈال دیا تھا۔ لیکن اکبر کی اعتدال پسندی اور صلح کل حکمت عملی سے پھر پرانی شاخوں میں نئے نئے کلّے پھوٹ نکلے اور دیکھتے دیکھتے مغل راج ایک تناور درخت بن گیا۔ اکبر کا ابتدائی زمانہ دشمنوں کے زیر کرنے میں صرف ہوا تھا، اسی سلسلہ میں تقریباً بیس سال تک اس کو فتح بنگال کے لئے متواتر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ۱۵۷۶ء میں داؤد خاں بنگال کا آخری پٹھان فرمانروا شکست کھا کر قتل ہوا اور بنگال ممالک محروسہ میں شامل ہو گیا۔ لیکن سلطنتوں کے تبادلہ سے دل تبدیل نہیں ہوتے۔ افغان سردار جو بظاہر مغل راج کے مطیع ہو گئے تھے، اندرونی طور پر اُس کے خلاف رہتے تھے جس کی وجہ سے اکبر اعظم کو اپنے تمام دورانِ حکومت میں اور نیز جہانگیر کو اپنے قیام حکومت کے کچھ حصہ تک اکثر پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ اسی زمانہ میں ہمارے ہیرو پرتاپ آدیتہ کا ظہور ہوا ہے۔ جس طرح رانا پرتاپ نے اپنی تمام عمر قیام آزادی کے لئے اکبر کے خلاف لڑائی میں صرف کر دی اسی طرح آدیتہ پرتاپ نے بنگال کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام زندگی وقف کر دی تھی۔

پرتاپ آدیتہ جیسور کے راجہ کا لڑکا تھا، لڑکپن کے زمانہ میں وہ مردانہ کھیلوں، شجاعانہ کرتبوں اور جنگجویانہ تفریحوں کا شائق تھا۔ اس کو داؤد خاں اور اس کے پٹھان ہمراہیوں کے جنگی کارناموں کے سننے کا بیحد شوق تھا، لیکن اس کے باپ کو اس کے جنگلی جذبات ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ سیدھا سادہ صلح کل اور مذہبی خیالات کا دلدادہ امن وعافیت پسند تھا۔ اس کو یہ کسی طرح منظور نہ تھا کہ بیٹھے بٹھائے مفت میں سلطنت مغلیہ کی دشمنی مول لے۔ وہ اپنے لڑکے

کے رویہ کو سخت ناپسند کرتا اور دل ہی دل میں اس کی جانب سے کڑھتا تھا۔ بہت غور وخوض کے بعد اُس نے یہ راہ نکالی کہ آدیتہ پرتاپ کو آگرہ بھیجدے تاکہ وہاں مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت سے مرعوب ہوکر وہ راہ راست پر آجائے اور اُس کو اپنے اُن ساتھیوں سے نجات حاصل ہوجائے جن کے دل مثل اس کے حب الوطنی کے جذبات سے پُر تھے۔ اور جو مثل داؤدخاں کے مغلوں سے لڑکر اپنے آبائی ملک بنگال کو اُن کی دستبرد سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ آدیتہ کو آگرہ روانہ کردیا گیا اور شنکر چکرورتی بھی جو اس کا ہمراز تھا اس کے ساتھ گیا۔ شہنشاہ اکبر اعظم نے نہایت فراخ دلی سے اِن کا خیر مقدم کیا، اور ان کی صاف گوئی اور شجاعانہ رویہ سے جن کا اظہار دوران قیام دارالخلافہ میں ہوا نہایت متاثر ہوا۔ اکبر اکثر پرتاپ سے اُن سرداران بنگال کے بارے میں تذکرہ کیا کرتا تھا جن کی متواتر بغاوتیں اُس کو چین نہ لینے دیتی تھیں۔ انھیں تذکروں کے دوران میں اکبر کے دل پر پرتاپ کی باتوں کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ اس نے اس کو جیسور کی حکومت کا فرمان شاہی عنایت کیا۔ اس کے عوض میں پرتاپ نے یہ وعدہ کیا کہ وہ تمام بقایا مالگذاری جو سالہا سال سے کسی طرح وصول نہ ہوتی تھی تحصیل وجمع کرکے شہنشاہ معظم کی خدمت میں روانہ کریگا

پرتاپ کی عدم موجودگی میں اس کے نوجوان ہمراہیوں نے اپنی جماعت کی باقاعدہ تنظیم کرلی تھی۔ اور بہت سے سرداران بنگال کو اپنا شریک کار بنالیا تھا۔ ان لوگوں نے خفیہ طور پر شاہی مالگذاریوں کی رقوم کثیر پر خوب ہاتھ صاف کیا تھا اور اس دستبرد سے کافی دولت فراہم کرلی تھی۔ ان کی جماعت میں بالخصوص جفاکش دیہاتی و کاشتکار شریک تھے جو عموماً شاہی عمال کے مظالم و جور وجفا کے نشانہ بنے ہوئے تھے۔ سرکاری عمال تحصیل لگان و مالگذاری کے لئے رعایا پر ہر ممکن سختی و تعدی روا رکھتے تھے جس سے رعایا نے بددل ہوکر اور بھی لگان و مالگذاری ادا نہ کرنے کا عزم بالجزم کرلیا تھا اور اس طرح خود غرض عمال کی بیجا حکمت عملی و کوتاہ اندیشانہ و فاشعاری سے سلطنت بجائے مستحکم ہونے کے زوال پذیر اور رعایا خوشحال و جاں نثار ہونے کے بجائے برباد و غدار ہوتی جا رہی تھی، اور سلطنت مغلیہ کے دشمنوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہورہا تھا۔ یہ سیاسی حالات تھے جس وقت پرتاپ شاہی فرمان لیکر بنگال واپس پہنچا اور اپنے والد بزرگوار کو جیسور کے تخت حکومت سے معزول کرکے اس وسیع ریاست پر قابض ہوگیا اور اپنے دوستان قدیم کی مدد سے مہاراجہ پرتاپ آدیتہ کا لقب اختیار کیا۔

جس زمانہ میں پرتاپ آگرہ میں مقیم تھا اس نے مغلیہ افواج کی ترتیب و تنظیم و نیز طریقہ جنگ کو بہت غور وخوض سے مطالعہ کیا تھا اور گجرات اور راجپوتانہ کا طویل و سخت سفر اختیار کرکے اس نے

وہاں کے سیاسی و دیگر حالات سے بھی بخوبی واقفیت حاصل کرلی تھی، نیز ان طریقوں سے کماحقہ، آگاہ ہوگیا تھا جن کی بدولت اکبر دور دراز صوبوں اور ماتحت و باجگذار راجاؤں پر نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا تھا، اس قدر وسیع تجربہ اور علمی معلومات سے مالا مال ہوکر جب پرتاپ نے حکمرانی شروع کی تو شروع ہی میں بھویاں سرداروں میں سے جن کی تعداد بارہ تھی اور جو بنگال کے نہایت ہی طاقتور سرداروں میں تھے زبردست ترین سرداروں کو اپنا شریک کار بنالیا۔ ان میں سے بعض لڑکر اور مفتوح ہوکر اس کے شریک ہوئے اور بعض بغیر کسی قسم کی جنگ وپیکار کے اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اس زمانہ میں روڈا نامی پرتگالی بحری ڈاکو کی قابلیت و جرأت کا سکہ اہل بنگال کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ دریائے گنگا کا ڈیلٹا اس زمانہ میں پرتگالی بحری ڈاکوؤں کا ملجا و ماویٰ تھا۔ ان کے باعث رعایا سخت عذاب میں مبتلا رہتی تھی مقامی حکام رعایا کی حفاظت کرنے کے قطعی ناقابل تھے چھوٹے چھوٹے سرداروں میں بنگال منقسم تھا جن کا وقت باہمی جنگ یا ذاتی تفریحات و مشاغل میں صرف ہوتا تھا، پھر یہ تھے خشکی کے شیران کا پرتگالی بحری نہنگوں سے کیا مقابلہ، وہ قہر خداوندی کی طرح نازل ہوتے، لوٹ مار کرتے اور رعایا کو زبردستی جہازوں میں ڈالکر دُور دراز ملکوں میں لیجاکر بطور غلاموں کے بیچ ڈالتے تھے

اراکان کے راجہ کا ان بحری ڈاکوؤں سے ناک میں دم تھا مگر وہ بھی فرمانروایان بنگال کی طرح بحری جنگ کے طریقوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اُن کی سرکوبی کرنے سے معذور تھا۔ ان لوگوں نے دریائے گنگا کے دہانہ پر سان دیپ نامی جزیرہ میں اپنی نوآبادی قائم کرلی تھی، جہاں پر گرفتار شدہ اہل بنگال کو غیر ممالک کو روانگی سے پیشتر بطور قیدیوں اور غلاموں کے رکھا جاتا تھا۔ یہاں پرتگالیوں نے ایک نہایت ہی مستحکم قلعہ بھی بنالیا تھا جہاں ان کا گولہ بارود و سامان حرب رہتا تھا اور جہاں وقت ضرورت پناہ گزین ہوتے تھے۔ یہ قلعہ اور نوآبادی روڈا و دیگر پرتگالی سرداروں کی جائے رہائش تھی۔ پرتاپ نے اپنے بہادر جاں نثاروں کے ساتھ ان پرتگالی بحری ڈاکوؤں سے جنگ کی اور ان کو شکست فاش دیکر روڈا کو گرفتار کرلیا جو آئندہ ہمیشہ تمام جنگوں میں پرتاپ کا دست راست ثابت ہوا۔

اکبر اعظم کی حکمت عملی پر عامل ہوکر پرتاپ نے بنگال کے ہندو و مسلمان حاکموں کی تعداد کثیر کو اپنا رفیق بنالیا اور تمام مقامات پر جو جنگی اہمیت رکھتے تھے بڑے بڑے قلعے تعمیر کرا دیے اس طرح ۱۵۹۰ء تک اس نے خفیہ طور پر اپنی طاقت کو نہایت مضبوط بنالیا لیکن با ایں ہمہ اس نے

سلطنت مغلیہ کے خلاف جنگ کی ابتدا اپنی طرف سے نہیں کی۔

ان ایام میں شیر خاں منجانب سلطنت مغلیہ بنگالہ کا گورنر تھا، اس نے ایک شخص موسومہ شنکر کو کسی قصور پر قید کر دیا لیکن شنکر کسی تدبیر سے جیل خانہ سے نکل بھاگا، شیر خاں بھی اُس کے تعاقب میں روانہ ہوا اور پرتاپ کی زمینداری میں داخل ہو گیا۔ اس پر پرتاپ نے اس سے جنگ کی اور شکست دیکر پسپا کر دیا۔ اس کے بعد پرتاپ نے سپت گرام کو فتح کیا جو جنوبی بنگال کا تجارتی مرکز تھا پھر اُس نے پٹنہ تک فتوحات کا سیلاب بہا دیا، اس طرح اچھے اچھے زمیندار برباد ہو کر حلقہ بگوش ہو گئے اور پرتاپ کے اشاروں پر کام کرنے لگے۔

جب یہ خبر اڑتی اڑتی اکبر تک پہونچی تو وہ بہت پریشان ہوا بلکہ غصہ سے اس کا تمام جسم تھرّا گیا، فوراً ہی اپنے مشہور سپہ سالار عظیم کو اس مہم پر بھیجا، پرتاپ نے راستہ دیا، عظیم اس چال کو نہ سمجھا اور کھلے بندوں موجودہ کلکتہ تک جا پہونچا، عظیم یہ سمجھا کہ غنیم اقتدار شاہی سے مرعوب ہو کر روپوش ہو کر بغیر لڑے بھڑے شکست سے ہم آغوش ہوا لیکن جب آنکھ کھلی تو خود کو گرفتار بلا اور چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں پھنسا پایا، تین طرف سے پرتاپ کی فوجیں حملہ آور تھیں اور دریا کی طرف سے روڈا اپنے جہازوں سے آتشباری کر رہا تھا۔ بالآخر عظیم غنیم کی چالوں کا شکار ہوا۔ وہ عزت و عظمت کے پھریرے اڑاتا آسمان سے باتیں کرتا آیا تھا لیکن اپنی کم فہمی سے معہ بیس ہزار سپاہ کے پیوند خاک ہوا

اس فتح عظیم سے پرتاپ کل بنگالہ کا فرمانروا ہو گیا۔ اراکان اور اڑیسہ کے راجاؤں نے اس کے ساتھ عہد نامے کئے۔ اس کے بعد وہ اپنی سلطنت کی تنظیم میں مصروف ہوا۔ اس کا حال مشہور پرتگالی سیاح فون سیکا[۱] نے حوالۂ قلم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پرتاپ کے زمانہ میں مذہبی آزادی کا ناقوس پھونکا جا رہا تھا۔ عیسی بہ دین خود موسیٰ بہ ایمان خود کا نقارہ بج رہا تھا۔ ہر شخص اپنی مذہبی روایات پر عمل کرنے پر خود مختار تھا۔ پرتگالیوں کو جیسور میں گرجا بنانے کی اجازت دی گئی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی رعایتیں کی گئیں، تجارت کی گرم بازاری تھی، رعایا آباد و خوشحال تھی، دربار علماء و شعراء سے بھرا ہوا تھا۔ حکومت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس پر پرتاپ نے ہاتھ رکھا ہو اور اُس نے ترقی نہ کی ہو۔ لیکن بقول انیس[۲]

دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری

[۱] Fonseca

[۲] सप्त ग्राम

یہ حالت بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی، اس طرف تو خود پرتاپ کے دربار میں بغض وحسد کے شکار بہت سے مار آستیں پیدا ہو گئے، دوسری جانب جب عظیم کی شکست وتباہی کا حال اکبر کو معلوم ہوا تو وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی وفات کے بعد جب جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہو کر سفید وسیاہ کا مالک ہوا تو اس نے دور اکبری کے شجاعت وتدبر کے آفتاب راجہ مان سنگھ کو بنگالہ کی مہم پر روانہ کیا پرتاپ نے مان سنگھ کو عظیم کی طرح بے خوف وخطر جنوبی بنگال کے دلدلی مقامات تک چلا جانے دیا، مگر وہاں پہونچتے ہی برسات شروع ہو گئی تو پرتاپ نے راجہ مان سنگھ کی فوج کی رسد بند کر دی اور وسائل آمد ورفت مسدود کر دیے۔ فوجیں گرسنگی اور برساتی وبائی امراض کے جنگل میں تڑپنے لگیں۔ مان سنگھ مصائب کے گرداب میں مایوسی کے عالم میں ہاتھ پیر مارنے لگا اور عظیم کی حسرت خیز موت کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی، اگر کچھ عرصہ یہی حالت اور رہتی تو مان سنگھ بھی مع کل فوج کے راہی عدم ہوتا۔ مگر عین اس موقعہ پر پرتاپ کے خاص معتمد علیہ بھوانند نے دغا کی۔ مان سنگھ نے اس کے دلی منشاء کو معلوم کر کے فوراً ہی اس سے سازباز کیا، اس دغابازی وسازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھوانند نے تمام غلہ کا ذخیرہ مان سنگھ کے حوالہ کر دیا، اب کیا تھا مغلیہ فوج کے دل بڑھ گئے، اور انھوں نے تازہ دم ہو کر جیسور پر دھاوا بول دیا، لیکن پرتاپ کی جائے رہائش کا پتہ جو جنگلوں میں تھی کسی طرح نہ چلتا تھا۔ مان سنگھ سازش وتدبر سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں مصروف تھا، آخر پرتاپ کا ایک خاندانی بھائی جو اس کی عظمت کو دیکھ کر آتش حسد سے جل رہا تھا مان سنگھ سے مل گیا اور ایک دن مان سنگھ کے معتمد سرداروں کو پیٹ کے بل جھاڑیوں میں سے نکال کر لے گیا اور پرتاپ کا قلعہ اور وہاں آنے جانے کے تمام پوشیدہ وخفیہ راستے دکھا دیے۔ پھر کیا تھا مان سنگھ نے یکایک حملہ کر دیا اور شمع آزادی کا پروانہ پرتاپ اپنے ہی مار آستینوں کا شکار ہو کر اپنے جاں نثاروں کے ہمراہ لڑتا ہوا میدان جنگ میں کام آیا اور اس طرح بنگال سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا۔

علامہ محسن کاکوروی[۵۷]

(از جناب طاہر محسن صاحب)

مولانا محمد محسنؒ محسن کاکوروی مولوی ہادی علی اشک مرحوم کے شاگرد تھے۔ اول مین پوری میں چند دنوں عہدۂ نظارت پر کام کیا پھر بعض حکام اور اکثر احباب کی تحریک سے وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس زمانے میں صدر دیوانی عدالت آگرہ میں تھی چنانچہ آپ نے بھی آگرہ ہی میں پریکٹس شروع کی۔ مگر غدر کے ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد مین پوری میں قیام اختیار کیا اور وہیں وفات پائی۔

مولانا محسن کا قد میانہ رنگ گندمی اور چہرہ گول تھا۔ چہرہ پر چیچک کے چند داغ بہت خفیف تھے۔ داڑھی مختصر تھی اور خضاب لگاتے تھے۔ انتقال سے چند سال پیشتر داڑھی بڑھا لی تھی اور خضاب ترک کر دیا تھا آواز میں نرمی اور ملائمت خلقی تھی۔ مولانا محسن کے کلام کا بیشتر حصہ نعت میں ہے۔ چونکہ آپ کو شہرت وعزت اور شاعرانہ وقعت اور دنیاوی صلے کی خواہش نہ تھی اس لئے آپکی نظم سے خلوص عقیدت کا رنگ ٹپکتا ہے۔ گل وبلبل کے پیش پا افتادہ مضامین سے آپ احتراز کرتے تھے۔ مبالغہ واستعارہ کو نہایت خوبی سے نظم کرتے تھے۔ مضامین کی بلندی، الفاظ کا شان وشکوہ، بندش کی چستی، تشبیب وگریز اور خاتمہ ومناجات میں خاص طرز کے موجد تھے۔ آپ کی چند تصانیف کا ذکر درج ذیل ہے۔

۱۔ سراپائے رسول اکرم (سنہ ۱۲۶۶ ہجری) ایک نئے انداز کا سراپا لکھا ہے، اس کا خاتمہ بھی نئے انداز کا ہے

ہے یہ امید کہ جب گرم ہو بازار نشور ۔۔۔ خود کہے بادشہ بارگہ عالم نور
لو سراپا ہمیں تم دو عوض حور و قصور ۔۔۔ میں کہوں واہ مجھے یہ نہیں ہرگز منظور

مفت حاضر ہے مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں بکے یوسف کی یہ تصویر نہیں

۲۔ ابیات نعت (سنہ ۱۲۷۴ ہجری) اس قصیدے کی تضمین حضرت امیر مینائی مرحوم نے بھی کی ہے،

[۵۷] تاریخ ولادت سنہ ۱۲۴۲ ہجری، تاریخ وصال ۱۸ صفر سنہ ۱۳۲۳ ہجری

اور خوب تضمین ہے۔

۳۔ چترِ شہنشاہی (۱۲۷۴ہجری) یہ مسدس ایک عزیز دوست کی طرف سے واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی مدح میں کہا تھا، جس کے چند بند ہدیۂ ناظرین ہیں۔

عزیزِ مصر جب تک مشتری ہو مہر قیصر ہو ۔۔۔ قمر پرویز زہرہ مثلِ شیریں ناز پرور ہو
دبیرِ چرخ توقیعات میں کسریٰ کا ہمسر ہو ۔۔۔ ہو کیواں مثل کے مریخ بہرامِ دلاور ہو
الٰہی جانِ عالم بادشاہِ ہفت کشور ہو
فلک پر سات اختر ہیں زمیں پر ایک اختر ہو

رہے جب تک بکامِ تشنہ کاماں رحمتِ باری ۔۔۔ رہے برسات میں ہر جا پہ سوچھائی ہوئی بدلی
متاعِ کاروانِ ابر گوہر بار ہو پانی ۔۔۔ کنویں میں آبِ شیریں ہو بجائے یوسفِ مصری
ترا فیض اے سحابِ مرحمت ہر دم فزوں تر ہو
کنواں ہو، نہر ہو، گنگا ہو، قایم ہو، سمندر ہو

ہے جب تک ہمتِ لشکر کشی فغفور و خاقاں میں ۔۔۔ رہے خونریزی کا نقشہ دماغِ کجکلاہاں میں
کمالِ جوہرِ شمشیر سازی ہو صفاہاں میں ۔۔۔ چلے تیغِ پری پیکر پری کی چال میداں میں
تو اعدا پر مظفر اور ترا اللہ یاور ہو
کمر میں ذوالفقار اور بازوؤں میں زورِ حیدر ہو

رہے تاثیرِ حسنِ پاک جبتک طورِ سینا میں ۔۔۔ عزیزِ مصر بے کنعاں رہے مشہور دنیا میں
اُتارا ہو پریزادوں کا دل میں چشمِ بینا میں ۔۔۔ ہو ذکرِ گوپیاں گوکل میں، بندرابن میں متھرا میں
تو محبوبِ جہاں اے یوسفِ پاکیزہ منظر ہو
کنہیا برج والوں میں، پریزادوں میں اندر[1] ہو

۴۔ مثنوی صبحِ تجلی (۱۲۸۹ہجری) اس میں نئے انداز سے حضور اکرم کی ولادت باسعادت کا حال بیان کیا ہے۔

۵۔ فغانِ محسن (۱۲۸۹ہجری) یہ مثنوی اپنے ایک دوست کی ہمدردی میں اپنی بیماری کے بعد لکھی تھی۔

۶۔ نگارستان جسکو "پیاری باتیں" بھی کہتے ہیں (۱۲۹۳ہجری) اس میں حضرت محسن نے عشق و محبت کی سچی تصویر کھینچی ہے۔ ایک جگہ محبوب اپنے محب سے اس طرح خطاب کرتا ہے۔

نہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری ۔۔۔ ہائے کیا ہو گئی حالت تیری
اڑ گیا رنگ ترا لہو ہو کر ۔۔۔ بہ گیا خون دل آنسو ہو کر

[1] واجد علی شاہ کا تخلص ہے

چہرہ ڈوبا ہوا حیرانی میں	عرق آیا ہوا پیشانی میں
زردی چھائی ہوئی رخساروں پر	سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر
چھپ گیا چاند ستارا ہو کر	اُڑ گیا آئینہ پارا ہو کر
بند آنکھیں کئے روتا دیکھا	رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا
دیکھ بھر آئیں تری بھر آنکھیں	یاد آئیں کوئی کافر آنکھیں
خون میں ڈوبی نگاہیں کیسی	ہیں مری جان یہ آہیں کیسی
جال پھیلائے ہیں منتر والے	بال کھولے ہوئے گھونگر والے
جان لیتے ہیں نکھرنے والے	تم سلامت رہو مرنے والے
بیٹھے بٹھلائے یہ سودا تجھکو	کیا ہوا میرے کنھیا تجھکو
دل لگا ہے تو پشیمانی کیوں	جان کی فکر مرے جانی کیوں
ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو	تم تو بے مے پیئے متوالے ہو
سنو کہیں ایک نہ مانی آخر	مٹ گئی تیری جوانی آخر
چاندنی پچھلے پہر کی کب تک	روشنی شمع سحر کی کب تک
تھام لے دل تجھے دلبر کی قسم	سر اُٹھا تجھکو مرے سر کی قسم
دوستانہ تجھے سمجھاتے ہیں	نہیں سنتا ہے تو ہم جاتے ہیں

۷۔ مدیح خیر المرسلین (۱۲۹۳ہجری) یہ وہ لامیہ قصیدہ ہے جس نے حضرت محسن کے کمال کو ہندوستان میں مسلم کردیا، اس میں ہندوستان کی برسات سے تشبیب شروع ہوتی ہے، چند اشعار منتخب یہاں لکھے جاتے ہیں:۔

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی	پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
راکھیاں لیکے سلونوں کی برہمن نکلیں	تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
اب کی میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا	نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل
ڈوبتے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے	نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
قمریاں کہتی ہیں طوبیٰ سے مزاج عالی	لالہ و باغ سے ہندوے فلک ہیم وکسل
نور کی تیلی ہوئی پردۂ ظلمت میں نہاں	چشم خورشید جہاں بیں میں ہیں آثار سبل
شب دیجور اندھیرے میں ہے بادل کے نہاں	لیلی محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پر آنچل

جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبھوت	یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمل
لہریں لیتا ہے جو بجلی کے مقابل سبزہ	چرخ پہ بادلہ پھیلا ہے زمیں پر مخمل
سبزۂ خط ہے ہوا ہونے لگی سرخی لب	چمن حسن سے لال اڑ گئے بن کر ہریل
پھول ٹوٹے ہوئے پھرتے روشوں پہ ہیں نسیم	یا سڑک پر ہیں ٹہلتے ہوئے گلگوں کوتل

۸۔ چراغ کعبہ (۱۳۱۰ھ ہجری) اس میں واقعہ معراج کو نظم کیا ہے۔ براق کی تعریف میں شعر ہے ؎

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل	کھیت اس کا بہشت خلد جنگل

تیسرے آسمان کی سیر میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، لہذا سرکار دو عالم کا سراپا نئے انداز کا لکھا ہے:۔

اس گردن صاف کی بلندی	تکبیر فریضۂ سحر کی
رعنائی قامت مناسب	روزے ہیں اذان وقت مغرب

بہشت کی تعریف میں کیا لاجواب شعر فرمایا ہے ؎

کیا کیجئے بیاں صفت فضا کی	پھلواری جناب کبریا کی

مقام اعلیٰ پر پہونچے تو کس انداز سے شاعرانہ رنگ میں نئے قسم کے مضامین بیان کئے ہیں ؎

بے سایہ قد رسول باری	تھا سایۂ نخل خاکساری
سجدے کے لئے جھکا ہوا تھا	سر عرش پر اور زمیں پہ ماتھا
پتلی میں جما جمال دلخواہ	جس طرح چھپے پہ قل ہو اللہ

۹۔ **مثنوی شفاعت و نجات** (۱۳۱۱ھ ہجری) اس کا ہر عنوان تاریخی مادہ ہے

۱۰۔ **حشر وحشت افزا** (۱۳۱۱ھ ہجری) یہ مثنوی بھی آپ اپنی نظیر ہے اسمیں قیامت کا حال اور وہاں کی پریشانیاں ظاہر کی ہیں۔ چند شعر ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

اڑا پہلے رنگ اب ہے اڑنا محال	بچھا ایک اچھا رنگ گل کا جال
ہوئی رونق دہر خانہ خراب	وہی چرخ مینا وہی آفتاب
یہ مرقد کا سانچہ اُبلنے لگا	کہ ہر جسم گل گل کے ڈھلنے لگا
نہ سوجھا زمانے کا کیا ہے چلن	ہوا چشم مردم میں جالا کفن
نکل آئے عریاں نئے روپ میں	چلے اُٹھ کے تہ خانے سے دھوپ میں
محبت ہوئی قیس سے ناامید	لہو ہو گیا کوہکن کا سفید
یہ بے الفتی ہے خدا کی پناہ	کہ کعبہ بھی قبلے کی بھولا ہے راہ

آنریبل سرشاہ محمد سلیمان

(چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ)

آنریبل سرشاہ محمد سلیمان صاحب چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کی تقرری کی خبر ہندوستان کے طول وعرض میں بڑی مسرت سے سُنی گئی، آپ پہلے مسلمان اور دوسرے ہندوستانی ہیں جو اس منصب جلیلہ پر فائز ہوئے ہیں۔ چنانچہ زمانہ میں آپ کے حالات زندگی اور مشاغل کا بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

سرشاہ محمد سلیمان صاحب ۳۔فروری ۱۸۸۶ء کو بمقام جونپور پیدا ہوئے، صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع میں آپ کا خاندان بڑی عزت و وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ثانی کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد میں علم وتصوف کا خاص چرچا تھا۔ شاہ کرم دیوان صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کا مزار بھیرہ ضلع اعظم گڈھ میں ہے سلسلہ نقشبندیہ کے نامور بزرگ اور حضرت ملا محمود صاحب (مصنف شہرہ آفاق کتاب شمس بازغہ) اسی خاندان کے شمس وقمر تھے۔ سرشاہ محمد سلیمان صاحب کے والد محترم مولوی شاہ محمد عثمان صاحب مرحوم اپنے زمانہ کے ایک ممتاز وکیل تھے۔ آپ جونپور میں وکالت کرتے تھے مگر تمام صوبہ متحدہ آگرہ واودھ میں جہاں کہیں شرع محمدی کی اہم گتھیوں کے سلجھانے کی ضرورت ہوتی آپ ہی کو دعوت دی جاتی۔ چنانچہ آپ کے انتقال کے وقت پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی نے فرمایا تھا کہ "آج قانون کا ایک زبردست ماہر ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا ہے۔" سرشاہ محمد سلیمان صاحب نے اپنے فاضل پدر بزرگوار کی صحبت میں آنکھیں کھولیں، چند ہی سال کے اندر آپ نے عربی وفارسی کی درسی کتابیں ختم کرکے انگریزی شروع کی، حضرت مولانا ومرشدنا شاہ عبدالعلیم صاحب آسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز شاہ محمد سلیمان صاحب کے سر پہ ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ یہ ہونہار بچہ دنیا میں آفتاب بنکر چمکے گا۔ چنانچہ ان دعائیہ کلمات کا حرف حرف صحیح ثابت ہوا۔ آپ نے بہت ہی کم سنی میں میٹرک کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا تھا۔ اس امتحان میں تمام صوبہ میں آپ چہارم نمبر پر کامیاب ہوئے تھے۔ آپ کے علمی ذوق کا یہ حال تھا کہ ریاضی کے دقیق مسائل کے حل کرنے میں جب آپ مشغول ہوتے تھے تو اپنے کمرہ سے آٹھ دس گھنٹہ تک

باہر نہ نکلتے تھے اور ریاضی سے آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ انٹرینس کے بعد شاہ صاحب ممدوح الہ آباد یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ایف۔ اے کا امتحان بھی اول درجہ میں پاس کیا، اور بی۔ اے میں تمام یونیورسٹی میں اول نمبر پر پاس ہوئے، اس امتحان میں بھی آپ کا خاص مضمون ریاضی تھا۔ بعدہٗ ۱۹۰۶ء میں آپ گورنمنٹ سے تعلیمی وظیفہ حاصل کر کے انگلستان تشریف لے گئے جہاں آپ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اور وہاں سے ایم۔ اے اور قانون کی ڈگری حاصل کی اور ڈبلن یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری لیکر ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس آئے۔ آپ سول سروس کے امتحان میں بھی شریک ہوئے تھے مگر انتخاب میں نہ آنے پر آپ نے قانون کی طرف توجہ کی، اگر آپ سول سروس میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو آج کسی ضلع میں کلکٹر یا کمشنر ہوتے مگر وہ ناکامیابی ڈاکٹر صاحب کے لئے عین کامیابی ثابت ہوئی۔ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہو کر آپ تمام صوبۂ متحدہ کی عدالت دیوانی کے حاکم اعلیٰ ہو گئے ہیں۔

حکومت کی دو شاخیں ہیں انتظامی و عدالتی (ایگزیکیوٹیو و جوڈیشل) اول الذکر کا حاکم اعلیٰ گورنر ہوتا ہے اور دوسری کا چیف جسٹس ہائی کورٹ۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سر شاہ محمد سلیمان صاحب نے ہندوستانیوں میں نادر اعزاز حاصل کیا ہے۔

بہر حال ۱۹۱۲ء میں وطن تشریف لانے پر شاہ صاحب نے جونپور ہی میں اپنے والد محترم کے ساتھ وکالت شروع کی مگر ایک سال کام کرنے کے بعد آپ ہائی کورٹ میں منتقل ہو گئے اور تھوڑی ہی مدت میں ہائی کورٹ الہ آباد کے قانون داں حضرات کی اول صف میں آ گئے۔ ۱۹۱۹ء میں آپ قائم مقام جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں مستقل جج ہو گئے اور ۱۹۲۹ء میں نائٹ کا خطاب حاصل کیا۔ آپ نے اپنے فرائض منصبی بڑی جفاکشی، آزادی اور غیر جانبداری سے انجام دیے۔ یہ بات اکثر و بیشتر مشاہدہ میں آ چکی ہے کہ شاہ صاحب قانون کے دقیق سے دقیق مسئلہ کو بڑی آسانی سے عام فہم بنا دیتے ہیں۔ آپ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ صرف چونتیس ۳۴ برس کی عمر میں مستقل جج ہائیکورٹ ہو گئے۔ آپ کے تعلقات بار اور بنچ دونوں کے ساتھ ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۶ مارچ کو جب آپ نے اپنے جلیل القدر عہدہ چیف جسٹس کا چارج لیا تو ہر طبقہ کے ہندو مسلمانوں میں خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اعلان تقرری کے وقت بھی آپ کے پاس ملک کے ہر گوشے سے صدہا تار اور خطوط مبارکباد کے آئے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف چھیالیس ۴۲ سال ہے، ہمارا خیال ہے کہ بہت ہی کم اصحاب کو اس عمر میں ایسا اعلیٰ اعزاز نصیب ہوا ہوگا۔

قانون کے علاوہ سر شاہ محمد سلیمان صاحب کو تعلیمی، ادبی اور معاشرتی مسائل سے بھی غیر معمولی دلچسپی ہے

چنانچہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی اصلاح و ترقی میں شاہ صاحب نے وہ بے نظیر خدمت انجام دی ہے جس کی مثال دور حاضرہ میں کمیاب ہے۔ چند سال سے مسلم یونیورسٹی کا نظام خراب ہو رہا تھا اور مالی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ آخر کار بیگم صاحبہ بھوپال نے سر ابراہیم رحمت اللہ صاحب (موجودہ صدر اسمبلی) کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر فرمایا۔ کمیشن کی رپورٹ مرتب ہونے اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی برطرفی کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ کمیشن کی مجوزہ اصلاحات کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے۔ آخر کار یہ اہم خدمت سر سلیمان صاحب کے سپرد ہوئی اور آپ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ تقریباً ایک سال تک برابر ہر ہفتہ شاہ صاحب الہ آباد سے علیگڈھ جاتے رہے اور ہائیکورٹ کی تعطیل کے زمانہ میں بھی آپ نے برابر علی گڈھ ہی میں قیام کر کے یونیورسٹی کی خدمت انجام دی۔ اس سلسلہ میں آپ نے اپنے عزیز وقت اور روپیہ کی وہ قربانی کی ہے جس کی مثال مسلمان لیڈروں میں بہت کم ملیگی۔ بہر حال آپ نے مسلم یونیورسٹی کو استوار اصولوں پر قائم کر کے حکومت اور پبلک میں مقبول عام بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سابق وائسرائے ہند اور گورنر صوبہ متحدہ نے آپ کی شاندار اہم خدمات کا علانیہ اعتراف کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سلیمان نے اس آڑے وقت پر دار العلوم علیگڈھ کی جو خدمت انجام دی ہے اس کے احسان سے مسلمانان ہند کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں۔ آپ نے حکومت ہند کے اعلیٰ افسران سے بھی ملکر یونیورسٹی کے لئے پندرہ لاکھ کی امداد منظور کرائی جو سالانہ قسطوں کی صورت میں ابتک مل رہی ہے

آپ نے کئی مرتبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے فرائض بھی نہایت خوبی و کامیابی سے انجام دیے۔ کانفرنس مذکور کے شعبۂ اصلاح و تمدن کے صدر کی حیثیت سے شاہ صاحب نے ۱۹۲۵ء میں بمقام مدراس ایک قابل قدر جامع خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں اصلاح معاشرت کے جملہ پہلوؤں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ خانگی زندگی کی اصلاح اور صنف نازک کی صلاح و ترقی کے مسائل سے شاہ صاحب کو خاص دلچسپی ہے۔ اپنی اصلاحی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے آپ نے انگریزی اور اردو میں ریفارمر نام سے ایک اخبار الہ آباد سے اپنی نگرانی میں جاری فرمایا۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ کے بھی ایک ممتاز رکن ہیں اور یونیورسٹی مذکور کے کاموں میں برابر عملی حصہ لیتے رہتے ہیں

ان علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ سر شاہ محمد سلیمان صاحب کو خاص ادبی ذوق بھی ہے۔ آپ ہندوستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ کے نہایت سرگرم رکن و رہنما ہیں اور ادبی کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۱ء

کی صدارت کرتے ہوئے ہندی اور اُردو زبانوں کی اصلاح و ترقی پہ آپ نے ایک بلند پایہ خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ اکیڈیمی کا ہر شعبہ آپ کی امداد اور رہنمائی کا رہین منت ہے۔

شاہ صاحب کے والد محترم مولوی شاہ محمد عثمان صاحب عربی و فارسی کے جید عالم تھے، شعر و سخن سے بھی آپ کو خاص دلچسپی تھی، آپ کی کئی ایک مثنویاں اور غیر مطبوعہ دیوان اردو سر سلیمان صاحب کے پاس موجود ہے۔ حضرت مولانا آسی رحمۃ اللہ علیہ جب کوئی غزل ارشاد فرماتے تو مولوی عثمان صاحب مرحوم کو سب سے پہلے سناتے۔ ان دونوں بزرگوں میں ایسی بے تکلفی تھی کہ ایک ایک مصرع اور الفاظ کی نشست پر پہروں بحث رہتی تھی۔ حفیظ جونپوری اور متعدد شعرا ہر وقت مولوی صاحب موصوف کی صحبت میں رہتے تھے۔ ایسی ادبی صحبت میں پرورش پانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آنریبل سر شاہ محمد سلیمان کو بھی اردو ادب سے خاص ذوق ہے۔ چنانچہ اردو اور فارسی ادب کی نایاب کتابوں کا ایک ذخیرہ آپ نے جمع فرمایا ہے۔ زبان اُردو کے رسالوں میں زمانہ کانپور، ادبی دنیا لاہور، اور معارف اعظم گڈھ آپ ہمیشہ مطالعہ کرتے ہیں اور حسب فرصت آپ نو طبع ادبی کتابوں پر نوٹ و حواشی بھی لکھتے رہتے ہیں۔ کوئی رسالہ یا کتاب اُٹھا کر دیکھئے جا بجا نشانات اور نوٹ نظر آئینگے آپ اہل ادب اور شعرا کی بڑی عزت فرماتے ہیں۔ ہر سال ہندوستانی اکیڈیمی کی ادبی کانفرنس اور مسلم ہوسٹل کے مشاعرہ کے موقع پر ایک مختصر اور محدود اہل ادب اور شعرا کی محفل شاہ صاحب کی قیام گاہ پر بھی منعقد ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کے ادبی ذوق کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے مثنویات میر انتخاب غزلیات میر، انتخاب قصائد ذوق کے تین مجموعے مرتب فرمائے ہیں اور ہر ایک پر مختصر دیباچہ اور نوٹ بھی تحریر کئے ہیں۔ یہ مجموعے بداپوں کے مشہور نظامی پریس میں طبع ہو کر شائع ہو گئے ہیں۔ ان انتخابات کے مطالعہ سے آپ کے علمی ذوق کا پورا پتہ چلتا ہے۔ اُردو شعرا کا کلام انھیں اصولوں پہ انتخاب کیا جائے تو اُردو ادب کے لئے بہت ہی مفید ہو۔

الہ آباد کی ہر علمی اور معاشرتی اصلاح کی تحریکوں میں آپ اور لیڈی سلیمان صاحبہ برابر علی حصہ لیتی رہتی ہیں۔ لیڈی سلیمان صاحبہ طبقۂ نسواں کی اصلاح اور تعلیم کے وسائل کی بہم رسانی کے لئے ہر وقت کوشاں رہتی ہیں، آپ الہ آباد کے زنانہ کلب کی صدر ہیں۔ زچہ و بچہ کی نگہداشت کی غرض سے جو مختلف مرکز الہ آباد میں قائم ہوئے ہیں اُن کی ترقی اور مقبولیت کے لئے لیڈی صاحبہ محترمہ ہمہ وقت کوشاں رہتی ہیں۔ سر سلیمان صاحب نے "لنڈنی عید" کی ہر سال تحریک کی بھی بنیاد ڈالی ہے جس کے ضمن میں

الہ آباد میں عید الفطر اور عید الاضحی کے مواقع پر ایک ڈنر ترتیب دیا جاتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان معززین شریک ہو کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔ اس طرح پر ہندوستان کے دو بڑے طبقے یکجا جمع ہوتے اور خورونوش میں شریک ہو کر اخوت انسانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ تحریک متحدہ قومیت ہند کے حق میں نہایت مفید ثابت ہو رہی ہے۔

سر شاہ محمد سلیمان صاحب کا اخلاق بہت وسیع ہے۔ ہر شخص کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی اور تپاک سے پیش آتے ہیں۔ آپ کی صحبت میں چند منٹ گزارنا گوناگوں دلچسپیوں کا موجب ہوتا ہے۔ ایک ہی بار کی ملاقات اور چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد ہر شخص یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ مجھ سے زیادہ بے تکلف کوئی دوسرا شاہ صاحب کی خدمت میں نہیں ہو سکتا۔ سچ ہے انسان کا ظاہری اخلاق اسکی دلی شرافت کا آئینہ ہوتا ہے اور جوہر شرافت اپنی حقیقی جھلک دکھلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سر شاہ محمد سلیمان صاحب چار بھائی اور ایک بہن ہیں اور شاہ صاحب سب میں بڑے ہیں۔ آپ سے چھوٹے شاہ محمد سفیان صاحب جونپور میں قیام رکھتے ہیں اور جائداد خاندانی کے انتظام و انصرام میں مشغول رہتے ہیں، دوسرے بھائی شاہ محمد سلمان صاحب الہ آباد میں وکالت کرتے ہیں اور تیسرے شاہ محمد حبیب صاحب ابھی زیر تعلیم ہیں۔ آپ کے تین صاحبزادے اور ایک دختر نیک اختر ہیں جن کے نام شاہ احمد سلیمان، شاہ محمود سلیمان اور شاہ حامد سلیمان اور سلمہ بی بی ہیں۔ یہ سب بچے الہ آباد کے مختلف انگریزی اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔

سر سلیمان صاحب کے گزشتہ کارناموں کو مدنظر رکھکر یقین ہے کہ آپ چیف جسٹس عدالت عالیہ کے اہم فرائض بھی نہایت خوبی و کامیابی سے انجام دینگے اور یہ حقیقت بہت ہی جلد دنیا پر روشن ہو جائیگی کہ ہندوستانی بڑے سے بڑے اور اہم ذمہ دار عہدہ کے فرائض کی انجام دہی کی اہلیت رکھتے ہیں۔

بلبل ہند سروجنی نیڈو کے چند نغمے

(مترجمہ مسٹر ظفر قریشی دہلوی، بی۔اے)

ایک دیہاتی گیت

میرے گھڑے بھرے ہوئے ہیں اور منزل دور، طویل اور سنسان ہے۔
آہ! میں کشتی والے کی بانسری سنکر اس قدر مدہوش کیوں ہوگئی تھی!
افسوس مجھے کیا ہو گیا تھا؟
رات کے تاریک سائے بھوتوں کی طرح آہستہ آہستہ زمین پر چھارہے ہیں۔
آہ! ذرا سننا تو! کیا یہ سفید پرندوں کی آواز ہے
کیا یہ اُلّو کی آواز آرہی ہے!
اس وقت تو مسافر نواز چاند کی ٹھنڈی کرنیں بھی نہیں ہیں!
اور راستہ تاریک اور بھیانک ہے!
آہ اس اندھیرے میں کہیں کوئی سانپ نہ کاٹ لے!

رام رے رام! میں تو مر جاؤنگی — آہ!!
میرا بھائی اپنے دل میں کیا کہیگا کہ آج کہاں رہ گئی؟
میری ماں انتظار کرتے کرتے تھک کر رو رو کر کہتی ہوگی کہ ہے پرماتما! میری بیٹی کو صحیح سلامت پہنچادے
آج جمنا اس قدر چڑھی ہوئی ہے۔

جمنا کا پانی دیوانہ وار چڑھ رہا ہے
رات کی تاریکی بھی اس طرح بڑھ رہی ہے جیسے کوئی سیاہ پرندہ اپنے پر پھیلائے ہو۔

ہز ہائی نس جام صاحب نوانگر چانسلر
چیمبر آف پرنسس ۱۹۳۲ ع
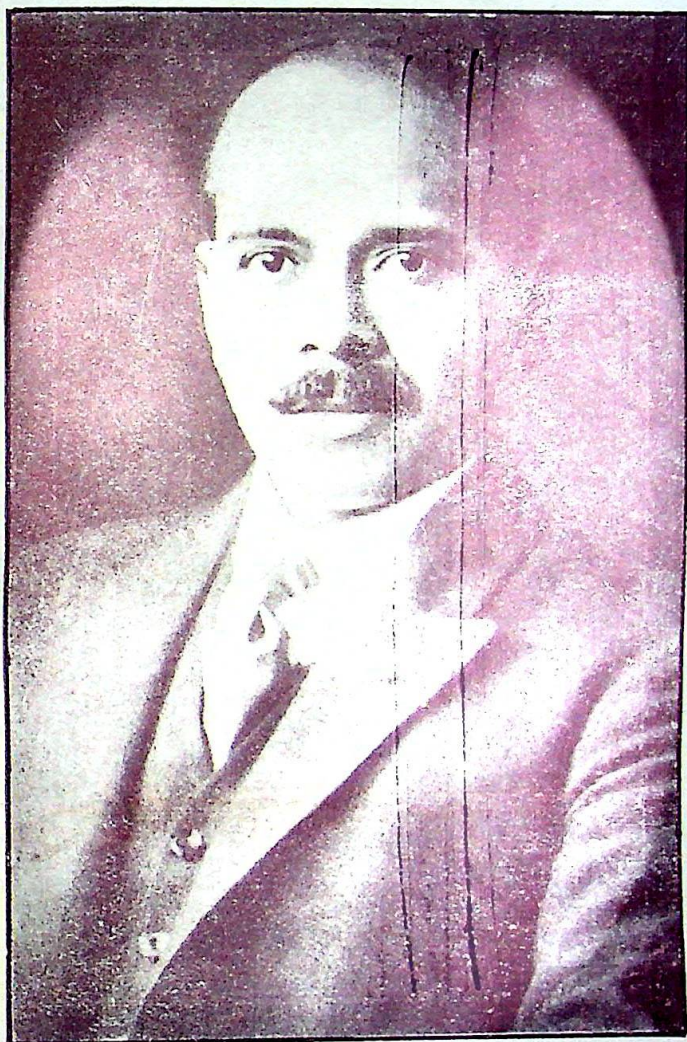
آنریبل سر جے ڈبلیو بھور مشیر تجارت گورنمنٹ ہند

آہ! ایسے میں اگر طوفان آگیا تو میں کیا کرونگی؟ کہاں جاکر پناہ لونگی؟
آہ بادلوں کی کڑک سے، بجلی کی تڑپ سے کیسے بچونگی؟!
اے میرے خدا! مجھے اس طوفان سے بچا
میرے پیروں کو صحیح راستہ پر ڈال دے اور منزل تک پہنچا دے! ورنہ میں مرجاؤنگی!!
رام رے رام ہے رام!

سپیرے کا گیت

میری بانسری کے گیتوں کے جادو سے بچکر تو کدھر جارہا ہے؟
کیا پھولوں کے اُس معطر کنج میں چھپے گا جس میں چاندنی کی کرنیں جذب ہورہی ہیں؟
کیا وہاں جارہا ہے جہاں گلہری مزے کی نیند سو رہی ہے اور کوے اسکے گرد پاسبانی کررہے ہیں؟
کیا تو اس جنگل میں جارہا ہے جو یاسمینی شگوفوں کی صورت میں نور اُگل رہا ہے؟

میرے محبوب دیوتا! تو کہاں چلا؟
میں تیرے لئے میٹھا میٹھا سفید دودھ لایا ہوں
جنگل کا تازہ سُرخ و شیریں شہد بھی حاضر ہے!
میں تجھے سفید اور سرسبز سرکنڈوں کی ٹوکری میں لئے لئے پھرونگا۔
میں تجھے محل کے اس گل بداماں حصہ میں لیجاؤنگا
جہاں زرپوش دوشیزگان جمال "زرتار انبساط" کو اپنے گلہائے مسرت کی پنکھڑیوں میں پروکر "تبسم" کی ایک "نقاب گل" بنارہی ہونگی!

تو آہستہ آہستہ پھنکاریں مارتا ہوا کدھر جارہا ہے؟ کیا اس جنگل میں جہاں حیات بخش زیتون نے ایک سیلِ آتشیں بہا رکھا ہے؟
کہاں جارہا ہے اے محبوب
آ! — اے "خواہشات" کی سیمیں تن کرن ماہتاب!!

ناگ پوجا کا تہوار

اے چمکنے والو ہوشیار ہو جاؤ!
ہم نے پہاڑی غاروں، ٹیلوں اور بڑ کے درختوں میں تمہارے منتخب شدہ مندروں کو ڈھونڈا ہے
آہ! اپنے خواب پرور سروں کو اوپر اٹھاؤ
جس میں قدامت کی عقل و دانش کے خزانے پوشیدہ ہیں
اور اے دیوتاؤ! اپنے لچکدار جسموں کو مترنم نغموں پر جنبش دو۔
ہم تمہارے لئے شیریں دودھ جنگلی انجیر اور سفید شہد لاتے ہیں
تمہارے گرد ہوا میں ایک مقدس ہالہ بنانے کے لئے۔
ہم نے برت رکھا ہے اور خشک لبوں سے ہم تمہاری تعریف میں شیریں بول نکال رہے ہیں
ہم پُر جوش دلوں سے تمہاری توصیف میں سرنگوں اور دست بستہ ہیں!
آہ! ہماری حقیر نذروں کو قبول کرو۔
تاکہ ان پر سال بھر تک برکت قائم رہے۔
آہ! ہماری دلی دعائیں قبول کرو!
ہماری مجبور بے بس زندگیوں کی پاسبانی کرو۔
ہماری صابرانہ مشقتوں کو بھی تکمیل تک پہونچاؤ۔!!
ہمارے عزیز تصورات کو جواہرات کی طرح اپنے چھلکوں میں متشکل کر لو!
اور جب ہم محو خواب ہوں تو اپنے خمیدہ پھنوں کو پھیلا کر ہماری حفاظت کرو۔
ہمارے دلِ مضطرب کی اُمنگوں کو سکون و راحت بخشو۔!!
تمہاری رفتار ندی کی روانی کی طرح تیز ہے، تمہاری آواز شبنم کی خاموش بارش کے مشابہ ہے
تم ایسے لطیف و غیر محسوس ہو جیسے بجلی کی چمک!
آہ! تم ایسے تابناک ہو جیسے سورج کی کرنیں!
آہ اے پیران دانشمند تم فہم و فراست کے مخزن ہو!
تم صدیوں کے اس طلسمی سکوت کے مظہر ہو
جس میں ملکر زندگی، موت، صبر و جوش، مستی و درستی سبھی ایک ہو جاتے ہیں!!!

اچھوت

(از ڈاکٹر اعظم کریوی سابق ایڈیٹر اکبر الہ آباد)

شکروا چمار اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ناریل پی رہا تھا، قریب ہی اس کا اکلوتا لڑکا بینی جسکی عمر قریباً دس سال کی ہوگی کھیل رہا تھا۔ بینی کے سوا شکروا کا اس دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا وہی اب اس کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کا چراغ اور ضعیفی کا سہارا تھا، دن بھر کی محنت مزدوری سے جو کچھ مل جاتا اسی میں دونوں کا خرچ چلتا۔ لیکن دو دن سے اُسے کوئی مزدوری نہ ملی تھی کیونکہ آجکل وہ گاؤں کے زمیندار پنڈت رام پرشاد اوسبھی کے یہاں بیگار کر رہا تھا۔ زمیندار کو سرکار نے رائے صاحب کا خطاب دیا تھا جس کی خوشی میں بڑا جشن منایا جا رہا تھا حاکموں کی دعوت ہو چکی تھی اور صبح کو پنڈتوں کا بھوج ہونے والا تھا۔ دن بھر کی بیگار سے فرصت پاکر تھوڑی دیر ہوئی شکروا نے چھٹی پاکر اپنی جھونپڑی میں قدم رکھا تھا بینی نے باپ کے گلے سے لپٹ کر کہا "بابا اموکا (مجھکو) نئی دھوتی منگادو۔"

شکروا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "مالک کے یہاں کام ختم ہو جائے تو کچھ انام (انعام) ملی دہی ماں توکا (اسی میں تجھکو) دھوتی منگائے دیہوں (منگادونگا)"

بینی نے بال ہٹ سے کام لیا "اوں ہوں، ہیں تو ابہن لیہوں، (ابھی لونگا) مالک کے یہاں سب لوگ نیک نیک کپڑا پہنے ہیں ہم ہوں پہنب (مالک کے یہاں سب لوگ اچھے کپڑے پہنے ہیں میں بھی پہنوں گا)۔

مگر یہ بال ہٹ کسی راج کنور یا رئیس زادہ کی نہ تھی بلکہ ایک فاقہ کش غریب چمار کے لڑکے کی تھی شکروا نے کہا "پاگل نہ بن ہم گریب وہ امیر ہمار اُن کا کا مکابلہ وہ چاہیں تو دن ماں بار بار کپڑا بدلیں ہم ان کی ریس کیسے کر سکت ہیں (ہم غریب وہ امیر ہمارا اور ان کا کیا مقابلہ وہ اگر چاہیں تو دن میں کئی مرتبہ کپڑا بدل سکتے ہیں ہم ان کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں)۔

بینی نے بھولے پن سے کہا "ہم کا گریب ان کا امیر کو بنائس ہے" (ہمیں غریب اور اُن کو امیر کس نے بنایا ہے؟)

ہاہاہا" شکروا نے قہقہہ لگا کر کہا "تو بڑا پاگل ہس (ہے) بھگوان بنائن ہیں (بھگوان نے بنایا ہے)

اور کو بنائے سکت (بنا سکتا) ہے"۔

"تو بھگوان ہم کا امیر کاہے ناہیں بنائن (تو بھگوان نے ہمکو امیر کیوں نہیں بنایا) ہمار (ہماری) کون خطا رہی"۔

"اب رام جانین، اگلے جنم ماں ہم سے کچھ اپرادھ ہوئیگا ہوئی وہی کی سجا ملی ہے (اگلے جنم میں ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہوگی اسی کی سزا ملی ہے۔)

"تو اگر ہم سے بھگوان راجی ہو جائیں تو ہم ہو کا امیر کردیں (اگر ہم سے بھگوان خوش ہو جائیں تو کیا وہ ہم کو امیر کردیں گے)

"اور نہیں تو کیا، بھگوان کے ہاتھ میں تو سب کچھ ہے"۔

"تو بھگوان کیسے کھوس ہوت ہیں" (کیسے خوش ہوتے ہیں)

"پوجا پاٹ سے"۔

"تو ہم ہو پوجا پاٹ کریب" (تو ہم بھی پوجا پاٹ کریں گے)

"مدا ہم مندر ماں نہیں گھس سکت ہیں" (لیکن ہم مندر میں نہیں گھس سکتے)

"کاہے" (کیوں)

"ہم لوگ اچھوت ہیں، پنڈت لوگ کہت ہیں کہ ہم مندر میں گھسب تو مندر ناپاک ہو جائی۔ (پنڈت لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے گھسنے سے مندر ناپاک ہو جائیگا)

نادان بچہ اچھوت کی فلاسفی کو نہ سمجھ سکا، وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا "تو کا بھگوان مندرے ماں رہت ہن؟" (تو کیا بھگوان مندر ہی میں رہتے ہیں اور کہیں نہیں)

"نہیں بھگوان تو ہر جگہ ہیں"

"تو ہموں ہوں اپنی جھونپڑیا ماں ایک چھوٹا سا مندر بنیہوں اور بھگوان کی پوجا کرہیوں تم دیکھ لیہو بہت جلد امیر ہو جاب" (میں بھی اپنی جھونپڑی میں ایک چھوٹا سا مندر بناؤنگا اور بھگوان کی پوجا کیا کرونگا تم دیکھ لینا بہت جلد امیر ہو جائیں گے۔)

"مدا بغیر پنڈت کے پوجا کبول نہ ہوئی" (لیکن کسی پنڈت کی مدد کے بغیر پوجا قبول نہ کیجائیگی)

بینی کا دل ٹوٹ گیا وہ اور کچھ پوچھ ہی نہ سکا اتنے میں کسی نے باہر سے آواز دی "ابے او شکروا" باہر نکلکر شکروا نے دیکھا کہ زمیندار کا پیادہ داتا دین کھڑا ہے، شکروا نے ادب سے پوچھا "مہاراج کا حکم ہے؟"

"اسٹیشن تک جانا ہوگا وہاں سے کچھ سامان آئیگا۔"

"ابھن (ابھی)"

"ہاں بے ابھی، مالک کا حکم ہے فوراً شکروا کو بھیجدو۔"

"سرکار ابھن (ابھی) تو دن بھر کے بیگار سے واپس آئے ہوں۔"

"یہ میں کچھ نہیں جانتا میں نے تجھے مالک کا حکم سنا دیا ہے اگر تو ابھی اسٹیشن نہیں جائیگا تو پھر خیر نہیں، ہمیشہ مزہ اڑاتے ہو اب ذرا مالک کا کام پڑا تو رونے لگے تم لوگ تو جوتوں سے کام کرتے ہو۔"

یہ کہکر مہاراج داتا دین اپنی لوہ بندی لاٹھی کاندھے پر رکھکر اکڑتے ہوئے چل دیے اور شکروا آسمان کی طرف حسرت سے دیکھکر رہ گیا۔ دن بھر بیگار میں رہا سمجھتا تھا کہ رات کو تو آرام ملیگا مگر غریبوں کی قسمت میں آرام کہاں وہ تو اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ تکلیف اُٹھا کر امیروں کو آرام پہنچائیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم ہندوستان میں اُنھیں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ شکروا نے کچھ چبینا بیٹی کو دیکر اسے کتھری پر لٹا دیا اور خود اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۲)

رائے صاحب رام پرشاد اوستھی کے مکان کے سامنے ایک عالی شان شامیانہ لگا ہوا تھا، نو بجے کا وقت ہوگا پنڈتوں کو بھوج دیا جا رہا تھا۔ پنڈت کون تھے بڑے بڑے نام دھاری جن کی چوٹیاں کنوئیں سے پانی کھینچ لا سکتی تھیں، جن کے تلک آسمانی قوس قزح کو بھی مات کرتے تھے جو بظاہر غریب برہمن بنے ہوئے تھے لیکن جن کے گھروں میں سونا برستا تھا، جو دعوتیں کھا کھا کر اتنے موٹے ہو گئے تھے کہ دو قدم چلنے میں بھی اُنھیں تکلیف ہوتی تھی۔ اسی قماش کے برہمن آج تعلقہ دار رائے صاحب رام پرشاد اوستھی کے یہاں گرم گرم پوریاں خستہ کچوریاں اور انواع و اقسام کی مٹھائیاں کھا رہے تھے۔ تھال کے تھال اُن کے سامنے آتے اور وہ بغیر ڈکار لیے اُڑا لیے جاتے تھے۔

ان سے کچھ دور پر چند فاقہ کش نیچ ذات والے بیگاری مزدور جنھیں پنڈتوں نے اچھوت کا خطاب دے رکھا ہے حسرت بھری نظروں سے پنڈتوں کی توند کو دیکھ رہے تھے، ان کے لئے نہ پوریاں تھیں نہ کچوریاں۔ پنڈتوں کو کھلانے سے تو دیوتا خوش ہوتے ہیں لیکن نیچوں کو کھلانے سے تو کسی کو فائدہ کی امید نہ تھی۔

شکروا چمار کو رات بھر اسٹیشن ہی پر پڑا رہنا پڑا وہ تھوڑی دیر ہوئی مہمانوں کا سامان لیکر گاؤں میں واپس ہوا تھا اور اب تک اُسے گھر جانے کی اجازت نہ ملی تھی، وہ ایک طرف لنگوٹی باندھے چپ چاپ کھڑا تھا

کہ ایک تلک دھاری پنڈت شیو شنکر لٹیا میں گنگا جل لئے کھڑاؤں پہنے رام نام کی مالا جپتے ہوئے اس طرف سے نکلے، وہاں کی زمین کچھ اونچی نیچی تھی، پنڈت جی لڑکھڑائے اور ان کا بدن شنکر وا چمار سے چھو گیا، بات معمولی تھی، پنڈت اپنے گھر کی مرمت اچھوتوں ہی سے کراتے تھے، مہاراجن کا ڈولہ چمار ہی اُٹھاتے تھے لیکن اس وقت ان کے ہاتھ میں گنگا جل تھا وہی گنگا مائی کا جل جس سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے جس میں بھنگی چمار برہمن سب اشنان کرتے ہیں، وہی گنگا جل اپنی لٹیا میں بھر کر خود کو دیوتا سے بھی بڑھکر سمجھنے لگے۔ غلطی تھی اپنی لیکن قصور بنایا گیا چمار کا۔ شنکروا چمار کی یہ مجال کہ پنڈت جی سے اپنا ناپاک بدن چھُوائے۔ جب اُس نے پنڈت جی کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا تو وہ ہٹا کیوں نہیں۔ بھری سبھا میں اس نے جان بوجھکر پنڈت جی کی ہتک کی۔ اب ان کو پھر اشنان کرنا پڑیگا، اسی قسم کی باتیں سوچکر پنڈت جی شنکروا چمار پر برس پڑے "پاپی، چانڈال، بدمعاش" غرض پنڈت جی کو جتنی گالیاں یاد تھیں وہ ختم کر دیں۔ قریب ہی تعلقدار صاحب پنڈتوں کی آؤ بھگت میں لگے ہوئے تھے، شور و غل سُنکر وہ دوڑے آئے اور پنڈت جی سے پوچھا "مہاراج! کیا بات ہے؟"

مہاراج نے بگڑ کر کہا "جہاں پنڈتوں کو بھوج دیا جاتا ہے وہاں چماروں کا کیا کام؟ دیکھئے نہ اس پاپی نے جان بوجھکر مجھے چھو لیا، اب آپ ہی بتائیے کہ مجھے غصہ کیوں نہ آئے۔ رام! رام! آپ نے ان چماروں کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔"

مہاراج کے آخری جملہ نے تعلقدار او ستھی جی کو آگ بگولہ کر دیا، انھوں نے شنکروا چمار سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی، پیادہ کو اشارہ کر دیا کہ "مار سالے کو" وہاں تو حکم کی دیر تھی، پیادے تو اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایسے موقعے تلاش ہی کرتے رہتے ہیں۔ شنکروا چمار پر لات گھونسہ اور جوتوں کی مار پڑنے لگی۔ شنکروا چمار بھوک کے مارے یوں ہی مرا جا رہا تھا مار پڑی تو زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ پیادہ نے سمجھا کہ مکر کر رہا ہے اُس نے کسکر ایک لات ماری اُس کی چوٹ تلی پر لگی اور وہ پھٹ گئی دیکھتے ہی دیکھتے غریب شنکروا نے دم توڑ دیا۔

جشن میں ایسی بدشگونی کا کسی کو خیال ہی نہ تھا سب لوگ گھبرا گئے، تھوڑی دیر کے لئے تعلقدار صاحب بھی پریشان ہو گئے، اُن کو اس کا تو کوئی غم یا ڈر نہ تھا کہ ایک غریب کی ہتیا ہو گئی ہے بلکہ اس کا صدمہ تھا کہ کمبخت آج ہی کیوں مرا میرا اتمام کیا کرایا خاک میں ملا دیا۔ سب برہمن کھا پی چکے تھے وہ سب رام رام کہتے ہوئے چلنے کے لئے تیار ہو گئے، وہ ایسے پاپ کی جگہ پر کیسے رہ سکتے تھے، برادری ان کو چھوڑ دیتی، لیکن تعلقدار صاحب کے پاس پنڈتوں کو رام کرنے کا نسخہ موجود تھا، لکشمی دیوی ان پر مہربان تھیں

ایسی صورت میں پنڈتوں کو ملانا تعلقہ دار صاحب کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ ان کے پاس دولت کی طاقت تھی، وہ پنڈتوں کو جدھر چاہتے نچا سکتے تھے۔ سب سے پہلے تو اُنھوں نے چماروں کو بلا کر حکم دیا کہ شنکروا کی لاش کو لے جا کر فوراً جلا دیں، اس کے ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر کسی نے پولیس کو مار پیٹ کی خبر دی تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ دریا میں رہکر مگر سے بیر، کس کی مجال تھی کہ تعلقہ دار صاحب کی حکم عدولی کرتے، سب دم بخود رہ گئے۔ پولیس کی طرف سے تعلقہ دار صاحب کو اطمینان تھا پھر بھی اُنھوں نے حلقہ کے تھانہ دار صاحب کی مٹھی گرم کرنے کا بھی انتظام کر دیا۔

ان تمام جھگڑوں سے فرصت پا کر تعلقہ دار صاحب نے پنڈتوں کے پیٹ پوجا کا سامان کیا، اُن کو روک لیا گیا اور رات کو پھر ان کو بھوج دیا گیا اور پنڈتوں کے حسب منشا مہادیو جی پر ایک سوا ایک روپیے اور ایک ناریل چڑھا کر دان کر دیا، گویا ان کے خیال میں گناہ کا کفارہ ادا کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ست نراین کی کتھا بھی کرائی گئی۔

آٹھ بجے رات کا وقت ہوگا ست نراین کی کتھا ہو رہی تھی، ایک بڑے پنڈت جی جن کے ہونٹ رام رام کہتے موٹے ہو گئے تھے لیکن جنھوں نے اپنی بیوہ لڑکی کے سسرال کا سارا دھن ہضم کر لیا تھا وہی پنڈت جی اس وقت پھولوں سے لدے ہوئے جھوم جھوم کر ست نراین کی کتھا کہہ رہے تھے کہ یکبارگی "رام نام ست ہے" کی آواز آئی۔ شنکروا چمار کی ارتھی مرگھٹ جا رہی تھی، کسی نے "رام نام ست ہے" کی صدا زور سے لگا دی، پنڈت جی کا کلیجہ دہل گیا وہ ساری کتھا بھول گئے اور یہ کہتے ہوئے چوکی سے اتر پڑے "اب مجھ سے کتھا نہیں کہی جاتی، اچھوتوں نے تو ناک میں دم کر دیا"۔

تعلقہ دار صاحب نے غصہ سے پیادوں کی طرف دیکھا جس کا یہ مطلب تھا کہ چمار کی ارتھی اس طرف سے کیوں نکلی، لیکن اب بگڑنا بیکار تھا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، ساری سبھا درہم برہم ہو گئی۔

(۳)

شنکروا چمار کوئی بڑا آدمی تو تھا ہی نہیں کہ لوگ اُس کی برسی مناتے، ایک معمولی چمار کی زندگی ہی کیا؟ گاؤں والے اُسے بہت جلد بھول گئے۔ اس کا لڑکا بینی باپ کے مرنے کے بعد کچھ دن تک تو گاؤں میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا پھر معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ کسی خاندانی رئیس کا لڑکا ہوتا تو اُس کی گمشدگی پر گاؤں میں تہلکہ مچ جاتا، اخبارات میں بڑی بڑی سرخیوں سے اشتہارات شائع ہوتے، انعام کی لالچ میں پولیس بھی انتہائی کوشش کرتی۔ لیکن ایک چمار کے لڑکے کی سماج میں کوئی عزت ہی نہیں ہے، سماج تو بڑوں کے لئے ہے چھوٹوں کی اور وہ بھی ایک چمار کی وہ کیوں پروا کرنے لگی۔

سنگروا کو مرے بیس سال ہو چکے تھے، اس عرصہ میں سیکڑوں انقلاب ہوئے، بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے یا مر گئے۔ تعلقہ دار رائے صاحب رام پرشاد اوستھی زندہ تھے لیکن چراغ سحری، اب ان کا ایک لڑکا گجادھر پرشاد اوستھی علاقہ کا کام کرتا تھا اور رائے صاحب اپنا وقت پوجا پاٹ میں گزارتے تھے لیکن اس ضعیفی کے عالم میں بھی جب حاکم پرگنہ ان کے علاقہ میں آجاتے تو رائے صاحب فوراً حاکم کے سلام کے لئے حاضر ہوتے۔

ایک دن رائے صاحب نے سنا کہ ایک نئے حاکم مسٹر ڈیوڈ ان کے علاقہ میں آئے ہیں اور ان کا پڑاؤ گاؤں کے قریب ہی پڑا ہے۔ رائے صاحب فوراً چار پیادوں کو لیکر حاکم پرگنہ کے پڑاؤ پر پہنچے، سب سے پہلے وہ پیشکار سے ملے۔ پیشکار صاحب رائے صاحب کے پرانے نیازمندوں میں سے تھے، جب کبھی وہ رائے صاحب کے علاقہ کی طرف آتے تو رائے صاحب کے یہاں سے ان کو سو روپیہ کا نذرانہ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ فصل کی چیزیں بھی ان کے گھر پہونچ جاتی تھیں۔ پیشکار صاحب نے رائے صاحب سے کہا

"یہ نئے صاحب رئیسوں سے بہت کم ملتے ہیں، آپ ان سے نہ ملیں تو بہتر ہے۔"

"تو کیا مجھ سے بھی نہ ملیں گے؟"

"نہیں آپ ایسے رئیس سے تو ضرور ملیں گے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان سے ملکر آپ کی طبیعت خوش نہ ہوگی۔"

"اجی میں بڑے بڑے افسروں سے مل چکا ہوں سب مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں ان کو بھی دیکھ لونگا، میں نے تو سنا ہے کہ یہ نیچ ذات والوں سے بھی ملتے ہیں پھر مجھ سے کیوں نہ ملیں گے؟"

"ہاں یہ تو صحیح ہے کہ یہ صاحب اچھوتوں سے بہت ملتے ہیں، ان کو کرسی پر بٹھاتے ہیں لیکن رئیسوں سے سیدھے منھ بات نہیں کرتے۔"

"عیسائی ہے نہ۔"

"جی ہاں"

"لیکن اب تو آ گیا ہوں مل ہی کے جاؤں گا۔ آپ ذرا میری اطلاع تو کر دیجئے۔"

"بہت اچھا جیسی مرضی" اتنا کہکر پیشکار صاحب مسٹر ڈیوڈ کے خیمہ میں داخل ہوئے اور اطلاع کی "حضور سے اس علاقہ کے سب سے بڑے زمیندار اور سرکار کے خیر خواہ رائے صاحب رام پرشاد اوستھی ملنے کے لئے آئے ہیں۔"

اوستھی جی کا نام سنکر ڈیوڈ صاحب نے کچھ سوچکر کہا "اچھا اندر بھیج دو۔"

اوستھی جی نے خیمہ میں داخل ہوکر نہایت ادب سے ڈیوڈ صاحب کو جھک کر سلام کیا اور خود ہی ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھے، اوستھی جی سلام کرنے کے بعد افسروں سے ہاتھ ملانے کے عادی تھے ہر افسر اُن سے بڑی خوشی سے ہاتھ ملاتا تھا لیکن خلاف معمول اوستھی جی کو یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی جب ڈیوڈ صاحب نے ان سے ہاتھ نہ ملایا اور کہا "معاف کیجئے میں آپ ایسے عالی خاندان پنڈتوں سے ہاتھ نہیں ملا سکتا کیونکہ میں اچھوت ہوں"۔

پنڈت جی کے وہم وخیال میں بھی نہ آیا تھا کہ افسران اعلیٰ اچھوت ہو سکتے ہیں، وہ تو ان نیچوں کو اچھوت سمجھتے تھے جو ان کے گاؤں میں چھوٹے کام کرتے تھے جن کو چھونا وہ مہاپاپ سمجھتے تھے۔ ڈیوڈ صاحب کی زبان سے اچھوت کا لفظ سُنکر انھوں نے سمجھا کہ ڈیوڈ صاحب نے یوں ہی ہنسی میں کہدیا ہوگا۔ پنڈت جی نے کہا "حضور ایسی بات نہ کہیں، راج دربار کو تو ہم ایشور کا سایہ سمجھتے ہیں، شاستر میں بھی راج بھگت کی بڑی مہما لکھی ہے اور یہی پراچین سے ہوتا آیا ہے"۔

"پنڈت جی معاف کیجئے آپ لوگ مطلب کے بندے ہیں جس میں آپ کا فائدہ ہوتا ہے اسکو آپ وید و شاستر سے جائز ثابت کر لیتے ہیں اور جس سے آپ کو نقصان ہوتا ہے اُسے آپ مذہبی کتابوں کے خلاف بتاتے ہیں۔ بتاتے رہیئے آپ کی خوشی لیکن اب وہ زمانہ گیا جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے جن کو آپ نیچ سمجھکر اپنی سماج سے نکل جانے کا موقع دے رہے ہیں وہی نیچ تعلیم یافتہ ہوکر آپ پر حکومت کریں گے"۔

پنڈت جی جھٹ سے بول اُٹھے "جی ہاں یہ کلجگ ہے نہ؟"

ڈیوڈ صاحب نے مسکرا کر کہا "خوب آپ اسی پنڈتائی میں رہیئے اور دنیا ترقی کرتی جائیگی، جسکو آپ اپنے خیال میں کلجگ سمجھتے ہیں وہ دوسروں کے لئے ست یگ ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کی اسی قسم کی تنگ نظری اور تعصب نے نہ جانے کتنے اچھوتوں کو دوسرے مذاہب اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ اگر آپ نے ان اچھوتوں کو اپنانے کی کوشش نہ کی تو آپکی قوم مٹی میں ملجائیگی"۔

پنڈت جی دل میں سوچ رہے تھے کہ میں تو صاحب سے ملنے آیا تھا نہ کہ اچھوتوں پر بحث کرنے انھوں نے گھبرا کر کہا "حضور کو اچھوتوں سے بڑی ہمدردی ہے"۔

"جی ہاں، کیونکہ میں خود اچھوت ہوں"۔

"وہ کیسے؟"

"یہ آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا، ہاں یہ تو بتائیے کیا آپ کے گاؤں میں کوئی شنکر و اچار تھا؟"

شنکر واچار کا نام سُنکر پنڈت جی کو بیس برس پہلے کی باتیں یاد آگئیں، وہ سمجھے کیا خونِ ناحق رنگ لانے والا ہے، ڈر کے مارے ان کا چہرہ فق ہوگیا، انھوں نے دبی زبان سے کہا "جی ہاں میرا ایک اسامی اس نام کا ضرور تھا لیکن اُس کو مرے ہوئے اب قریباً بیس بائیس سال ہوگئے"۔

ڈیوڈ صاحب نے کہا "میں نے سنا ہے کہ اُس کو آپ نے جان سے مروا ڈالا تھا"

پنڈت جی تن گئے۔ "جھوٹ بالکل جھوٹ، بھلا کہیں پنڈتوں سے جیو ہتیا ہو سکتی ہے"؟

"جی ہاں آپ ایسے بیدرد تنگ نظر پنڈتوں سے جیو ہتیا ہو سکتی ہے، اور اس کا گواہ میں خود آپ کے سامنے موجود ہوں"۔

پنڈت جی نے گھبرا کر کہا "حضور — گواہ!"

ڈیوڈ صاحب بولے "پنڈت جی ادھر دیکھئے جس کو اس وقت آپ حضور کہکر فخر کر رہے ہیں، جس کو سلام کرنے کے لئے آپ یہاں حاضر ہوئے ہیں وہ اُس بدنصیب شنکر واچار کا لڑکا ہے جو کبھی اچھوت تھا جس نے آپ کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ وہی عیسائی ہو کر تعلیم پاکر آج حاکم ہے اور آپ کی نگاہوں میں ایشور کا سایہ ہے اور وہ اب آپ سے ہاتھ ملانا بھی پسند نہیں کرتا"۔

پنڈت جی پر گویا بجلی گر پڑی، شرم وندامت سے وہ پانی پانی ہوگئے، ان کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا چھا گیا، وہ زمین پر گرنے ہی کو تھے کہ ڈیوڈ صاحب نے سنبھال لیا اور اپنے چپراسی کو بلا کر پنڈت جی کو ان کے گھر پر بھیج دیا۔ پنڈت جی کے لئے ضعیفی میں یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اسی رات کو قیدِ ہستی سے آزاد ہوگئے، لوگوں نے سمجھا کہ دل کی حرکت بند ہونے سے ان کی موت ہوگئی۔

دس گیارہ بجے دن کا وقت تھا، ڈیوڈ صاحب کے سامنے کوئی مقدمہ پیش تھا کہ ان کے پڑاؤ کے پاس سے رائے صاحب پنڈت رام پرشاد وسشٹھی کی ارتھی نکلی، ڈیوڈ صاحب کے کانوں میں "رام نام ست ہے" کی صدا آئی، وہ فوراً اجلاس سے باہر نکل آئے اور اپنے سر سے ٹوپ اتار کر اُس وقت تک مؤدب کھڑے رہے جب تک "رام نام ست ہے" کی آواز فضا میں گونجتی رہی۔

تنقید کتب

(۱) تصحیح قاموس المشاہیر

(نوشتہ سید احمد اللہ قادری نایب ایڈیٹر رسالہ تاریخ)

حال میں مجھے قاموس المشاہیر مرتبۂ مولانا نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی کے مطالعہ کرنے کا پھر موقعہ ملا تو چند فروگذاشتیں اور معلوم ہوئیں چنانچہ ذیل میں ان کی تصحیح کی جاتی ہے۔ یہ تنقید صرف اس کی پہلی جلد کے متعلق ہے۔ اس پر ایک بسیط تبصرہ رسالہ عالمگیر لاہور کے سالنامے (جون ۱۹۳۰ء) میں بھی لکھا جا چکا ہے۔

قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۷، کالم ۱ میں درج ہے:-

ابراہیم قطب شاہ سلطان قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ کا چھٹا بیٹا تھا۔ ۹۳۷ھ میں پیدا ہوا سلطان قلی کے مرنے پر اس کا بھائی جمشید علی تخت پر بیٹھا......... ۲۱ ربیع الثانی ۹۸۹ھ میں ۵۱ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کا بھائی محمد قطب الدین شاہ بادشاہ ہوا۔

اس بادشاہ کا نام ابراہیم قلی قطب شاہ ہے۔ سنہ ولادت ۹۳۶ھ ہے۔ سلطان قلی کے بعد اس کا بڑا بھائی جمشید علی نہیں بلکہ جمشید قلی جانشین ہوا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا سنہ وفات ۹۸۸ھ ہے اس کے بیٹے کا نام محمد قطب الدین شاہ نہیں بلکہ محمد قلی قطب شاہ ہے۔

۲- صفحہ ۲۴، کالم ۲- ابن ذکریا رازی، محمد بن ذکریا نام ابوبکر کنیت وطن قصبہ رے ہے......

اس کا رسوخ شاہان اسلام کے یہاں بڑھ گیا تھا یہاں تک کہ سلطان السلاطین منصور بن اسمٰعیل سامانی نے اپنے واسطے ایک کتاب المنصوری تصنیف کرائی۔"

ذکریا رازی کے وقت میں کوئی بادشاہ منصور بن اسمٰعیل نہیں گزرا ہے اور نہ تاریخ میں شہرت رکھتا ہے اگر ہم اس کو منصور بن نوح سمجھیں تو اس کا عہد ۳۵۰ھ سے ۳۶۶ھ تک رہا ہے اور رازی نے ۳۱۱ھ یا ۳۲۰ھ میں وفات پائی۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں منصور بن اسحٰق بن احمد

بن اسد کا ذکر کیا ہے جو رازی کے حال پر بڑا مہربان تھا، اور رازی نے اسی کے نام پر المنصوری تصنیف کی تھی۔ یہ منصور سامانیوں کے دوسرے بادشاہ احمد بن اسمٰعیل بن احمد بن اسد کا چچازاد بھائی تھا اور احمد بن اسمٰعیل نے اسے ۲۹۰ھ میں خراسان کا حاکم مقرر کیا اور رے اس کا مستقر حکومت تھا اس خدمت پر یہ ۲۹۶ھ تک فائز رہا۔ اس کے بعد ۳۰۲ھ میں نصر بن احمد بن اسمٰعیل پر خروج کیا۔

۳۔ صفحہ ۲۹ کالم ۱۔ ابوالحسن شاہ احمد نگر کا بادشاہ اور شاہ طاہر کا فرزند تھا اور علی عادل شاہ کا ۹۸۰ھ میں وزیر تھا۔

اس نام کا احمد نگر میں کوئی بادشاہ نہیں ہوا ہے۔ مرتضیٰ نظام شاہ اول کے زمانہ میں ایک شخص شاہ طاہر نامی احمد نگر میں آیا۔ اس کا یہ ادعا تھا کہ وہ شہزادہ خدا بندہ بن برہان نظام شاہ اول کا بیٹا ہے مگر بعد میں تحقیق کی گئی تو اس کا بیان غلط نکلا۔ اس پر صلابت خان وزیر اعظم (احمد نگر) نے اسے قید کر دیا اور یہ یہیں مر گیا اس کا ایک بیٹا احمد نامی تھا امرا نے اسے غلطی سے ۱۰۰۳ھ میں احمد نگر کے تخت پر بٹھا دیا۔ مگر چاند بی بی کی کوشش سے معزول کر دیا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے شورش رفع کرنے کیلئے اسے اپنے پاس ایک جاگیر دیکر امرا میں شریک کر لیا یہ واقعہ ۱۰۰۳ھ کا ہے۔ (سوانح چاند بی بی صفحہ ۳۹)

۴۔ صفحہ ۳۳ کالم ۲۔ ابوالفداء اسمٰعیل حموی کی تقویم البلدان کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی مشہور اور معرکہ آرا تصنیف المختصر فی اخبار البشر (جو عوام میں تاریخ ابوالفدا کے نام سے شہرت رکھتی ہے) چھوڑ دی ہے۔ اس میں حضرت آدم سے ۷۲۹ھ تک واقعات ہیں۔

۵۔ صفحہ ۴۷ کالم ۱۔ ابوسعید بیضاوی، ابوسعید عبداللہ بیضاوی مصنف نظام التواریخ۔ اس میں حضرت آدم سے لیکر تاتاریوں کے زمانہ تک جب کہ ہلاکو خاں نے ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء میں بغداد پر حملہ کیا حال درج ہے یہ کتاب ۱۲۷۵ء میں تصنیف کی گئی۔

اسی مصنف کے حالات مرتب نے بیضاوی کے عنوان سے (صفحہ ۱۴۸ کالم ا پر) اس طرح تحریر کیے ہیں:-

"قاضی بیضاوی نام ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ ابن عمر لقب وطن بیضا واقع شہر شیراز کے مدت دراز تک قاضی رہے اور بمقام تبریز ۶۸۵ھ یا بقول دیگر ۶۹۱ھ میں وفات پائی یہ مشہور تفسیر بیضاوی کے مصنف ہیں اس کو انوار التنزیل اور اسرار التاویل بھی کہتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ نظام التواریخ کے بھی مصنف ہیں لیکن بعض نے ابوسعید کی

تصنیف بتاتے ہیں۔"

ابو سعید بیضاوی اور قاضی بیضاوی دونوں ایک ہی مصنف ہیں، جسکو نظامی صاحب نے غلطی سے دو علیحدہ مصنف تصور فرمایا ہے۔ ان ہی صاحب نے تفسیر بھی لکھی ہے اور نظام التواریخ بھی تفسیر بلاد مغرب میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ ایک جرمن محقق فلیشر نے اسے نہایت اہتمام کے ساتھ لیبزک میں ۱۸۴۶ء میں چھپوایا ہے، ایک اور مستشرق فل نے اس کی انڈکس بنائی ہے جو ۱۸۶۱ء میں طبع ہوئی ہے۔ یہ مشرق میں بھی کئی دفعہ چھپی ہے جنمیں بعض اشاعتوں کے سنہ درج کئے جاتے ہیں (دہلی میں ۱۲۷۱ھ میں دو جلدیں طہران میں ۱۲۷۲ھ میں ایک جلدمیں، بمبئی اور لکھنؤ میں ۱۲۷۹ھ و ۱۲۸۲ھ میں دو دو جلدیں) نظام التواریخ کو اخیر میں مرتب نے نظامت التواریخ لکھا ہے جو سہو ہے، یہ بہت کمیاب تھی مگر حال میں مولوی حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے شائع فرمادی ہے۔ اس کے سوا بیضاوی کی اور بہت سی تصنیفات ہیں جن کا ذکر قاموس المشاہیر میں نہیں ہے۔ (مراۃ الجنان جلد چہارم صفحہ ۲۱۹ طبقات الکبریٰ جلد پنجم صفحہ ۵۹، مفتاح السعادہ جلد اول صفحہ ۴۳۶، تاج العروس جلد پنجم صفحہ ۱۱ روضات الجنات صفحہ ۴۲۵، اکتفاء القنوع صفحہ ۱۱۴

۶۔ صفحہ ۸۱ کالم ۲۔ اسمٰعیل عادل شاہ یوسف عادل شاہ کا جانشین ۹۱۵ھ میں ہوا...... اور مقام کوکی میں اپنے باپ کی قبر کے پاس دفن ہوا"

یوسف عادل شاہ کا ۹۱۶ھ میں انتقال ہوا، اس لحاظ سے اسمٰعیل عادل شاہ ۹۱۶ھ میں تخت نشین ہوا، کوکی کوئی مقام نہیں ہے البتہ گوگی ہے جو حیدرآباد کے ایک ضلع گلبرگہ شریف کا ایک تعلقہ ہے۔

۷۔ صفحہ ۹۱ کالم ۱۔ اکرام علی، اردو میں خوان الصفا ان کی تصنیف ہے جس کو انھوں نے ۱۸۱۱ء میں فارسی سے ترجمہ کیا۔

محمد اکرام علی کی کتاب کا نام اخوان الصفا ہے جسے انھوں نے عربی سے ترجمہ کیا ہے۔ (کشف الظنون جلد اول صفحہ ۶۰)

۸۔ صفحہ ۹۲ کالم ۱۔ اسمٰعیل نظام شاہ بن برہان نظام شاہ ثانی احمد نگر کا بادشاہ حسین نظام شاہ کے بعد تخت پر بیٹھا، برہان نظام شاہ کی تخت نشینی پر قلعہ لاہ گڈھ میں قید ہوگیا۔"

حسین نظام شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا مرتضیٰ نظام شاہ تخت نشین ہوا، مرتضیٰ کے بعد اس کا بیٹا میراں حسین نظام شاہ تخت پر بٹھایا گیا، میراں حسین کے بعد اسمٰعیل نظام شاہ کی بادشاہی کی باری آئی۔ لاہ گڑھ کے نام سے دکن میں کوئی قلعہ نہیں ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ قلعہ لہاگر میں قید کیا گیا تھا۔

۹۔ صفحہ ۹۱ کالم ۲۔ الپتگین امرائے بخارا میں سے تھا .... اس نے غزنیں پہنچکر ایک علاحدہ سلطنت قائم کی اور غزنیں کو جو ایک چھوٹا سا مقام تھا دارالسلطنت بنایا ۳۶۶ھ میں مرگیا، اس کا بیٹا ابو اسحق جانشین ہوا لیکن وہ نہایت کمزور طبیعت اور مُسرف تھا، تھوڑے ہی دنوں بعد تمام ارکین سلطنت اس سے ناراض ہوگئے اور انھوں نے ۳۶۷ھ میں سبکتگین کو جو الپتگین کا ایک سردار تھا تخت پر بٹھا دیا۔

الپتگین نے ۳۵۲ھ میں غزنیں میں انتقال کیا اس کے بعد ابو اسحاق نہیں بلکہ اسحاق تخت نشین ہوا جس نے تقریباً چار سال تک فرماں روائی کی، اسحق کے بعد امیر بلکاتگین ۳۵۵ھ میں بادشاہ بنایا گیا۔ آٹھ برس کے بعد جب اس نے وفات پائی تو امیر پیری جانشین بنا۔ ۳۶۲ھ میں چند بدعنوانیوں سے تنگ آکر امرائے ترک نے اُسے معزول کردیا اور سبکتگین کو اپنا فرمانروا بنا لیا۔ اس واقعہ کا سنہ جیسا کہ مورخ فرشتہ نے ۳۶۷ھ تحریر کیا ہے، یہی عام طور پر صحیح تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن طبقات ناصری میں سبکتگین کی تاریخ تخت نشینی ۲۷۔ شعبان ۳۶۶ھ مذکور ہے۔ الپتگین کی وفات اور ان کے جانشینوں کی سرگذشت و تصریح تاریخ یمینی فصیحی وطبقات ناصری اور اکثر قدیم تاریخوں سے بھی ہوتی ہے

(طبقات ناصری طبع کلکتہ صفحہ ۷، و نیز ریورٹی صفحہ ۷۲ و ۷۳۔)

۱۰۔ صفحہ ۱۰۵ کالم ۲۔ امیر بریداول کے بیان میں لکھا ہے کہ محمود شاہ بہمنی نے ۹۲۳ھ میں انتقال کیا، حقیقت میں اس نے ۹۲۴ھ میں وفات پائی۔

۱۱۔ صفحہ ۱۲۷ کالم ۱۔ برہان عماد شاہ کے بیان میں لکھا ہے کہ طفیل خاں وزیر اس کی ریجنٹ کی حیثیت سے کار سلطنت انجام دیتا تھا مگر اس وزیر کا صحیح نام تفال خاں ہے۔

۱۲۔ صفحہ ۱۳۷ کالم ۱۔ بہادر نظام شاہ کے حالات میں مغلوں کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

میاں منجھو اس وقت احمد نگر پر قابض تھا اس نے بہادر نظام شاہ کو جو اس وقت شیر خوار بچہ تھا بادشاہ تسلیم کرلیا شیر خوار شہزادے کے مخالفوں نے جو مدعیان سلطنت میں تھے شہر کا محاصرہ کرلیا، میاں منجھو نے مراد سے جو گجرات کا گورنر اور شہنشاہ اکبر کا بیٹا تھا مدد طلب کی اور یہ وعدہ کیا کہ اگر اس کی مدد سے کامیابی ہوئی تو وہ سلطنت مغلیہ کا باجگذار ہو جائیگا۔ سلطان مراد نے اس شرط کو قبول کرلیا اور احمد نگر پر بڑی جمعیت کے ساتھ چڑھائی کی قبل اس کے کہ شاہی فوج کی مدد پہنچے وہ اپنے حریفوں کو زیر کر چکا تھا، اس لئے وہ مراد سے مدد مانگنے پر بہت پچھتایا اور اب انہیں نے صرف اس غرض سے کہ اُسے شہزادہ مراد کا باجگذار بننا پڑے مقابلہ کی تیاری شروع کردی، شہر کو چاند بی بی کے جو سلطان بہادر شاہ کی

پھوپھی تھی عام نگرانی میں دے کر نصیر خاں کے سپرد کیا...... شہزادہ نے چاندبی بی سے خراج قبول کر کے محاصرہ اُٹھادیا اور کچھ روپیہ نقد ادا کیا گیا۔

میاں منجھو ابراہیم نظام شاہ کا وزیر اعظم تھا سلطان نے اُسے اپنے عین حیات ہی میں وزارت کی خدمت سے سبکدوش کر دیا تھا بادشاہ کا جب انتقال ہوا تو یہ شاہی خزانہ پر قابض ہو گیا اور اپنے زور سے ایک غیر متعلق شہزادے کو جس کا نام احمد تھا عین عید الضحیٰ کے دن (۱۰۰۳ھ میں) تخت نشین کرادیا جس کے باعث چاندبی بی اور اس میں شدید معرکے رہے، جب اس کی قوت کمزور ہو گئی تو شہزادہ مراد کو احمد نگر پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی اور خود شہر کے حوالہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اسی اثنا میں یہ احمد نگر پر قابو پا گیا مگر شہزادہ مراد بھی احمد نگر آرہا تھا، اس کو شہزادے کے آنے کا علم ہوا تو چاندبی بی اور انصار خاں کو قلعہ حوالہ کر کے خود عادل شاہ اور قطب شاہ کے پاس مدد کے لئے گیا۔ انصار خاں چونکہ اس کا خاص آدمی تھا چاندبی بی نے اس کو قتل کرادیا (مرتب نے انصار خاں کو نصیر خاں لکھا ہے جو تصحیف ہے) چاندبی بی نے مراد سے صلح کرنے کے بعد اس کو برار کا علاقہ پیشکش میں دیا، اس کے علاوہ اور کسی قسم کا تاوان جنگ ادا نہیں کیا (سوانح چاندبی بی)

۱۳۔ صفحہ ۱۶۳۔ کالم ۱۔ ٹیپو سلطان...... نے سنگھاپٹن کے قلعہ کو بہادری سے بچانے کی کوشش کی۔
صحیح نام سری رنگاپٹن ہے۔

۱۴۔ صفحہ ۱۹۳ کالم ۱۔ حاجی خلفہ..... کشف الظنون سوانح مشاہیر کی ایک کتاب ہے۔
کشف الظنون کے مصنف کا نام حاجی خلیفہ ہے۔ کشف الظنون عربی و فارسی کتابوں کی فہرست ہے، کتاب کے نام کے تحت مصنف کا نام اور کتاب کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۵۔ صفحہ ۲۰۳ کالم ۲۔ مامون رشید کے وزیر کا نام حسن بن سہیل لکھا ہے۔ لیکن صحیح نام حسن بن سہل ہے (المامون جلد دوم صفحہ ۱۱۲)

۱۶۔ صفحہ ۲۱۱ کالم ۱۔ مولانا حسین واعظ کاشفی کے بیان میں ان کی ایک تصنیف لطائف الطوائف کا ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے اس نام سے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے، البتہ ان کے فرزند ملا علی کاشفی نے لطائف الظرائف ۹۳۴ھ میں لکھی تھی، غالباً اسی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

۱۷۔ صفحہ ۲۱۱ کالم ۲۔ حکیم الملک شمس الدین...... ۹۸۹ھ میں اجازت حج لیکر حجاز کو گیا اور وہیں وفات پائی مگر وہ ۹۸۹ھ میں نہیں بلکہ ۹۸۸ھ میں حج سے مشرف ہوا اور وہیں انتقال کیا۔
منتخب التواریخ صفحہ ۳۳۳

۱۸۔ صفحہ ۲۱۲ کالم ۱۔ حکیم عین الملک کے بیان میں ہم صرف اس قدر اضافہ کرتے ہیں کہ انھوں نے دکن کا بھی سفر کیا تھا خواجہ نظام الدین احمد اور ملا عبد القادر بدایونی سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔
(منتخب التواریخ صفحہ ۳۳۴)

۱۹۔ صفحہ ۲۱۲ کالم ۲۔ حمد اللہ مستوفی بن ابو بکر الخواجہ القزوینی اس کا نام حمید الدین مستوفی بھی ہے۔
تاریخ گزیدہ اس کی تصنیف ہے۔
اس کا صحیح نام حمد اللہ بن ابی بکر بن نصر مستوفی ہے۔

۲۰۔ صفحہ ۲۱۳۔ کالم ۲۔ حمید الدین مستوفی ملاحظہ ہو حمد اللہ مستوفی۔
حمید الدین حمد اللہ مستوفی کا نام نہیں ہے تصحیف ہے (تاریخ گزیدہ طبع لیڈن سنہ ۱۹۱۰ء ج اتن صفحہ ۳)

۲۱۔ صفحہ ۲۱۷ کالم ۲۔ خاقانی ایران کا مشہور شاعر منوچہر بادشاہ ایران کے عہد میں گزرا ہے اس کو سلطان الشعراء کا خطاب ملا تھا، اس کا نام افضل الدین ابراہیم بن علی شروانی تھا، شیروان کا رہنے والا، فلکی کا شاگرد تھا، اسی نے اس کو خاقانی کا خطاب عطا کیا تھا۔ تحفۃ العراقین کا مصنف ہے، ایک دیوان فارسی اور ایک کتاب موسومہ ہفت اقلیم بھی اسی کی تصنیف سے مشہور ہے بمقام تبریز سنہ ۵۸۲ھ میں وفات پائی۔

خاقانی کا تخلص ابتدا میں حقائقی تھا۔ خاقان کبیر منوچہر کے دربار میں جب یہ پہونچا تو سلطان نے اسے خاقانی کے لقب سے ملقب کر دیا اور بادشاہ کی مناسبت سے اس نے اپنا تخلص خاقانی اختیار کیا۔ خاقانی ابو العلا گنجوی کا شاگرد تھا اور فلکی کو بھی اسی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حمد اللہ مستوفی نے خاقانی کو فلکی کا شاگرد بتلایا ہے جو نادرست ہے۔ خاقانی رفعت تخیل اور پختگی میں فلکی سے بہت سبقت رکھتا ہے اور یہ دونوں خاقان اکبر کے درباری رہے ہیں۔ مولانا آزاد بلگرامی نے حبیب السیر کے مصنف کے حوالہ سے لکھا ہے کہ خاقانی سنہ ۵۹۵ھ تک بقید حیات موجود تھا۔ خاقانی نے ہفت اقلیم نامی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے۔ ہفت اقلیم بہت بعد کی کتاب ہے جس کو امین احمد رازی نے سنہ ۱۰۰۲ھ میں بعہد شہنشاہ اکبر لکھا ہے۔ (تذکرہ مجمع الفصحا صفحہ ۲۰۰، خزانۂ عامرہ صفحہ ۲۰۴، نتائج الافکار صفحہ ۱۲۹)

۲۲۔ صفحہ ۲۱۸ کالم ۱۔ خالدون۔ صحیح لفظ خلدون ہے۔

۲۳۔ صفحہ ۲۲۰ کالم ۲۔ خانخاناں بیرم خاں وزیر شہنشاہ اکبر اور اس کے بیٹے عبد الرحمٰن خاں وزیر شہنشاہ مذکور تاریخ میں اسی خطاب سے مشہور ہیں۔
بیرم خاں کے بیٹے کا نام عبد الرحمٰن نہیں بلکہ عبد الرحیم خانخاناں ہے۔

۲۴۔ صفحہ ۲۲۲، کالم ۲۔ خواجہ حسن صدر الدین نظامی کتاب تاج المآثر کا مصنف تھا جو اس نے سلطان قطب الدین ایبک بادشاہ دہلی کے نام پر ۶۰۵ھ میں معنون کی تھی۔

تاج المآثر کے مصنف کا نام نظام الدین حسن نظامی ہے۔ جو نظامی عروضی سمرقندی مصنف چہار مقالہ کا فرزند تھا (تاریخ گزیدہ طبع لیڈن صفحہ ۸۲۶) نام کے تحقیق کرنے میں روضۃ الصفا اور کشف الظنون کے مصنفین کو بھی دھوکا ہوا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں تاج المآثر کا جو مخطوطہ ہے وہ بہت قدیم نسخہ سے جو صدر الملۃ والحق مولانا محمد بن محمد المحوبی کا تھا نقل کیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں خواجہ حسن صدر الدین کی تقریظ ہے، جس میں مصنف کی غیر معمولی تعریف کی گئی ہے۔ بقول سرہنری الیٹ دیباچہ نگار کے نام کی بنا پر مؤلف کا نام بھی صدر الدین خیال کیا گیا۔ تاج المآثر قطب الدین ایبک کے نام پر منسوب نہیں ہے بلکہ اس کی خوشنودی کی خاطر لکھی گئی ہے۔ اس کا سلسلہ تالیف قطب الدین کی وفات (۶۰۷ھ) کے بعد بھی جاری تھا۔ تاج المآثر کے عام نسخوں میں ۶۱۴ھ تک حالات ہیں، لیکن الیٹ نے نواب ضیاء الدین خاں دہلوی کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ دیکھا تھا جس میں سلطان شمس الدین کے آخری عہد یعنی ۶۲۶ھ تک واقعات تحریر ہیں۔

۲۵۔ صفحہ ۲۲۸ کالم ۲۔ خواجہ محمد مقیم ملاحظہ ہو نظام الدین احمد۔

خواجہ محمد مقیم خواجہ نظام الدین احمد کے والد کا نام ہے۔

۲۶۔ صفحہ ۲۳۳ کالم ۲۔ دارا شکوہ بن شاہجہاں کے بیان میں تحریر کیا ہے کہ اس نے ایک سنسکرت کتاب موسومہ اپنگھٹ کا ترجمہ کرایا جس کا نام سر الاسرار رکھا۔ اس ترجمہ کا نام سر اکبر ہے۔

۲۷۔ صفحہ ۲۴۲۔ کالم ۱۔ دردمند محمد تقی دہلوی کا تخلص ہے جو مرزا جانجاناں کے مرید تھے۔ انھوں نے ایک دیوان اور ساقی نامہ تصنیف کیا ہے۔ مرشد آباد میں ۱۱۷۵ھ میں انتقال کیا۔

محمد تقی دردمند کوئی شاعر نہیں گزرا ہے، البتہ محمد فقیہ دردمند ایک مشہور شاعر ہوئے ہیں جو جانجاناں کے شاگرد و مرید تھے۔ جنھوں نے ساقی نامہ تصنیف کیا تھا مؤلف کا انہی کی جانب اشارہ ہے۔ محمد فقیہ دردمند کے ساقی نامہ کا میر تقی میر، میر حسن اور لالہ لچھمی نراین شفیق نے اپنے تذکروں میں ذکر کیا ہے۔ (نکات الشعراء صفحہ ۲۰، تذکرہ اردو شعراء از میر حسن صفحہ ۲۴، چمنستان شعراء صفحہ ۷۰)

۲۸۔ صفحہ ۲۴۲ کالم ۲۔ دولت شاہ بختی شاہ کا بیٹا تھا اور تذکرہ دولت شاہی کا مصنف ہے۔ سلطان حسین والی ہرات کے زمانہ میں گذرا ہے۔ یہ کتاب ۸۹۲ھ میں لکھی گئی تھی

دولت شاہ کے والد کا نام علاءالدین بختی شاہ تھا جو شاہرخ بن تیمور کے مشہور درباریوں سے تھا اس کا چچا فیروز شاہ بیگ شاہرخ مرزا کے مشاہیر سے تھا اور بھائی امیر رضی الدین بڑا جید عالم اور بہادر آدمی تھا۔ محمد خدائی داد کی سرکار سے متوسل تھا دولت شاہ نے تذکرہ کو ۱۴۸۷ء میں تمام کیا۔ مراۃ الصفا کے مصنف نے دولت شاہ کا سنہ وفات ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء تحریر کیا ہے۔ تذکرہ دولت شاہ ایک مستند تذکرہ ہے جسے تذکرۃ الشعراء بھی کہتے ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اس کی ترتیب میں تاریخ و تراجم کی ۳۷ کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

۲۹۔ صفحہ ۲۴۷ کالم ۲۔ رابعہ دورانی ...... اورنگ زیب کی بی بی تھی ...... اس کا مقبرہ اس کے بیٹے محمد اعظم نے بعینہ تاج محل کے نمونہ پر بنانا چاہا مگر اورنگ زیب کی روک ٹوک سے اس کی تکمیل نہ ہوسکی صرف دروازے۔ کی بنی کے ایک پہلو میں یہ الفاظ کندہ ہیں "ایں روضہ منورہ در معماری عطاءاللہ لعل ہیبت رائے تیار شد ۱۰۸۱ھ"

رابعہ دورانی کا روضہ مکمل حالت میں اس وقت تک موجود ہے اور اس کی روشیں اور حصار بھی باقی ہے اور کوئی حصہ نامکمل نہیں ہے۔ اس میں دو کتبہ کندہ ہیں، جن میں سے صرف ایک نقل کیا گیا ہے دوسرا یہ ہے "ایں دروازہ باہتمام رفعت پناہ آقا ابوالقاسم بیگ داروغہ تیار شد" پہلے کتبہ میں بجائے ۱۰۸۱ھ کے ۱۰۸۰ھ ہونا چاہیئے۔

۳۰۔ صفحہ ۲۳۸ کالم ۲۔ دریا عماد شاہ نے اپنی بہن ربیعہ کی شادی ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے کی۔

دریا عماد شاہ کی بہن کا نام رابعہ بی بی ہے۔

۳۱۔ صفحہ ۲۴۴ کالم ۲۔ راجو قتال مخدوم جہانیاں جہاں گشت شیخ جلال کے بھائی تھے، ان کا شمار بھی اکابر اولیا میں ہے۔ تحفۃ النصائح ان کی تصنیف ہے۔ ۸۰۰ھ میں انتقال کیا ان کا مزار ملتان میں اوچھ کے قریب واقع ہے۔

حضرت راجو قتال حسینی مشہور بزرگ اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید تھے، آپ اہل و عیال کے ہمراہ ۷۲۵ھ میں دولت آباد تشریف لائے ۵ شوال ۷۳۱ھ میں یہیں وصال فرمایا۔ آپ کا مزار خلد آباد میں مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز جو دکن کے مشہور بزرگ ہیں آپ ہی کے فرزند ہیں۔ بعض مورخین نے تحفۃ النصائح کو آپ سے منسوب کر دیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ شیخ یوسف دہلوی کی تصنیف ہے جسے انھوں نے ۷۹۵ھ میں تصنیف کیا تھا اس کا

دکنی ترجمہ ملا قطبی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں کیا۔ شیخ یوسف دہلوی حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید تھے (تاریخ الاولیا جلد ۲ صفحہ ۲۰۵، ارمغان سلطانی صفحہ ۴۰، روضۃ الانخطاب صفحہ ۸۴۔ اردوے قدیم صفحہ ۶۷)

۳۲۔ صفحہ ۲۶۷ کالم ۲۔ رنگین، سعادت یار خاں نام رنگین تخلص، ان کا خاندان روم سے آکر ہندوستان میں آیا تھا۔ رنگین ایک تجارت پیشہ تھا، اس نے ایک تاجر کی حیثیت سے تمام ہندوستان کی سیاحت کی...... شاہ حاتم کا شاگرد تھا، اردو میں ریختی اس کی ایجاد ہے، چار دیوان اور پانچ مثنویات یادگار ہیں جن میں سے فرسنامہ رنگین نامہ اور مجالس رنگین مشہور ہیں۔

رنگین کا خاندان توران سے آکر چند روز کے لئے لاہور میں مقیم ہوا اس کے بعد دلی آیا، تجارت ان کا آبائی پیشہ نہ تھا کبھی کبھی کر لیا کرتے تھے۔ اسی طرح یہ کئی مرتبہ لکھنؤ آئے اور گئے ہیں۔ لکھنؤ کے سوائے انھوں نے بہت کم شہروں کی سیر کی ہے۔ رنگین ریختی کے موجد نہیں ہیں بلکہ یہ ان سے بہت پہلے زمانہ کی ایجاد ہے، جس کا صحیح زمانہ ابتک متعین نہیں ہوا ہے۔ دکن میں ایک صاحب علی عادل شاہ بیجاپور اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں گزرے ہیں جن کا تخلص ہاشمی ہے، انھوں نے ریختی میں بہت کچھ کہا ہے، ان کے بعد دکن میں اور بہت سے شعرا ہوئے ہیں جن کا ہنوز پتہ نہیں لگا ہے۔ چونکہ رنگین نے ریختی کو بہت ترقی دی ہے اسی وجہ سے ان کو اس کا موجد خیال کیا جاتا ہے اور اسی خیال کو قاموس المشاہیر میں جگہ دی گئی ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں رنگین کی جس قدر مثنویات اور دیوان موجود ہیں ان کی ایک مجمل تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ رنگین کا پہلا دیوان، ریختہ۔ نورتن کا پہلا حصہ، بخط رنگین

۲۔ رنگین کا دوسرا دیوان، ریختہ " دوسرا حصہ "

۳۔ رنگین کا تیسرا دیوان آمیختہ " تیسرا حصہ ہزلیات "

۴۔ رنگین کا چوتھا دیوان انگیختہ " چوتھا حصہ ریختی "

۵۔ مجموعہ رنگین — نورتن کا پانچواں حصہ قصائد و غزلیات کا مجموعہ سات زبانوں میں بخط رنگین

۶۔ مجالس رنگین — نورتن کا چھٹا حصہ — بخط رنگین

۷۔ امتحان رنگین — " ساتواں حصہ "

۸۔ اخبار رنگین، نورتن کا آٹھواں حصہ مصنف نے بعض چشم دید واقعات نظم کئے ہیں بخط رنگین

۹۔ بہشت [illegible] رنگین

۱۰۔ ایجاد رنگین — شش جہت کا پہلا حصہ (مجموعۂ حکایات)

۱۱۔ عجائب و غرائب رنگین، شش جہت کا دوسرا حصہ

۱۲۔ داستان رنگین — شش جہت کا تیسرا حصہ، اس کا دوسرا نام مثلث رنگین ہے اس میں تین رسالے ہیں، شہر آشوب، کہاوت ہائے رنگین، حکایات رنگین۔

۱۳۔ چار چمن — شش جہت کا چوتھا حصہ — بخط رنگین

۱۴۔ پنجۂ رنگین — " پانچواں حصہ — "

۱۵۔ نظم رنگین — پنجۂ رنگین کا چوتھا حصہ (سو حکایات) — "

۱۶۔ داستانِ رنگین — " پانچواں حصہ (سرگذشت آغا عزیز سوداگر گجرات)

۱۷۔ خمسۂ رنگین — رنگین کے پانچ خمسوں کا مجموعہ — بخط رنگین

۱۸۔ جنگنامہ رنگین — ۱۹۔ حکایت رنگین

۲۰۔ نصاب رنگین — ۲۱۔ حکایات رنگین

۲۲۔ سبع سیارہ رنگین۔ رنگین کے سات تصنیفات کا مجموعہ۔

رنگین کی تصنیفات بہت کثیر تعداد میں ہیں اور بہت کم شعرائے اتنا سرمایہ اپنی یادگار میں چھوڑا ہوگا۔ (گل رعنا صفحہ ۲۶۴۔ اردوے قدیم صفحہ ۹۱۔ رسالہ اُردو جلد ا نمبر ۴، استفادہ از مضمون انڈیا آفس کی مخطوطات نوشتہ مولوی حکیم سید شمس اللہ قادری)

۳۳۔ صفحہ ۲۸۶ کالم ا۔ سرخوش نے اپنے ہمعصر شعرا کا ایک تذکرہ لکھا ہے، جس کا تاریخی نام کلامۃ الشعرا ہے۔

سرخوش کے تذکرے کا نام کلمات الشعرا ہے جو تاریخی نام ہے جس سے ۱۰۹۳ھ بر آمد ہوتے ہیں۔

۳۴۔ صفحہ ۲۹۲ کالم ا۔ سعدی دکنی دکن کا رہنے والا تھا، کچھ ابیات کا مصنّف ہے۔

اس بیان میں صرف اس قدر اضافہ کیا جاتا ہے کہ سعدی دکنی کا مزار برہانپور میں واقع اور مرجع خاص و عام ہے۔ غالباً یہ برہانپور کے رہنے والے تھے

(چمنستان الشعراء صفحہ ۳۹۵)

تنقید کتب

عزیز اللغات

مؤلفہ مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی۔ کراؤن سائز، حجم تقریباً ..۸ صفحات مجلد، قیمت قسم اول ؎ قسم دوم ؎ ملنے کا پتہ مطبع انوار احمدی الہ آباد۔

یہ لغت خالص اردو لغات و محاورات و ضرب الامثال پر مشتمل ہے، کہیں کہیں عربی و فارسی کے الفاظ بھی ہیں۔ اس لغت کے لکھنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ "طلبا مدارس صحیح اور مروجہ زبان اور محاورات سے واقف ہوں، اور اردو لکھنے پڑھنے میں مستند محاورات کا استعمال کر سکیں...... اس لغت میں ردیف وار اردو کے لغات اور محاورات یکجا کر دیے گئے ہیں اور ان کے معنوں میں جو فرق ہے وہ بھی بیان کر دیا گیا ہے...... جب تک طلبا اردو زبان کے الفاظ و محاورات سے واقف نہ ہونگے وہ اردو عبارات فصیح و دلآویز نہ لکھ سکیں گے۔ ان ضروریات کا لحاظ کر کے یہ لغت لکھا گیا ہے۔ اس کے ضمیمہ میں اخباری محاورات کا انتخاب بھی ہے، دوسرے ضمیمہ میں وہ انگریزی الفاظ ہیں جو زبان اردو میں جذب ہوتے جاتے ہیں۔ اس لغت کے لکھنے سے اصل منشا یہ ہے کہ طلبا، مدارس اس کے مطالعہ سے اردو لکھنے کا صحیح مذاق پیدا کریں اور نوشت و خواند میں اسی فصاحت و سلاست کا لحاظ رکھیں جس پر اردو زبان کا اطلاق ہو سکے اور یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ ٹکسالی زبان سیکھیں اور صحیح محاورات کو مستحضر کر لیں"

یہ لغت مندرجہ بالا مقاصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتا ہے اور ہم مولانا عزیز صاحب کو یہ مفید لغت مرتب کرنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

اردوے قدیم

از حکیم سید شمس اللہ قادری (ایڈیٹر رسالہ "تاریخ" حیدرآباد دکن) رائل سائز، حجم تقریباً ..۲ صفحات۔ مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ

حکیم سید شمس اللہ قادری کا نام دنیاے ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کے علمی و تاریخی محققانہ مضامین اردو، زمانہ اور دوسرے رسائل میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں، آپ نے متعدد کتابیں بھی

تالیف کی ہیں جن میں سے ایک "اردوے قدیم" اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں اردو زبان کی ابتدا سے لیکر بارھویں صدی ہجری تک اردو کی درجہ بدرجہ ترقی کا ذکر کیا ہے اور ضمناً ہر عہد کے سلاطین، مصنفین و شعراء کا ضروری تذکرہ بھی حوالہ قلم کیا ہے۔ آخر میں نظم و نثر کے نمونے درج کر دیے ہیں جن سے اردو کی ابتدائی طرز تحریر اور تدریجی ترقی کا اندازہ کرنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

حکیم صاحب نے اس کتاب کی تالیف میں ایک سو سے زیادہ عربی۔ فارسی، اردو، انگریزی وغیرہ زبانوں کی کتابوں سے مدد لی ہے۔ نیز یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم۔اے کے نصاب میں داخل ہے اور یہ دونوں باتیں اس کی اہمیت کی کافی ضمانت ہیں۔

ہم حکیم صاحب کو اس کامیاب کتاب کی تالیف پر مبارکباد دیتے ہیں اور بہی خواہان اردو سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اس کے مطالعہ سے مستفید ہونگے۔

قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب

از رائے بہادر مہامہوپادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا

رائل سائز تقریباً ۲۵۰ صفحات۔ مجلد قیمت چار روپے للعہ

ملنے کا پتہ: ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد

یہ کتاب اُن تین معرکۃ الآرا لیکچروں کا مجموعہ ہے جو ہندوستانی اکیڈیمی کی سرپرستی میں تمبر ۱۹۲۸ء کو ہندی زبان میں دیئے گئے تھے۔ رائے بہادر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کا شمار ملک کے خاص محققین میں ہے چنانچہ ان لکچروں میں انھوں نے تاریخی تحقیقات کی خوب داد دی ہے۔ فاضل مصنف نے نہایت محنت و جانفشانی سے ۶۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک کے زمانہ کی ہندوستانی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ پہلا لکچر مذہب و معاشرت سے متعلق ہے، دوسرا ادبیات اور تیسرا سیاسی و تمدنی حالت پر ہے۔ ہر لیکچر میں اس کے متعلق موضوع پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بودھ، جین۔ برہمن وغیرہ دھرم کی ابتدا اور زوال، عقائد، ہوم مورتوں کی پرستش کے طریقے، غذا، لباس، نظام سلطنت، تعلیم، صنعت و حرفت، غرض کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ اور اس طرح یہ مجموعہ مذکورہ بالا چھ سو سال کی طویل مدت کی تہذیب و تمدن کی مختصر تاریخ ہے۔ اس وقت ہم اس عالمانہ تصنیف کا صرف ایک مختصر ذکر کر رہے ہیں مستقل ریویو کسی آئندہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین ہوگا۔ اردو ترجمہ منشی پریم چند صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور ہم کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ترجمہ کی زبان بہت آسان و عام فہم ہے۔ مہاتما بودھ۔ وشنو۔ شیو۔ برہما وغیرہ دیوتاؤں کے قدیم مجسموں اور بعض مندروں کی جو بیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔

ہندی شاعری

از ڈاکٹر اعظم کریوی - رائل سائز ۲۰۴ صفحات مجلد قیمت ؏
ملنے کا پتہ : ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد

ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی جدید مطبوعات میں یہ کتاب بھی بہت دلچسپ ہے۔ ہندی شاعری کے متعلق اُردو زبان میں مختصر مضامین تو اکثر لکھے گئے ہیں مگر مستقل کتاب ایک آدھ سے زیادہ شائع نہیں ہوئی، اور یہ بھی کسی طرح سے مستند یا جامع نہیں کہی جاسکتی ہیں۔ کتاب زیر ریویو میں ایک دیباچہ اور دو ابواب ہیں، دیباچہ میں ہندی بھاشا کی پیدائش اور شاعری کی ابتدا، مشہور ہندو مسلمان شعراء اور ہندی شاعری کی خصوصیات پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے پہلے باب میں تلسی کرت رامائن پر اظہار خیال کرنے کے بعد (۱) پریم کی پھلواری (۲) مناظر قدرت کی مصوری (۳) فلسفہ اخلاق و حسن معاشرت عنوانات کے ماتحت رامائن کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں، اور دوسرے باب میں ہندی زبان کے مشہور ہندو مسلمان شعراء کے مختصر حالات اور ان کے مختلف دوہوں کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔

مختلف عنوانات کے تحت میں جو اقتباسات اور دوہے پیش کئے گئے ہیں اُن کو اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھا گیا ہے مشکل الفاظ کے معنی اور پھر پورا مطلب بھی بیان کر دیا گیا ہے تاکہ ہندی نہ جاننے والے اصحاب اس کے مطالعہ سے پورا لطف اٹھا سکیں۔

اگرچہ اس کتاب میں رامائن کے اقتباسات کے علاوہ جو کچھ ہے وہ صرف ہندی نظم کی ایک قسم دوہوں پر مشتمل ہے، کسی مختصر نظم، چھند، کبت وغیرہ کا کوئی نمونہ نہیں پیش کیا گیا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے، حضرت نیاز کے جذبات بھاشا یا حیدر آباد کے مطبوعہ منتخبات ہندی کلام کے مقابلہ میں یہ کتاب زیادہ دلچسپ ہے اور ڈاکٹر اعظم کریوی اور ہندوستانی اکیڈیمی دونوں شکریہ کے مستحق ہیں جن کی کوشش سے یہ کتاب مرتب و طبع ہو کر شائقین تک پہونچ گئی۔

ترقیِ زراعت

از خانصاحب مولوی محمد عبد القیوم، ڈپٹی ڈائرکٹر محکمۂ زراعت۔ رائل سائز، تقریبًا ۲۲۵ صفحات۔ قیمت للعہ ملنے کا پتہ: ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد۔

ہندوستان کی زمین بہت زرخیز مشہور ہے اور آجکل کی گئی گزری ہوئی حالت میں بھی بقول کسے یہ زمین سونا اُگلتی ہے مگر کاشت کے طریقے بہت پرانے ہیں اور اس لئے زیادہ پیداوار حاصل نہیں ہوتی۔

اس کتاب میں زمین کی قسمیں، کھاد، فصلیں، بیج وغیرہ کے متعلق نہایت کار آمد باتیں لکھی گئی ہیں کس قسم کی زمین میں کون جنس بونی چاہیئے، کس قسم کی کھاد اور کس مقدار میں ڈالنی چاہیئے۔ کس صورت

میں زمین کی جوتائی، بوائی، کھیتوں کی آبپاشی، نرائی وغیرہ کرنی چاہیئے۔ یہ سب باتیں اس کتاب میں نہایت تفصیل کے ساتھ بتلائی گئی ہیں۔ فصلوں کے بونے کا وقت، بیج بونے کا طریقہ، فصل کو کیڑا لگ جانے کی صورت، اس کے دفعیہ کی تدبیر کے علاوہ مویشی پالنا، ان کی قسمیں، بیماریاں، علاج، غرض لائق مصنف نے فن زراعت کے متعلق سبھی ضروری باتیں اس میں یکجا کر دی ہیں۔

اس کے لائق مصنف صوبہ متحدہ کے محکمۂ زراعت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار ہیں اس لئے جتنی باتیں اس کتاب میں درج کی گئی ہیں وہ سب مجرب و آزمودہ ہونیکی وجہ سے علمی حیثیت سے مفید و کارآمد ہیں۔ اس کے دیباچہ میں اس امر پر کافی زور دیا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو زراعت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور جدید ترقی یافتہ اصول پر زراعت کر کے ملک کی پیداوار بڑھانی چاہیئے۔ اس صورت میں تعلیم یافتہ حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہترین رہنما کا کام دیگا۔

مختلف قسم کے نقشے اور مویشیوں وغیرہ کی باون ۵۲ تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں اور ان سے اس کی دلچسپی میں قابل قدر اضافہ ہو گیا ہے۔ اکیڈیمی کی تمام اردو مطبوعات اردو ٹائپ میں طبع کی جاتی ہیں، کاغذ بھی دبیز اور عمدہ استعمال ہوتا ہے، مطبوعات نہایت خوبصورت اور مجلد ہوتے ہیں

خواب و خیال

از مسٹر مجنوں بی۔اے۔ گورکھپوری۔ کراؤن سائز ۲۶۵ صفحات قیمت ۶/

ملنے کا پتہ: ایوان اشاعت، گورکھپور

مسٹر مجنوں افسانہ نگاری میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ کتاب انکی چند مختصر افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ شروع میں ایک مختصر جذباتی مضمون اور حسب دستور ایک طویل دیباچہ ہے جسکے بعد آٹھ قصے ہیں جو غالباً سب کے سب ملک کے مختلف رسائل میں طبع ہو چکے ہیں اور اب کتابی صورت میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

عموماً ہر افسانہ دلچسپ ہے اور نتیجہ خیز ہے، مصنف کا طرز تحریر دلکش ہوتا ہے۔ اس مجموعہ کے ساتھ جناب مجنوں کی عکسی تصویر بھی ہدیۂ ناظرین ہے، لکھائی چھپائی صاف و پسندیدہ ہے۔

بلیک میل

جناب ظفر قریشی دہلوی بی۔اے (کٹڑہ مہرپرور دہلی) کا ایک مختصر جاسوسانہ ناول ہے۔ طرز بیان انگریزی سے ملتا جلتا ہے اور دلچسپی سے خالی نہیں۔ قیمت غالباً ۸/ رہے، حجم ۶۰ صفحات۔

آنریبل مسٹر ہیگ ہوم ممبر
گورنمنٹ ہند

ہز ایکسلنسی سر جیمس ڈیوڈ سن
گورنر بہار و اڑیسہ
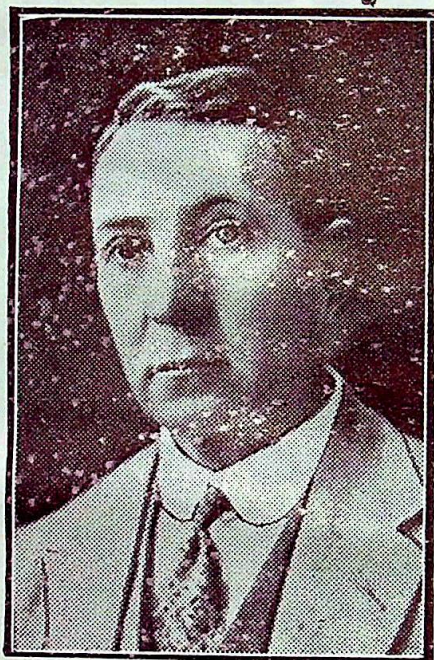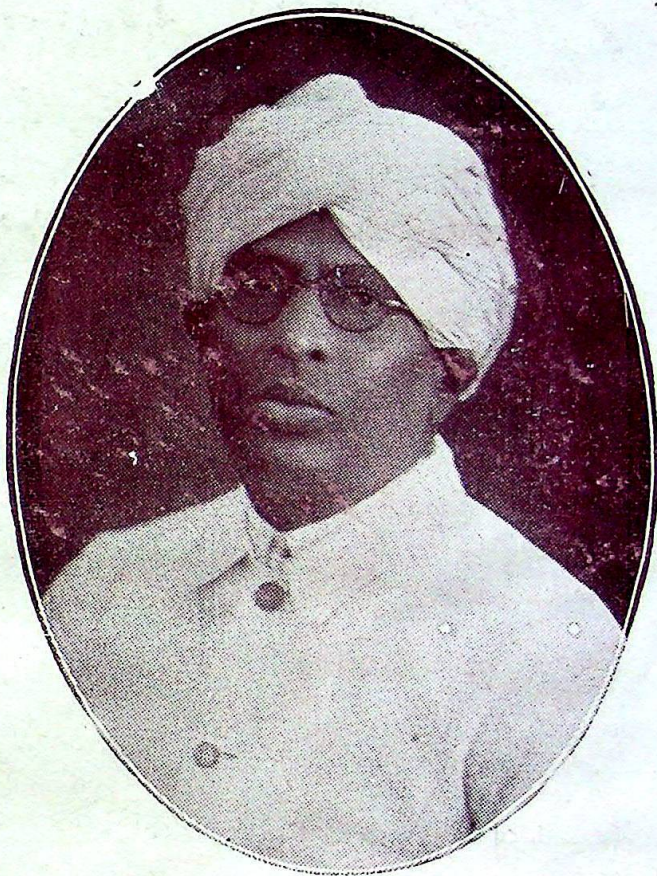
ملک التجار مسٹر وال چند ہیرا چند پریزیڈنٹ اجلاس
دہلی آل انڈیا چیمبر آف کامرس فیڈریشن

کلام شاد

(از سید الشعرا خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی۔ مرحوم)

رباعیات

مہلت کہیں اک آن تو لینے دے مجھے
کیا چیز ہے پہچان تو لینے دے مجھے
کچھ ختم نہیں ہے دور ساقی للہ
اِس مے کو ذرا چھان تو لینے دے مجھے

طاقت تنِ ناتواں کی سب دور ہوئی
خم ہو گئی پشت آنکھ بے نور ہوئی
کیا شوخ مزاج تھی جوانی میری
پیری سے ملا کے آپ کافور ہوئی

پیری کے ہیں دن گئی جوانی اپنی
ہم چھوڑ چلے بہت نشانی اپنی
اوروں کی تو سُن چکے کہانی ہم سے
اوروں سے سنو گے اب کہانی اپنی

کیوں کر نہ رہے غمِ نہانی میرا
دنیا میں بتا کون ہے ثانی تیرا
ہم لیکے عصا دُور تلک ڈھونڈھ آئے
کوسوں نہیں نام لے جوانی تیرا

غزل

تہِ شمشیر کیا مشکل ہے رکھنا اپنی گردن کا
مگر آساں نہیں پہچاننا قاتل کی چتون کا

خرامِ ناز میں ڈورا ہی کھاتا ہے گردن کا
نہیں اُٹھتا مرے نازک بدن سے بوجھ دامن کا

بتا بے فائدہ کیوں پوچھتا ہے خاک کا میری
جھٹکنا یاد کر اے بے مروت اپنے دامن کا

کوئی صہبا کشی میں طاق کوئی مے پرستی میں
خراباتِ مغاں میں جمع ہے اُستاد ہر فن کا

بلائیں میکدے کی دور خم آباد مے کش خوش
ہمیشہ جام پر سایہ رہے ساقی کے دامن کا

نکالے بیٹھ کر کانٹے نہ اپنے پائے زخمی کے
کبھی بھولے بھی دل توڑا نہ ہم نے اپنے دشمن کا

ترے در سے ہمیں دیر و حرم میں کھینچتے کیوں ہیں
نہ لوٹا شیخ کو ہم نے نہ گھر چھینا برہمن کا

بہارِ باغ جاتی ہے کہو بُلبُل سنبھل بیٹھے
قریب آیا زمانہ نالہ و فریاد و شیون کا

نکل آئے ہم آخر ڈوب کر دریائے ہستی سے
کوئی کونا تو کیا اک تار بھی بھیگا نہ دامن کا

مرا آرام پہونچا پا گیا اوروں کے ہاتھوں میں
پھر اے پیری زمانہ آ گیا اپنے لڑکپن کا

بہت جب سوچتا ہوں شاد کچھ کچھ یاد آتا ہے
مزا اس زندگی کا خواب تھا وہ بھی لڑکپن کا

سروشِ بیداری

از جناب محمود اسرائیلی

مشرق کا بدل گیا ستارہ ہر ذرہ بنا ہے ماہ پارہ
ہے نام کو ظلمت آشکارہ یہ بھی نہ رہیگی جو رہی ہے

دنیا بیدار ہو رہی ہے

گلشن کا صبا نے رنگ بدلا بلبل نے فغاں کا ڈھنگ بدلا
آئین محاذِ جنگ بدلا اے قوم! مگر تو سو رہی ہے

دنیا بیدار ہو رہی ہے

رفتار جہاں پر اک نظر کر ہر قوم ہوئی ہے صلح پرور
ہے کشتِ مراد بار آور تو تخمِ عناد بو رہی ہے

دنیا بیدار ہو رہی ہے

ہے بحرِ حیات ولولہ خیز یارانِ وطن نکل گئے تیز
کہہ کہہ کے تو حرف یاس انگیز اپنی کشتی ڈبو رہی ہے

دنیا بیدار ہو رہی ہے

ہر قوم ہے زندگی کی طالب آزادی و ہمسری کی طالب
تو بادۂ بیخودی کی طالب آنکھیں اشکوں سے دھو رہی ہے

دنیا بیدار ہو رہی ہے

جرأت تھے جو کچھ دکھانیوالے منزل پہ گئے وہ جانے والے
تجھ میں نہ تھے دُکھ اُٹھانیوالے اپنی قسمت کو رو رہی ہے

دنیا بیدار ہو رہی ہے

ہر تارِ نفس ہے سازِ ہستی ہر نغمہ ہے اس کا رازِ ہستی
اے قوم کرامتیازِ ہستی کیوں مفت یہ وقت کھو رہی ہے

دنیا بیدار ہو رہی ہے

نمودِ سحر

(از منشی گورسرن لال ادیب لکھنوی، بی۔اے)

مانیِ فطرت نے کھینچی چرخ پر تصویرِ صبح — لوحِ مشرق پر نظر آنے لگی تنویرِ صبح
عرش سے تا فرش پھیلی عزت و توقیرِ صبح — ذرے ذرے سے عیاں ہونے لگی تاثیرِ صبح
صبح کیا ہے آیتِ والشمس کی تفسیر ہے
خواب تھی ظلمت تو یہ اس خواب کی تعبیر ہے

ہو گئے رخصت فلک سے جتنے تھے شب زندہ دار — ماہِ تاباں نے بھی کر لی بند چشمِ انتظار
تیرگی کے ہٹ گئے پیچھے قدم بے اختیار — لُٹ گئی آخر عروسِ شب کے گلشن کی بہار
سکۂ زرّینِ اعظم کا جاری ہو گیا
تیرگیِ شب کی قسمت کا ستارہ سو گیا

اللہ اللہ چرخ پر سلطانِ خاور کا جلال — آنکھ بھر کر دیکھ لے کوئی کہاں اتنی مجال
پردۂ آئینہ سے بھی دیکھ لینا ہے محال — شوقِ نظارہ میں جلتے ہیں نظر کے پر و بال
یہ چمک ایسی تجلی اُف یہ عالم نور کا
کھاتے ہیں اہلِ نظر دھوکا چراغِ طور کا

الغرض جاری ہوا گردوں سے فرمانِ سحر — سب نے دیکھا محفلِ ہستی کو آنکھیں کھول کر
گو بہت تکلیف سے آنکھوں میں کاٹی رات بھر — قیدِ مژگاں سے رہائی پا گئی آخر نظر
دم کے دم میں اک طلسمِ دلفریبی ہو گیا
نصف عالم جاگ اُٹھا نصف عالم سو گیا

نور کا عالم نظر آتا ہے تا حدِّ نظر — ذرے ذرے میں سرایت کر گیا نورِ سحر
مادے ہی تک نہیں محدود کچھ اس کا اثر — بلکہ عالم وجد کا طاری ہوا ہے روح پر
جاگ اُٹھے جذبات جو سوئے ہوئے تھے دل میں

زلزلہ سا آگیا دنیائے احساسات میں

یوں تو ہر عالم میں ہنگامِ سحر ہے خوشگوار
تھی مگر صبحِ وطن کی اور ہی دلکش بہار

پہلے سنتے تھے مگر آتا نہ تھا کچھ اعتبار
آہ غربت میں بدل جاتے ہیں یوں لیل و نہار

یہ سہانا وقت ہے اور میں وطن سے دُور ہوں
اُڑ کے جا سکتا نہیں اِک بندۂ مجبور ہوں

افسوس اے وطن

از پنڈت اندجیت شرما (ماچھرہ ضلع میرٹھ)

دورِ خزاں نے لوٹ لیا ہے ترا چمن
گُل ہیں نہ یاسمن
اب کس طرح کہوں تجھے پھولوں کی انجمن
افسوس اے وطن

بغض و نفاق و کینہ سے اک حشر ہے بپا
مسموم ہے فضا
تہذیب رو رہی ہے کہ بگڑا ترا چلن
افسوس اے وطن

اخلاص و اتحاد کا نام و نشاں نہیں
اِس دَور میں کہیں
ہے کشمکش میں چاک محبت کا پیرہن
افسوس اے وطن

گرداب میں بلا کے ہے کشتی حیات کی
اس کائنات کی
رنج و غم و ملال کا دریا ہے موجزن
افسوس اے وطن

افسردہ ہو کے رہ گیا قلبِ شرر فشاں
وہ جوش اب کہاں
جامِ خیال ہی میں نہیں بادۂ کہن
افسوس اے وطن

تصویر ہے تو یاس کی حرماں نصیب ہے
ملکِ غریب ہے
دنیا کی ہے نگاہ میں اک لاشِ بے کفن
افسوس اے وطن

رُباعیّات

(از مولانا سید احمد حسین امجد حیدر آبادی)

پہنچے غفلت میں دام و دد کی حد تک
معلوم ہوئی نہ نیک بد کی حد تک
کھلتی ہیں ضرور، بند آنکھیں اک دن
سوتے رہو مہد میں، لحد کی حد تک

حد نظر روح ہے تن کا پردہ
ہے مانعِ دید، ما و من کا پردہ
ہو جائیں گے مرتفع حجابات تمام
آنکھوں پہ پڑیگا جب کفن کا پردہ

ہر رات مرا رشکِ قمر آتا ہے
وہ چارہ گرِ دردِ جگر آتا ہے
ہے خیمۂ لیل میں قیام لیلےٰ
تاریکی ہی میں نور نظر آتا ہے

شمشیر محبت یہ گلا رہنے دے
ہاں! جان کے ساتھ یہ بلا رہنے دے
امجد شبِ ہجر میں نہ کر بند آنکھیں
وہ آئے گا، دروازہ کھلا رہنے دے

(از منشی بشن سنگھ خوشتر حیدر آبادی)

ساغر کی طرح رنگ کہیں لائے نصیب
شیشہ کی طرح کاش اُبل جائے نصیب
اک کالی گھٹا جھوم کے قبلے سے اُٹھے
گیسو کی طرح آج جو بل کھائے نصیب

ٹوٹے ہوئے ساغر جنھیں ہم سمجھے تھے
پھوٹی ہوئی قسمت کے وہ ٹکڑے نکلے
دکھلا گئی یہ شکستِ توبہ افتاد
چکرا کے گرے زمین پہ پیتے پیتے

ہر اوج کو پستی کے برابر سمجھو
خورشید کو ذرہ سے نہ بڑھکر سمجھو
تقدیر جو کھوٹی ہو تو پھر اے خوشتر
پارس بھی لگے ہاتھ تو پتھر سمجھو

سرسبز رہے دہر کا گلشن کبتک
پُر پھولوں سے گلچیں کا یہ دامن کبتک
نزدیک ہے اب وقتِ خزاں اے خوشتر
غفلت تری اور عقل کے دشمن کبتک

کرتا ہے پریشاں جو غمِ روزِ شمار
دیتی ہے تسلی تری رحمت ہر بار
کچھ غم نہیں اب اپنے گناہوں کا مجھے
میں بندۂ عاصی ہوں ترا تو غفار

پیکرِ ایثار

(از منشی تلوک چند صاحب محروم، بی۔اے)

ڈھل چکا تھا دن، اور تھا خورشید — منظرِ ہولناک سے بیزار
کنجِ خلوت تلاش کرنے کو — گرم رو تھا وہ جانبِ کہسار
محشرِ کارزارِ "زٹفن" میں — گرم ابھی کشت وخوں کا تھا بازار
گرچہ کشتوں کے لگ گئے پشتے — باز آئے نہ جنگ جو زنہار
مینھ برستا تھا گولیوں کا کہیں — تھی کسی سمت تیغ صاعقہ بار
کہیں بجتا تھا لوہے سے لوہا — محشر انگیز جس کی تھی جھنکار
سورما دو طرف سے بڑھ بڑھ کر — آن پر اپنی ہو رہے تھے نثار
کوئی بڑھتا تھا تان کر نیزہ — کوئی چڑھتا تھا کھینچ کر تلوار
خندقوں میں ڈٹے ہوئے تھے کئی — کر رہے تھے جو گولیوں سے وار

دشمنِ صلح و آشتی طرفین
دونوں جانب سے گرمیِ پیکار!

سورماؤں میں اک جوانِ حسیں — سر فلپ سڈنی تھا علم بردار
تھا عزیزِ دلِ زمانہ، کہ تھا — صاحبِ علم اور خجستہ شعار
ہاتھ اُس نے دکھائے بڑھ بڑھ کر — قلبِ دشمن کو کر دیا بے کار
بے جگر ہو کے وہ لڑا ایسا — کٹ گرے اُس کے نیچے دو رہوار
کارِ دشمن تمام کرنے کو — اور گھوڑے پہ ہو رہا تھا سوار
کہ لگی آ کے ران میں گولی — استخواں توڑ کر ہوئی جو پار
اُسی گھوڑے پہ آ گیا واپس — خوں میں لتھڑا ہوا بحالتِ زار

حالتِ نزع ہو گئی طاری — تشنگی شعلہ زن ہوئی یکبار
پانی مانگا اشارہ سے اُس نے — کہ بہت کم تھی طاقتِ گفتار
گرچہ نایاب تھا وہاں پانی — لے ہی آئے کہیں سے خدمتگار
ہاتھ میں تھام کر پیالے کو — پانی پینے کو تھا وہ خوش کردار

کہ مقدر نے گل کھلایا اور
رہ گئے ہونٹ خشک صورتِ خار

اِک سپاہی تھا چوُر زخموں سے — لے چلے تھے اُسے اُٹھا کے کہار
وہ بچارا بھی سخت پیاسا تھا — اور تھی اُس کو زندگی دشوار
بسکہ بیتاب تھا، پیالے پر — مُڑکے ڈالی نگاہِ حسرت بار
سرِ فلپ نے یہ دیکھکر فوراً — پانی پینے سے کر دیا انکار
اور کہا "جاکے اُس کو دے آؤ — مجھ سے بڑھکر ہے یہ اُسے درکار"
نہ زباں پر شکایتِ تقدیر — نہ نگاہوں سے یاس کا اظہار

یہ مروت ہے یہ جواں مردی
اِس سعادت کا نام ہے ایثار

پارۂ جگر

(از جناب جگر بریلوی۔ بی۔ اے)

برباد ہو رہا ہوں محبت کی راہ میں — عالم تمام ہیچ ہے میری نگاہ میں
اب یاد رہ گئے ہیں فقط دوزخ و بہشت — دیکھے بہت نشیب و فراز اُسکی راہ میں
ہمرنگیٔ ازل دل وحدت طلب کہاں — جبتک ہے امتیاز سپید و سیاہ میں
جو تابِ آزمائشِ ہستی نہ لا سکا — تسبیح لیکے بیٹھ رہا خانقاہ میں
یا ہم تھے یا خدا تھا کوئی دوسرا نہ تھا — علم و خرد نے ڈال دیا اشتباہ میں
ہم پر فریبِ رونقِ باطل چلے گا کیا — عالم کو جانتے ہیں غبار اُسکی راہ میں
اس کو فروغِ حسن کہیں یا جمالِ دل — بجلی چمک رہی ہے تیری جلوہ گاہ میں
دنیا سمجھ رہی ہے جنھیں انجم سپہر — روشن چراغ ہیں وہ محبت کی راہ میں
دل رہبر نشاط [illegible] — انجم [illegible] جگر اشتباہ میں

کلامِ مہر

از پروفیسر نارائن پرشاد ورما مہر (گوالیار)

توڑ کر دل ہم کو ناکامِ تمنا کر دیا
کیا کیا یہ اے ستمگر، تو نے یہ کیا کر دیا

کیا تماشا ہے کسی کے جلوۂ دیدار نے
میری چشمِ شوق کو بھی اک تماشا کر دیا

جو نہ دیکھے تھے حسیں ہمکو دکھائے وہ حسیں
اُف رے شوقِ دید، کس کس سے شناسا کر دیا

تو بلائے جاں بھی ہے غارتگرِ ایماں بھی ہے
اک شبابِ حسن نے اب تجکو کیا کیا کر دیا

مہر یہ تم نے کیا کیا نالے کر کے عشق میں
خود بھی رُسوا ہو گئے اُن کو بھی رُسوا کر دیا

وہم ہوتا ہے نکلنے کا گماں ہوتا ہے
جو نکلتا ہے وہ ارمان کہاں ہوتا ہے

بدگماں تیری محبت نے کیا ہے ایسا
دوست پر بھی مجھے دشمن کا گماں ہوتا ہے

دیکھ کر حسن کسی کا مری حیرانی سے
جو بیاں ہو نہیں سکتا وہ بیاں ہوتا ہے

تجھ میں کیا دیکھ لیا اسکو کہے کیا کوئی
کہیں یہ راز زباں سے بھی بیاں ہوتا ہے

مہر کو آپ سمجھتے ہیں جو بندہ اپنا
شکر اس بندہ نوازی کا کہاں ہوتا ہے

میری فغاں سے تو ہجر کی شب ادھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے
مگر یہ اُن سے بھی کوئی پوچھے انھیں بھی اس کی خبر ہوئی ہے

اب اور الزام کس کو دیں ہم، نہ اشک بہتے نہ راز کھلتا
ہماری الفت کی پردہ در تو، ہماری ہی چشمِ تر ہوئی ہے

نظر بھی آئی جو دن کی صورت، تو یوں شبِ انتظار آئی
سفید آنکھیں ہوئیں جب اپنی تو ہم نے جانا سحر ہوئی ہے

ہمارے آگے جواب جھکی ہے، تو کیوں حیا اس کو ہم سمجھ لیں
لڑی ہے یہ غیر کی نظر سے، تری نظر کو نظر ہوئی ہے

کیسکے دیدار کی تمنا، ہوئی ہے کیا دل میں آج پیدا
یہاں تو مہر اپنی زندگی ہی اس آرزو میں بسر ہوئی ہے

ہندو شعرا

خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چار سو پچاس گزشتہ و موجودہ ہندو شعرا کے حالات موثر و دلکش مع جدید چیدہ اشعار قیمت ۱۲؎

تذکرۂ آب بقا گذشتہ و موجودہ شعرا کے حالات ۳؎

شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں ۳؎

لغات اردو مکمل سٹ ۱۲؎

حال اردو۔ ہندی اور اردو کی حقیقت اور الفاظ کا فرق ۶؎

اصلاح زبان اردو۔ متروکات کی تشریح ۶؎

ترجمان پارسی اردو سے فارسی بنانیکی آسان ترکیب ۶؎

زباندانی۔ اردو کے مستند قواعد ۶؎

اصول اردو۔ صرف و نحو کے مختصر قواعد ۶؎

المشتہر: منیجر عشرت بکڈپو احاطہ خانساماں لکھنؤ

انقلاب زندہ باد

انتخاب لاجواب

زندگی میں آسودگی اور آرام اچھا نام اور اچھا کام نہ ہو تو زندگی ہی ناکام ہے لیکن جب آپکی صحت ہی اچھی نہیں اور جسم میں طاقت ہی نہیں تو انکا حاصل کرنا غیر ممکن ہے۔ اگر آپ اپنی حالت میں انقلاب چاہتے ہیں تو اسکے لئے مقویات سرتاج عالم آہنک نگرہ گولیاں کا انتخاب لاجواب ہوگا۔ یہ گولیاں آپ کی جملہ شکایتوں قبض۔ بدہضمی۔ خون اور منی کی خرابی دلکی۔ جریان۔ احتلام سرعت انزال۔ دل و دماغ کی کمزوری۔ قوت ہاضمہ اور قوت حافظہ کی کمی اور جملہ شکایتوں کو دور کر کے پورا آرام بہم پہنچا کے آسودگی عطا کر کے اچھے اور اہم کام کے انجام دینے کی ہمت عطا کر کے نامور بنا دے گی۔ قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں ایک روپیہ عہ/ ۵ ڈبیاں للعہ/ علاوہ محصولڈاک۔ اسی طرح ہمارا طلا داچی کرن ہے تمام بیرونی نقائص دور کر کے اعلیٰ درجہ کی مردمی عطا کرنے میں پوری فتح حاصل کر چکا ہے۔ قیمت فی شیشی پانچ روپیہ صہ/ صحت و تندرستی کی ٹیچر راہ راست کی رہبر اور سب سے عمدہ مضامین سے مزین کتاب کام شاستر بالکل مفت طلب فرمائیے۔

ویدشاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاواڑ

۳
منعقدہ اسٹار ٹریڈ مارک رجسٹرڈ
SKB
ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن لمیٹڈ
بانی
ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن
سنہ ۱۸۹۴ع
کلکتہ
پچاس سال سے ہندوستانی پیٹنٹ دواؤں کے بے مثل موجد
ہیضہ سے اپنی جان بچانے کے لئے
ہیضہ۔ گرمی کے دست۔ پیٹ کا درد۔ اور بدہضمی وغیرہ کو دور کرنیکی بے خطا دوا۔ جہاں کہیں ہیضہ پھیلا ہو وہاں ایک یا دو بوند استعمال کرنے سے ہیضہ میں مبتلا ہونیکا ڈر نہیں رہتا۔ ہر ایک گھر اور سفر میں اسے پاس رکھنا ضروری ہے۔
قیمت فی شیشی چھ آنہ ۶؍ محصول تین شیشیوں تک سات آنہ ۷؍
اصل عرق کافور
"کافو"
(REGD)
ہیضہ۔ سوزاک۔ جلندھر خواہ اور کسی وجہ سے پیشاب بند یا کم ہو جائے تو "یورا" استعمال کیجئے۔ اس کے صرف دو ہی تین بار کے استعمال سے پیشاب کھل کر صاف آنے لگتا ہے۔
قیمت فی شیشی چھ آنہ ۶؍ محصول سات آنہ ۷؍
پیشاب لانے کی دوا
"یورا"
(REGD)
آنکھ اٹھنا۔ سوزش۔ کرک۔ پانی بہنا اور گرد و غبار۔ دھواں۔ دھوپ کی تیزی وغیرہ کی وجہ سے آنکھ کی سرخی۔ اس کے تین چار دنوں کے استعمال سے جاتی رہتی ہے۔
قیمت فی شیشی نو آنہ ۹؍
محصول دو شیشی تک سات آنہ ۷؍
آنکھ آنے کی دوا
آئی فلا
(REGD)
نوٹ
ہماری دوائیں ہر جگہ فروخت ہوتی ہیں ڈاک محصول بہت بڑھ گیا ہے اس لئے اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خرید فرمائیں۔ نمونہ صرف ایجنٹوں ہی سے مل سکتا ہے۔
صیغہ نمبر ۶۷ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ
ایجنٹ کانور نما گنج ۳ محمد حفیظ محمد لطیف صاحب

باپ کو پوری تندرستی حاصل ہو گئی
ایک سناٹوجن استعمال کرنیوالے شخص کا شکرگذار بیٹا لکھتا ہے کہ:-
"یہ بالکل سچ ہے کہ سناٹوجن کے تین ہفتہ کے استعمال سے میرے باپ کو پوری صحت اور طاقت حاصل ہوگئی۔ سناٹوجن کے استعمال سے پہلے میرا باپ قریب المرگ معلوم ہوتا تھا لیکن اب وہ پورے طور پر تندرست اور طاقتور ہوگئے ہیں۔ میں سناٹوجن کا شکرگذار ہوں"۔
سناٹوجن نے دوسروں کو جو فائدہ پہونچایا ہے وہ آپکو بھی پہونچ سکتا ہے۔ تھوڑی سی مدت میں آپ کی کمزوری غائب ہو جائیگا اور آپ اپنے آپکو طاقتور اور تندرست محسوس کرنے لگیں گے کیونکہ اسمیں بالکل قدرتی اجزا ہیں یعنی فاسفورس اور البومن جو خون رگوں اور جسم میں طاقت پیدا کرتے ہیں۔ اب آپ کیوں تکلیف میں اور کمزور رہیں جبکہ آپکو معلوم ہے کہ سناٹوجن آپکو اپنی زندگی سے پورے طور پر لطف اندوز ہونیکی طاقت بخشیگا۔
SANATOGEN
اصلی مقوی غذا
تمام انگریزی دوافروشوں اور بازاروں میں ملتا ہے
سناٹوجن ہاتھ سے نہیں چھوٹی جاتی۔
"سورڈال" بہرے پن کو اچھا کردیتا ہے
سورڈال نامی جدید فرانسیسی دوا نہایت صفائی اور حیرت انگیز طریقہ سے بنایا ہوا مرہم ہے جسکے استعمال سے بہت سے لوگوں کا بہراپن اور دماغ میں شور سنائی دینا اور ناک کا نزلہ سے بند ہوجانا عجیب و غریب طریقے سے قطعی اچھا ہوگیا ہے۔ ان حالتوں میں بھی جہاں بہترین طبی مشورے اور اعلیٰ ترین قیمتی دوائیں بھی بیکار ثابت ہوئی ہیں یہ مرہم کامیاب ہوا ہے۔ اگر آپ کو اس قسم کی کوئی شکایت ہو تو "سورڈال" آپ کے ثقل سماعت کا نقص رفع کرکے آپ کے سننے کی طاقت کو پھر بحال کردیگا۔
آج ہی اس عجیب و غریب گھریلو دوا کا بکس منگا لیجئے
قیمت صرف تین روپیہ ہے۔
مسز ای۔ اسمتھ ساؤتھ شیلڈز سے لکھتی ہیں:-
"سورڈال" مرہم نے میری قوت سماعت مکمل طور سے بحال کردی، اور نزلہ اور سر کے اندر کے شدید شور کو بالکل دفع کردیا ہے۔ میں نے بہت لوگوں سے اس دوائے عظیم کا ذکر خیر کیا ہے۔"
سورڈال کمپنی، ۵۲، ہوم کرافٹ روڈ
سیڈنہم، لندن۔ انگلستان
کے پتہ سے طلب کیجئے
SOURDAL Co:
52, Homecroft Road, Sydenham,
LONDON (England)
تفصیلی اشتہارات کی کتابیں مفت طلب فرمائیے۔

اکثر اور اہم کی قابل تصاویر

ہاف ٹون عکسی تصاویر

بہت ہی عمدہ اور نفیس

یہ تصاویر ہاف ٹون بلاک سے عمدہ آرٹ پیپر پر شایع ہوئی ہیں اور ان کو عام پسندیدگی کا فخر حاصل ہے

تصاویر رنگین

فی تصویر ۲ر
نغمہ محبت
موسم سرما
جادو بہاری
انتظار
ہدایت
گل بیچ روز
رفیق طفلی
شکنتلا و دشینت
مشعل ہدایت
تار شکستہ
صبح نوروزی

فن تصویر کے نمونے

کثرت میں وحدت ۲ر
وقت نزع ۲ر
نظر بد کا اثر ۲ر
راجہ اج کا ملاپ ۲ر
بھکارنی ۲ر
آنند ساشن ۲ر
الیند وفاداری ۲ر
شیواجی اور رام داس ۲ر

قدیم زمانہ کا طرق جنگ ۲ر
یورپ کا ایک معرکہ ۲ر
ایک قدیم مشرقی مدرسہ ۲ر
مصطفےٰ کمال پاشا
کی ترکی کونسل ۲ر
غسل کی تیاری ۲ر
سیتا وان اور ہنری ۲ر
راجہ کمانڈ کے بیٹے
کا قتل ۲ر
باسدیو اور دیوکی قید ۲ر
زوجہ مکیش متعلق سنگھ
دوت کالیداس ۱ر
اکبر اعظم ۱ر
راجہ مان سنگھ ۱ر
اکبر اور چیتے کا شکار ۱ر
دربار شاہجہاں ۱ر
عہد مغلیہ میں شاہی
سواری کا جلوس
محاصرہ چتوڑ
سپیلیش شاہزادہ سلیم
دربار جہانگیر میں سفیر
فارس

دارا شکوہ کا سر اورنگزیب
کے سامنے پیش ہوتا ہے
میرن صاحب معہ جعفر
ٹیپو سلطان
دربار مادھو راؤ پیشوا
دربار شاہ عباس

موسمی تصاویر

ماہ چیت ۲ر بیساکھ ۲ر
جیٹھ ۲ر اساڑھ ۲ر
بھادوں ۲ر ماگھ ۲ر
پھاگن ۲ر ساون ۲ر

مشہور انشاپردازان اردو

مولانا شبلی ۱ر
شمس العلماء ذکاء اللہ ۱ر
شمس العلماء ڈاکٹر سید علی ۱ر
میر تعشق علی ۲ر
حضرت امیر حرم ۲ر
حضرت سرور ۲ر
مولوی عزیز مرزا صاحب ۲ر
بابو بالمکند گپتا ۲ر
اڈیٹر بھارت متر ۲ر

مشاعرہ کیننگ کالج
منعقدہ ۱۹۱۱ء ۱ر
منشی احمد علی شوق ۱ر
مرزا سلطان احمد ۱ر
مرزا محمد رفیع سودا ۲ر
مرزا انشاء اللہ خاں ۱ر
مولانا عبد الرزاق البرامکہ ۲ر
مولانا آزاد دہلوی ۲ر
مسٹر رام بابو سکسینہ ۲ر
منشی نوبت رائے نظر ۲ر
جناب چکبست ۲ر
حضرت صفی ۲ر
ڈاکٹر اقبال ۲ر
مولانا حسن نظامی ۲ر

لیڈران ہند و ناموران ملک

راجہ رام موہن رائے ۲ر
مسٹر دادا بھائی نوروجی ۱ر
سر سالار جنگ ۲ر
ڈاکٹر نذیر احمد خاں ۱ر
اراکین دیانند کالج ۱ر
مسٹر تلک ۲ر

جسٹس محمود ۲ر
بابو سریندر ناتھ بنرجی ۱ر
کالیچرن بنرجی ۱ر
سر رام کرشن بھنڈارکر ۱ر
بابو گنگا پرشاد ورما ۲ر
سوامی دیویکانند ۲ر
نواب محسن الملک ۲ر
مسٹر رس بہاری ۲ر
ڈاکٹر ستیش چندر
بنرجی ۱ر
پنڈت بشمبر ناتھ ۲ر
بابو پرتاپ چندر
بنرجی ۲ر
جسٹس لال چند ایم اے ۱ر
آنریبل مسٹر گوکھلے ۲ر
انجمن خادمان ہند ۲ر
مسٹر رام داس ۲ر
مہاتما گاندھی ۲ر
پنڈت مدن موہن صاحب
مالوی ۱ر
کرنل بھولا ناتھ ۲ر
پنڈت موتی لال نہرو ۲ر

لالہ لاجپت رائے ۲ر
ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ۲ر
سر ابراہیم رحمت اللہ
لالہ ہنسراج ۲ر
راجہ صاحب محمود آباد ۲ر
لارڈ سنہا ۱ر
سر آغا خاں ۲ر
مولانا محمد علی ۲ر
مسٹر سچدانند سنہا ۲ر
مسز سروجنی نائیڈو ۲ر
مسٹر وی پی مادھو
راؤ ۱ر
مہاتما تلسی رام ۲ر
سوامی شردھانند ۲ر
سریندر ناتھ بنرجی
ڈاکٹر ٹیگور ۲ر
بابو بھگوان داس ۱ر
سید امیر علی ۱ر
نواب سید حسن
بلگرامی ۱ر
نواب سید محمد ۱ر

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے منگائیے

مکتبہ جامعہ ملیہ | ہمزاد (ڈراما) | قرول باغ - دہلی

اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔اے کا وہ دلچسپ ڈراما جسمیں کم عمر بیوی اور بزرگوار شوہر کے معاملات قدرے ظرافت آمیز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اچھی سوسائٹی میں اسٹیج کرنے کیلئے یہ ڈراما بہت مناسب ہے طباعت۔ کتابت۔ کاغذ بہت اچھا یہ اردو کی ان کتابوں میں سے ہے جو تمام لوازم اشاعت سے آراستہ ہیں

(ڈراما)
گناہ کی دیوار

مصنفہ اشتیاق حسین قریشی صاحب ایم۔اے۔ گناہ بری چیز ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر بدتر ہیں۔ گناہ کی دیوار شاید ٹوٹ سکتی ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر کے بتوں کا توڑنا بہت دشوار ہے۔ یہ ایک باعصمت خاتون کا قصہ ہے جسے کچھ عرصہ تک مجبوراً عصمت فروشی کی زندگی گزارنی پڑی لیکن بالآخر خدا نے اس کی گریہ وزاری سن لی اور اس زندگی سے نجات دلائی۔ قیمت ۸ر

کھیتی (ڈراما)

مصنفہ محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن) مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لئے ایک دلچسپ ڈراما۔ مذہب اور اخلاق کس رستے پر چلانا چاہتے ہیں، زمانے کی مصلحتیں، قوم وملت کی ضروریات سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے اور ایک معیار بھی تجویز کیا گیا ہے جو رہنمائی کے دعویداروں کو پرکھنے میں کام آسکتا ہے۔

قیمت صرف چھ آنہ

(ڈراما)
پردۂ غفلت

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔اے۔ پی ایچ۔ ڈی کا وہ ڈراما جو انھوں نے قیام جرمنی میں لکھکر وہیں چھپوایا تھا۔ مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر تعلیم نسواں آزادی نسواں اور پردہ پر مفید بحث ہے ظرافت آمیز اور نتیجہ خیز قصہ ہے۔ طباعت عمدہ۔ قیمت ایکروپیہ ۱۲ر